ایک دہشت ناک آسیب کی لرزہ خیز داستان

# ویران حویلی کا آسیب

اے حمید



معیاری اور خوبصورت کتابیں

بااہتمام محمد علی قریشی



ایڈیشن ........ 2009ء

مطبع ........ نیئر اسد پریس لاہور

ڈیزائن ........ ذاکر

کمپوزنگ ........ کلائمکس گرافکس

قیمت ........ -/225روپے

مکمل سیٹ ........ -/450روپے



"بمبئی بروڑہ ریلوے لائن پر جھانسی سے بھوپال جاتے ہوئے جھانسی سے کوئی ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر روہت گڑھ کا چھوٹا سا سٹیشن آتا ہے۔ روہت گڑھ سے تین چار کوس جنوب مشرق کی جانب گھنے جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ان جنگلوں میں شیر، چیتے، ہاتھی، ریچھ غرض کہ ہر قسم کے درندے، جانور اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل آگے جا کر ہوشنگ آباد ناگ پور کے وسطی جنگلاتی سلسلے سے جا کر مل جاتے ہیں۔ ان جنگلوں کا روہت گڑھ سے ہوشنگ آباد تک کا علاقہ سب سے خطرناک اور خوفناک سمجھا جاتا ہے۔ ان جنگلوں کے بارے میں یہ روایت بھی مشہور ہے کہ یہاں رات کی تاریکی میں ان لوگوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جو جنگلی درندوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

اس جنگل میں روہت گڑھ سے تھوڑے فاصلے پر ایک پرانے قلعے کا کھنڈر ہے جسے رانی بائی کا قلعہ کہتے ہیں۔ یہ قلعہ مغلوں کے زمانے کا ہے۔ کہتے ہیں اسے کسی مغل صوبیدار نے اپنی کنیز رانی بائی کے لئے بنوایا تھا۔ قلعے کے اندر رانی بائی کا ایک عالی شان محل تھا۔ اس محل کے نیچے ایک خفیہ سرنگ بنائی گئی تھی جو زمین کے اندر ہی اندر روہت گڑھ تک جاتی تھی۔ ساون کے دنوں میں جب خوب بارشیں ہوتی تھیں تو رانی بائی اس قلعے میں آ جاتی تھی اور محل کے باغ میں اپنی کنیزوں کے ساتھ جھولا جھولتی تھی اور موسم برسات کا لطف اٹھاتی تھی۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ رانی بائی کی خون آلود لاش محل کے پائیں باغ میں پائی گئی۔ رانی بائی کے مسلمان صوبیدار خاوند

نے رانی بائی کی لاش کو ہندو رسم کے مطابق نذر آتش کرنے کے بعد اس کی ہڈیاں جس کو ہندو لوگ پھول کہتے ہیں محل کے باغ میں جہاں رانی بائی کی لاش ملی تھی وہیں دفن کر کے اوپر مڑھی یعنی سنگ مرمر کا ایک چبوترہ بنادیا تھا جس کے اوپر ایک سنگ مرمر کی چھوٹی سی بارہ دری تھی۔

رانی بائی کے اس قلعے کے بارے میں یہ روایت بمبئی تک مشہور تھی کہ کبھی کبھی تاریک راتوں میں اس قلعے میں سے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور کبھی درد بھرے گیت گانے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

ان پراسرار آسیبی آوازوں کی وجہ سے کوئی شخص اس قلعے کے نزدیک نہیں جاتا تھا۔ لوگوں کو تو اس قسم کی کوئی بات ہاتھ آجانی چاہئے۔ لوگوں نے یہ بھی مشہور کر رکھا تھا کہ رانی بائی کے قلعے میں ایک ہندو طوائف کی بدروح رہتی ہے جو چڑیل کا جنم لے چکی ہے اور قلعے کے قریب سے گزرنے والے مسافروں یا شکاریوں کو محبت بھری آوازیں دے کر بلاتی ہے اور جب وہ قلعے کے اندر چلے جاتے ہیں تو اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ اس بدروح چڑیل کی آواز اب تک کئی انسانوں کو ہڑپ کر چکی ہے۔ جس شخص نے مجھے یہ خوفناک داستان سنائی ہے اس کا کہنا ہے کہ میں نے بمبئی میں رانی بائی کے قلعے کے بارے میں یہ مبالغہ آمیز اور دہشت ناک روایتیں سنیں تو میں نے دل میں اس معمے کو حل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔"

وہ شخص خاموش ہو گیا۔ میں اس شخص کا یہاں نام اس لئے نہیں لکھوں گا کہ اس نے خود بھی اپنا نام نہیں بتایا اور مجھ سے وعدہ بھی لے لیا تھا کہ اگر کسی ذریعے سے مجھے اس کا اصلی نام معلوم بھی ہو گیا تو میں اپنے قارئین کو وہ نام نہیں بتاؤں گا۔ مجھے ابھی تک اس پراسرار قسم کے شخص کا اصلی نام معلوم نہیں ہوا لیکن یقین کریں اگر معلوم ہو بھی گیا تو میں اپنے وعدے کو نبھاؤں گا اور اس کا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔ لیکن چونکہ یہ اس شخص کی آپ بیتی ہے اور یہ سارے دہشت ناک واقعات سچے ہیں اور اس



کے ساتھ گزر چکے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک فرضی نام رکھنا ضروری ہے۔ میں اس کا نام فیروز فرض کر لیتا ہوں۔ فیروز سے میری ملاقات محض ایک اتفاق سے ہو گئی تھی۔ جولائی، اگست کے موسم میں، میں پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے ایک صحت افزا پہاڑی مقام پر گیا ہوا تھا۔ کچھ روز وہاں قیام کے بعد وہاں سے واپسی کا سفر شروع کیا تو راستے میں بارش آگئی۔

خیال تھا کہ پہاڑی بارش ہے گھنٹے آدھ گھنٹے بعد رک جائے گی۔ لیکن بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ آسمان کو سیاہ گھنگھور گھٹاؤں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ بجلی رہ رہ کر چمک رہی تھی۔ یہ تو کوئی بارش کا طوفان تھا۔ ہماری بس ایک مقام پر جا کر رک گئی۔ معلوم ہوا کہ آگے ایک پہاڑی پل ٹوٹ کر بارش میں بہہ گیا ہے۔ پہاڑی علاقوں میں اگر کوئی سڑک یا کوئی پل بارش میں بہہ جائے تو اتنی جلدی ٹریفک کے واسطے دوسرا راستہ نہیں بنایا جا سکتا خاص طور پر جبکہ بارش بھی موسلادھار ہو رہی ہو۔ ہم پندرہ بیس مسافر ایک لگژری کوچ میں سفر کر رہے تھے۔ کوچ کے ڈرائیور نے جہاں گاڑی کھڑی کی تھی وہ ایک چھوٹا سا پہاڑی گاؤں تھا۔ ذرا بلندی پر ایک ریسٹ ہاؤس بھی تھا۔ ڈرائیور نے مسافروں سے کہا۔

"آپ لوگوں کو پریشانی ضرور ہوئی ہو گی۔ لیکن یہ مجبوری ہے۔ آگے پل بارش میں بہہ گیا ہے شاید آپ لوگوں کو رات یہیں گزارنی پڑے۔"

مسافروں میں شدید مایوسی پھیل گئی۔ سب کے چہرے لٹک گئے۔ مگر بارش کے آگے کسی کا زور نہیں چل سکتا تھا۔ صرف ایک ادھیڑ عمر کا چوڑے شانوں والا ایک مسافر ایسا تھا جس پر اس صورت حال کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بڑے سکون کے ساتھ اپنے اوور کوٹ کے کالر اوپر کئے سر پر سواتی ٹوپی پہنے چائے کی دکان کے سائبان کے نیچے لوہے کی کرسی پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا کہ یہ آدمی تو بالکل ہی بے حس اور ڈل قسم کا ہے اور یا پھر وہ اس قسم کی تکلیفوں اور ناگہانی آفتوں کا عادی

معلوم ہوتا ہے۔ اس کی سواتی ٹوپی کے کناروں پر اس کے بالوں کی سفیدی جھلک رہی تھی۔ اس کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی مگر جسم صحت مند اور متناسب تھا۔

ایک مسافر نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ہم لوگ رات کہاں بسر کریں گے بہتر یہی ہے کہ تم ہمیں واپس لے چلو۔“

ڈرائیور بولا۔ ”صاحب فکر نہ کریں۔ اوپر محکمہ جنگلات کا ایک پرانا ریسٹ ہاؤس ہے وہاں آپ لوگوں کے سونے کا بندوبست ہو جائے گا۔ باقی دو چار آدمی کوچ کے اندر بھی سو سکتے ہیں۔“

سورج بادلوں کے پیچھے ڈھلنا شروع ہو گیا تھا اور دن کی روشنی ماند پڑنے لگی تھی۔ ڈرائیور یہ کہہ کر اوپر ریسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا کہ ”آپ لوگ تب تک چائے کی دکان میں چائے وغیرہ پئیں میں اوپر آپ لوگوں کے سونے کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔“

چائے کی دکان پہاڑی سڑک کے کنارے پر ہی تھی۔ پتھریلی سلیٹوں والی ڈھلواں چھت کے نیچے ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ ایک طرف دکان کا مالک چائے وغیرہ پکاتا تھا۔ برآمدے میں لکڑی کی بوسیدہ دو چار میزوں کے گرد لوہے کی کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک جانب لکڑی کے دو تین بنچ بھی رکھے ہوئے تھے۔ کچھ مسافر کرسیوں پر اور کچھ بنچوں پر بیٹھ گئے اور چائے وغیرہ پینے میں مصروف ہو گئے۔ میں سب سے الگ ہٹ کر دیوار کے ساتھ لگے لکڑی کے بنچ پر بیٹھا چائے پی رہا تھا اور برآمدے کے باہر سڑک پر بارش کا نظارہ بھی کر رہا تھا۔ چائے کے ہوٹل کے مالک نے بادلوں کی وجہ سے شام کا اندھیرا جلدی گہرا ہوتے دیکھ کر برآمدے کی چھت پر لگا ہوا بلب روشن کر دیا تھا۔ میں نے لمبا کوٹ پہن رکھا تھا اور سردی سے بچنے کے لئے گلے میں مفلر بھی لپیٹا ہوا تھا۔

چھت کے لکڑی کے شہتیر سے لٹکتے ہوئے بلب کی روشنی میرے چہرے پر پڑ رہی



تھی۔ اتفاق سے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں اس پر اس پریشان صورت حال کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، مجھ سے چند گز کے فاصلے پر ایک میز کے پاس کرسی پر اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شخص میری طرف بڑے غور سے دیکھ رہا ہے۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا اور خاموشی سے بیٹھا چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ شخص کرسی سے اٹھا اور میرے قریب آ کر بڑی شائستگی سے بولا۔ ”کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں؟“

میں اس کے مہذبانہ انداز گفتگو سے متاثر ہوا تھا۔ میں نے بنچ پر ذرا سا پیچھے سرکتے ہوئے کہا۔ ”ضرور! تشریف رکھئے۔“

اور وہ شخص اپنے گرم اوور کوٹ کو سمیٹتے ہوئے میرے پاس بنچ پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے جیب سے پائپ نکال کر اس میں پہلے سے بھرے ہوئے تمباکو کو انگوٹھے سے دبا کر اسے سلگایا اور دو ایک ہلکے سے کش لگانے کے بعد مجھ سے میرا نام لے کر یوں مخاطب ہوا۔

”آپ وہی ہیں نا جو آج کل اخباروں، رسالوں میں پراسرار اور کسی حد تک دہشت ناک ایڈونچر کی کہانیاں لکھ رہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں! میں وہی ہوں۔“

وہ بولا۔ ”میں نے آپ کی ایک کتاب میں آپ کا فوٹو دیکھا تھا وہیں سے میں نے آپ کو پہچانا ہے.....“

پھر وہ مجھ سے شمالی علاقہ جات کے موسموں اور بارش کی باتیں کرنے لگا۔ میں ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا۔ اس آدمی کے چہرے کے نقوش تیکھے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ چہرے کا رنگ جو کبھی سرخ و سفید ہوگا اب گندمی رنگت اختیار کر چکا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس شخص نے زندگی اور وقت کے بڑے گرم سرد موسم دیکھے ہیں۔ اس کی نسواری آنکھوں میں بھی ذہانت کی بڑی چمک تھی۔

وہ پاکستان کے شمالی علاقہ جات کے جنگلوں کے بارے میں بڑے ماہرانہ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ”لگتا ہے آپ کو ان جنگلوں کا کافی تجربہ ہے۔“

وہ پائپ کو اپنے ہونٹوں سے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ”ان جنگلوں کا تو مجھے اتنا تجربہ نہیں ہے لیکن بھارت کے جنگلوں میں، میں نے کافی وقت گزارا ہے۔“

بھارت کے جنگلوں میں پاکستان بننے سے پہلے میں بھی تھوڑی بہت آوارہ گردی کر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی سوال کرتا اس نے بجھے ہوئے پائپ کو انگوٹھے سے دبانے کے بعد دوبارہ سلگایا اور کہنے لگا۔ ”بھارت کے جنگلوں کے بارے میں تم نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور کافی حد تک درست لکھا ہے۔ لیکن ان پراسرار جنگلوں میں مجھے جو تجربے ہوئے ہیں وہ تم سے بہت مختلف ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا آپ شکاری رہ چکے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”جم کاربٹ کی طرح کوئی پیشہ ور شکاری تو نہیں تھا لیکن تھوڑا بہت شکار کھیل لیتا تھا محض کھیل کی خاطر..... زیادہ تر مجھے ان جنگلوں کی پراسرار روایتیں ان کی طرف کھینچ کر لے گئی تھیں۔ میں پراسرار اور ماورائی چیزوں کو پسند کرتا ہوں اور مجھے پراسرار رازوں کا سراغ لگانے اور انہیں بے نقاب کرنے اور اصل حقیقت معلوم کرنے کا شروع سے ہی بڑا شوق رہا ہے۔“

پھر اس نے اچانک چہرہ میری طرف گھما کر آہستہ سے کہا۔ ”تم جو پراسرار کہانیاں لکھتے ہو وہ مجھے فرضی کہانیاں لگتی ہیں لیکن میرے پاس ایک ایسی پراسرار کہانی ہے جو تم سنو گے تو تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ آج کے ماڈرن اور کمپیوٹر سائنس کے زمانے میں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا ہے ایسا ہوا ہے اور ایسا میرے ساتھ ہوا ہے۔ یہ کہانی نہیں بلکہ میری آپ بیتی ہے.....“



وہ چپ ہو گیا۔ اور خاموشی سے پائپ پیتے ہوئے جیسے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ بارش ابھی اسی طرح ہو رہی تھی۔ شام کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں اس پراسرار شخص کی کہانی ضرور سننا چاہتا تھا۔ جب میں نے اس کے آگے اپنے اشتیاق کا اظہار کیا تو وہ بولا۔

”میں تمہیں یہ حیرت انگیز کہانی ضرور سناؤں گا شاید اسی لئے میں وہاں سے اٹھ کر تمہارے پاس آ کر بیٹھا ہوں۔ پہلے یہ معلوم ہو جائے کہ ہمیں رات کہاں بسر کرنی ہے۔ کوچ میں یا اوپر والے ریسٹ ہاؤس میں.... میں تو اسی جگہ بنچ پر بیٹھے بیٹھے رات گزار سکتا ہوں میرا جسم اس قسم کی تکلیفوں کا عادی ہے۔ میں نے کئی راتیں جنگلوں کے درختوں پر بیٹھ کر گزاری ہیں۔“

اس دوران کوچ کا ڈرائیور اوپر سے آ گیا۔ اس نے بتایا۔ ”اوپر والے ریسٹ ہاؤس میں سب کے رات بسر کرنے کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ برائے مہربانی سب مسافر اوپر آ جائیں وہاں آپ کو کھانا بھی مل جائے گا۔“ بارش ذرا رک گئی تھی۔ مسافروں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ان میں کوئی عورت اور بچہ بھی نہیں تھا۔ چنانچہ سارے مسافر ہلکی بارش میں بھیگتے پہاڑ کی چڑھائی چڑھ کر اوپر ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ ان کا سامان کوچ یعنی ویگن کے اندر رکھوا دیا گیا تھا اور کوچ کے کلینر نے سامان کی حفاظت کی خاطر رات کوچ میں ہی گزارنی تھی۔ ریسٹ ہاؤس میں انتظام یہ ہوا تھا کہ ایک بڑے سے کمرے کے آتشدان میں آگ جلا کر زمین پر دریاں بچھا دی گئی تھیں۔ کچھ لحاف اور کچھ کمبل مہیا کر دیئے گئے تھے۔ وہیں دریوں پر لیٹ کر رات بسر کرنی تھی۔

میرے پراسرار ساتھی نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور ایک کمبل گھٹنوں پر رکھ کر آتش دان کے پاس بیٹھ گیا اور کہنے لگا۔ ”یہ لوگ فیشن پرست لوگ ہیں۔ محض فیشن کی خاطر ان پہاڑی علاقوں کی سیر کرنے آتے ہیں اور یہاں بھی گھر کا سا آرام ڈھونڈتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے غریب

لوگ کس قدر سخت زندگی بسر کرتے ہیں اور جنگل کیا ہوتے ہیں۔"

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد سب لوگ وہیں دریوں پر لحاف اور کمبل وغیرہ اوڑھ کر سو گئے۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی جس کی وجہ سے ریسٹ ہاؤس کے بڑے کمرے کی سردی تھوڑی کم ہو گئی تھی۔ میں اور وہ پراسرار شخص آتش دان کے قریب ہی کمبل لے کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئے تھے۔ اسی رات اس پراسرار شخص نے مجھے وہ حیرت انگیز کہانی سنائی جو بقول اس کے اس کی آپ بیتی تھی اور جو میں آپ کو سنانے والا ہوں۔ اس شخص نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا تھا اور مجھ سے وعدہ بھی لے لیا تھا کہ اگر کسی ذریعے سے مجھے اس کا نام معلوم بھی ہو جائے گا تو میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ میں اس عہد پر قائم ہوں اور میں نے کہانی بیان کرنے کی سہولت کی خاطر اس پراسرار شخص کا فرضی نام فیروز رکھ لیا ہے۔ فیروز نے اپنے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کس شہر میں رہتا ہے اور کیا کرتا ہے اور اس کی کوئی گھریلو زندگی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے اپنے ساتھ گزرے ہوئے ناقابل یقین، ناقابل فراموش پراسرار اور دہشت ناک جو واقعات سنائے ہیں وہ میں ویسے کے ویسے بالکل اسی طرح سنا رہا ہوں جس طرح اس پراسرار شخص نے مجھے سنائے تھے۔

اب میں آپ کو واپس بمبئی بروڑہ ریلوے لائن پر جھانسی سے تریسٹھ، چونسٹھ کلومیٹر دور روہت گڑھ ہوشنگ آباد رینج کے ان جنگلوں میں لئے چلتا ہوں جہاں ایک گھنے جنگل میں کسی مغل صوبیدار نے اپنی چہیتی کنیز رانی بائی کے لئے ایک قلعہ نما محل تعمیر کرایا تھا جو رانی بائی کے قلعے کے نام سے مشہور تھا اور بقول فیروز کے جس کے متعلق طرح طرح کی ڈراؤنی کہانیاں مشہور تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس قلعے کے محل کے پائیں باغ میں رانی بائی کا قتل ہو گیا تھا اور باغ میں جس جگہ رانی بائی کی لاش ملی تھی مغل صوبیدار نے اسی جگہ اس کی مڑھی بنا دی تھی۔ رانی بائی کو کس نے قتل کیا تھا؟ اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ یہ تین سو سال سے ایک سربستہ



راز تھا۔

ان جنگلوں کے بارے میں یہ کہانیاں بھی مشہور تھیں کہ یہاں رات کی تاریکی میں اکثر ان لوگوں کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں جنہیں جنگلی درندے ہڑپ کر گئے تھے۔ قلعہ رانی بائی کے بارے میں بھی یہ بات مشہور تھی کہ تاریک اندھیری راتوں میں کبھی کبھی اس قلعے میں سے کسی عورت کی سسکیوں کی اور کبھی درد بھرے گیت گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لوگوں میں یہ مشہور تھا کہ قلعہ رانی بائی میں ایک ہندو طوائف کی بدروح رہتی ہے جو جنگل میں سے گزرنے والوں کو محبت بھری آوازیں دے کر اور کبھی خوبصورت عورت کے روپ میں سامنے آ کر انہیں قلعے میں لے جاتی ہے اور اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں چلے گئے۔ انہیں زمین کھا گئی یا آسمان نے اوپر اٹھا لیا۔ یہ ہے رانی بائی کے قلعہ کا پس منظر جس نے مجھے اس قلعے کی بدروح کا معمہ حل کرنے پر اکسایا.....

میں نے دہشت خیز کہانی جو فیروز نے اپنی آپ بیتی کہہ کر مجھے سنائی تھی اس پراسرار مہم جو شخص سے ایک نشست میں سنی یا چھ نشستوں میں..... شمالی علاقہ جات کے پہاڑی ریسٹ ہاؤس میں سنی یا کسی دوسرے شہر میں کسی دوسری جگہ بیٹھ کر سنی اس سے آپ کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے اور میں اس کی تفصیل میں جانا بھی نہیں چاہتا۔ میں اس شخص کی زبانی سنی ہوئی کہانی پوری تفصیل اور پورے واقعات کے ساتھ آپ کو سناؤں گا۔ پوری کہانی سننے کے بعد یہ فیصلہ آپ خود کریں کہ کیا آج کے خلائی دور میں کسی انسان کے ساتھ ایسے ناقابل یقین واقعات بھی پیش آ سکتے ہیں۔

پراسرار شخص فیروز کہہ رہا تھا.....

"یہ پاکستان بننے سے دو سال پہلے کی بات ہے جب میں نے بمبئی میں قلعہ رانی بائی کے بارے میں اس قسم کی عقل کو حیران کر دینے والی پراسرار اور آسیبی کہانیاں

سنیں۔ میں پنجاب سے عام طور پر سردیوں کے موسم میں بمبئی کا ایک چکر ضرور لگایا کرتا تھا۔ وہاں میرا ایک بچپن کا دوست آٹو سپیئر پارٹس کا چھوٹا سا بزنس کرتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور بمبئی کے ایک علاقے میں اپنے چھوٹے سے فلیٹ میں اکیلا رہتا تھا۔ اسے شکار کا شوق تھا۔ شکار کا شوق مجھے بھی تھا۔ چنانچہ جب میں اس کے پاس بمبئی آتا تو ہم شکار کا پروگرام بنا کر ہفتہ دس دن کے لئے بمبئی کے قریبی جنگلوں میں شکار کھیلنے نکل جاتے تھے۔ ہم عام طور پر سانبھر، چیتل اور ہرن کا شکار کھیلتے تھے۔

اگر کسی جگہ ہمیں دیہاتیوں کی زبانی پتہ چلتا کہ وہاں کوئی شیر ان کے مویشی اٹھا کر لے جاتا ہے تو ہم اس شیر کو بھی ہلاک کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اگر ہمیں یہ معلوم ہو جاتا کہ شیر آدم خور بن چکا ہے تو ہم نے اس کے مقابلے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی اس لئے کہ آدمی خور شیر کو صرف ایک زیرک، چالاک اور تجربہ کار شکاری ہی ہلاک کر سکتا ہے۔ آدم خور بن جانے کے بعد شیر بڑا خطرناک بن جاتا ہے۔ اس کی چالاکی اور مکاری میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ روہت گڑھ ہوشنگ آباد کے جنگلوں میں اس وقت تک کئی اناڑی شکاری آدم خور شیروں کا نوالہ بن چکے تھے۔

ویسے بھی مجھے شیر کے شکار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو چیتل، سانبھر اور ہرنوں کے شکار سے بھی کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو بس اپنی مہم جوئی کے شوق کی تسکین کے لئے اپنے دوست کے ساتھ جنگلوں میں نکل جاتا تھا۔ جنگل بذاتِ خود ایک بہت بڑا سربستہ راز ہوتا ہے۔ جن جنگلوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان کے حسن میں بھی ایک ہلاکت آمیز ہیبت ہوتی ہے۔ ان جنگلوں کو دیکھ کر میرے جیسے آدمی پر بھی ایک بار دہشت طاری ہو جاتی ہے۔ جنگل کے بڑے بھید ہوتے ہیں۔ بہت راز ہوتے ہیں۔ ان رازوں کو پانے کے لئے انسان کو اپنی جان پر کھیلنا پڑتا ہے۔

جب میں نے قلعہ رانی بائی کے بارے میں پراسرار قسم کی عجیب و غریب کہانیاں سنیں تو میں نے اس قلعے کے رازوں کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے اس فیصلے



کو میں نے اپنے بمبئی کے دوست جس کا نام جمشید تھا سے بھی پوشیدہ رکھا۔ چنانچہ بمبئی پہنچنے کے تین چار روز کے بعد میں نے جمشید سے کہا۔

"یار! اس دفعہ میرا جی چاہتا ہے کہ اکیلے ہی شکار کھیلنے جاؤں۔"

جمشید جانتا تھا کہ میں کوئی اناڑی شکاری نہیں ہوں اور جنگل کی زندگی اور درندوں کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اس وجہ سے اس نے میرے اکیلے جانے پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ کہنے لگا۔

"اس دفعہ میں بھی کاروبار کے سلسلے میں بہت مصروف ہوں۔ ٹھیک ہے تم اکیلے ہی شکار پر چلے جانا لیکن زیادہ دور جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بمبئی کے قریبی جنگلوں میں ہی رہنا۔ نوکر عبدل کو بے شک ساتھ لے جانا۔"

میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ میں بمبئی کے قریب جو جنگل ہیں وہیں تک جاؤں گا۔ مگر نوکر عبدل کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ اس دفعہ مجھے جیپ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

جمشید نے حیران ہو کر پوچھا۔ "تو کیا پیدل جاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "پیدل کیوں جاؤں گا۔ چمپامندر کے ریلوے سٹیشن تک ٹرین میں جاؤں گا۔ وہاں سے آگے جنگل دو ایک میل ہی تو رہ جاتا ہے....."

"بھائی جیسے تمہاری مرضی ہے کرو....." یہ کہہ کر جمشید خاموش ہو گیا۔ میں نے اس پر بالکل ظاہر نہ کیا کہ میں روہت گڑھ کے قلعہ میں رانی بائی کے آسیبی رازوں کا کھوج لگانے جا رہا ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے اس خطرناک اور جان لیوا مہم پر کبھی نہیں جانے دے گا۔

مجھے کوئی شکار اگرچہ نہیں کھیلنا تھا مگر اپنے دوست پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ میں شکار کھیلنے جا رہا ہوں۔ چنانچہ مجھے مجبوراً ایک ڈبل بیرل بندوق اور میگزین کا تھیلا ساتھ لے جانا پڑا۔ ان دنوں بھی میں سگریٹ کی بجائے پائپ پیا کرتا تھا۔ ایرن مور تمباکو کی

تھیلی، پائپ اور سگریٹ لائٹر بھی ساتھ رکھ لیا۔ ایک شکاری چاقو تو شکار پر جاتے ہوئے ہر حالت میں ساتھ رکھنا پڑتا تھا چنانچہ اسے بھی میگزین والے تھیلے میں رکھ لیا۔ تھوڑا سا خشک راشن یعنی بھنے ہوئے چنے بھی ایک تھیلے میں ڈال کر رکھ لئے۔ اتنا راشن ہم ویسے بھی شکار پر جاتے ہوئے ساتھ رکھ لیا کرتے تھے۔ جب یہ ختم ہو جاتا تو جنگل میں مرغیاں اور خرگوش وغیرہ شکار کر کے گزارہ کر لیا کرتے تھے۔ ضرورت کے مطابق کرنسی نوٹ میں نے اپنی شکاری جیکٹ کی خفیہ جیب میں چھپا کر اور کچھ کھلے نوٹ اور ریزگاری جیکٹ کی عام جیبوں میں رکھ لی تھی۔ اپنے دوست جمشید سے میں نے یہی کہا کہ میں بمبئی سینٹرل سے ٹرین میں سوار ہوں گا اور چھپا مندر کے سٹیشن پر اتر کر قریبی جنگل میں نکل جاؤں گا اور دو ایک روز جنگل میں شکار کھیلنے کے بعد واپس بمبئی آ جاؤں گا۔

میں بمبئی سنٹرل کی بجائے بمبئی کے بوری بندر سٹیشن سے وایا بھوپال جھانسی جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ ڈبل بیرل بندوق اور شکار کا لائسنس میں ہمیشہ اپنے پاس بٹوے میں رکھتا تھا۔ ابھی برصغیر پر انگریز کی حکومت تھی اور اس قسم کے لائسنس کسی بھی سٹیشن پر چیک کئے جا سکتے تھے۔ میں جھانسی سے ایک سٹیشن پہلے روہت گڑھ کے سٹیشن پر اتر گیا۔ یہاں سے جنوب مشرق کی جانب تین چار کوس کے فاصلے پر ہوشنگ آباد رینج کے گھنے اور خطرناک جنگلوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس جنگل میں ایک جگہ قلعہ رانی بائی کا وہ کھنڈر تھا جس کے بارے میں رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں مشہور تھیں۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ قلعہ رانی بائی کے قرب وجوار کے جنگل میں کبھی کبھی رات کے سناٹے میں ان بدنصیبوں کی چیخوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں جو جنگلی درندوں کا نوالہ بن چکے تھے۔ خود قلعہ رانی بائی کے بارے میں مشہور تھا کہ اس قلعے کے اندر سے راتوں کو کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور کبھی درد بھرے گیت گانے کی آوازیں آتی ہیں۔



میں مسلمان ہوں اور مسلمان کا اس قسم کے توہمات پر یقین نہیں ہوتا۔ میں بھی اسے محض ضعیف العقیدہ لوگوں کی من گھڑت کہانیاں ہی سمجھتا تھا۔ پھر بھی میں خود اس قلعے میں جا کر ان توہمات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ بس یہ میرا شوق تھا اور کوئی بات نہیں تھی۔ یہ میں نے وسطی بھارت کے جنگلوں میں گھومتے پھرتے سادھوؤں سے سن رکھا تھا کہ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق جس ہندو مرد یا عورت نے کوئی بہت بڑا گناہ کیا ہوتا ہے اس کی روح مرنے کے بعد چڑیل یا کسی آسیب کا روپ دھار لیتی ہے اور زمین پر بھٹکتی پھرتی ہے۔ میرے دل میں یہ شوق بھی تھا کہ قلعہ رانی بائی میں اگر کوئی ایسی بدروح ہے تو چلو اس سے ملاقات ہی ہو جائے گی اور قلعے کے بارے میں جو پراسرار کہانیاں مشہور ہیں ان کی حقیقت بھی کھل جائے گی۔

جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ میں عام طور پر سردیوں کے موسم کے آخری دنوں میں بمبئی اپنے دوست جمشید کے ہاں جایا کرتا تھا۔ پنجاب اور شمالی یوپی میں ان دنوں موسم سرد ہوتا ہے مگر وسطی ہند اور خاص طور پر بمبئی کے آس پاس کے جنگلوں میں موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ یہ بارشوں کا موسم نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی ان جنگلوں میں اس موسم میں بھی بارشیں شروع ہو جایا کرتی ہیں۔

روہت گڑھ کے سٹیشن سے اترنے کے بعد میں ایک یکے میں بیٹھ کر اس جگہ سڑک پر اتر گیا جہاں سے ہوشنگ آباد رینج کے جنگل شروع ہو جاتے تھے۔ محکمہ جنگلات کی طرف سے یہاں جنگل میں بعض جگہوں پر چھوٹے چھوٹے پگ ڈنڈی نما راستے بنائے ہوئے تھے۔ یہ کچے راستے جنگل کے ایک حصے کو دوسرے سے الگ کرتے تھے۔ یہ راستے اس لئے بنائے جاتے تھے کہ اگر جنگل کے ایک حصے میں آگ لگ جائے تو دوسرا حصہ آگ سے محفوظ رہے۔ ان چار پانچ فٹ چوڑے راستوں کو جو ادھر اُدھر سے گھومتے ہوئے جنگل کے وسط میں سے گزرتے چاروں طرف نکل جاتے تھے انہیں محکمہ جنگلات کی اصطلاح میں سانپ لائن کہتے ہیں لیکن یہ سانپ سائن جہاں

جنگل زیادہ گھنے اور دلدلی ہو جاتے تھے وہاں تک نہیں گئی ہوئی تھیں۔ میں ان جنگلوں میں اپنے دوست جمشید کے ساتھ یا اکیلا کبھی شکار کھیلنے نہیں آیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ جنگل میرے لئے اجنبی تھے اور میں ان جنگلوں کے لئے اجنبی تھا۔ لیکن چونکہ یہ برصغیر کے وسطی علاقوں کے جنگل تھے اور تقریباً یہ ایک جیسے ہی ہوتے ہیں اس لئے مجھے کوئی خاص اجنبیت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ کوئی جنگل کم خطرناک ہوتا ہے اور کوئی جنگل زیادہ خطرناک اور دشوار گزار ہوتا ہے۔ ویسے ان ہوشنگ آباد رینج کے جنگلوں کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا کہ یہاں شیر، چیتے، ریچھ اور بھیڑیئے عام ہوتے ہیں اور شکاری بھی ان جنگلوں میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

میں نے شکار تو کھیلنا نہیں تھا۔ میرا ٹارگٹ رانی بائی کا قلعہ تھا جس کے رازوں کو میں بے نقاب کرنا چاہتا تھا۔ اور اگر واقعی وہاں کسی عورت کی بدروح راتوں کو سسکیاں بھرتی تھی اور درد بھرے گیت گاتی تھی تو میں اس سے ملنا چاہتا تھا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں اسے یہ سزا ملی ہے۔ میں جنگل میں داخل ہو گیا تھا اور ایک سانپ لائن پر یعنی جنگل کے دو بلاکوں کے درمیان محکمہ جنگلات کی طرف سے بنائی گئی پگ ڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔ بندوق میرے کندھے سے لٹک رہی تھی۔ کارتوسوں کا تھیلا میرے دوسرے کندھے پر لٹک رہا تھا۔

دن کے دس بجے کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ دھوپ درختوں کے اوپر نکلی ہوئی تھی۔ درخت اتنے گنجان اور ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے کہ ان کے نیچے ہلکا ہلکا اندھیرا تھا۔ میں گنجان جنگلوں کا عادی تھا۔ خطرہ اگر تھا تو صرف یہ تھا کہ کسی طرف سے اچانک کوئی آدم خور شیر نہ نکل آئے۔ آدم خور شیر انسان کی بو پاتے ہی اس کے پیچھے لگ جاتا ہے اور ایسی مکاری سے پیچھا کرتا ہے کہ بڑے سے بڑے شکاری کو بھی پتہ نہیں چلتا۔ پھر موقع پاتے ہی آدم خور شیر آدمی کو دبوچ کر لے جاتا ہے۔ جو شیر



آدم خور نہیں ہوتا وہ آدمی پر بھوکا بھی ہو تو حملہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ دوسرا خطرہ ریچھ کا ہوتا ہے۔ ریچھ بڑا بے وقوف اور بے ڈھب درندہ ہے۔ چالاکی، عیاری بالکل نہیں جانتا۔ آدمی کو دیکھ کر سامنے آن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور حملہ کر کے آدمی کو سینے کے ساتھ بھینچ کر اس کی پسلیاں توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ آدمی اگر بھاگ جائے تو اس کا پیچھا شروع کر دیتا ہے اور بڑی مشکل سے جان چھوڑتا ہے۔

چلتے چلتے میں ایک ڈھلان اترنے لگا۔ ڈھلان جہاں جا کر ختم ہوتی تھی وہاں جھاڑیاں تھیں اور چھوٹا سا نالہ بہہ رہا تھا۔ میں نالہ عبور کرنے لگا تو اچانک جھاڑیوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں وہیں رک گیا۔ مجھے شیر کی مخصوص بو آ گئی تھی۔

میں آہستہ آہستہ ایک ایک قدم کر کے پیچھے ہٹتا گیا۔ اتنے میں ایک شیرنی نے جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنا بھاری سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ میں بالکل ساکت کھڑا رہا۔ شیر کے مقابلے میں شیرنی بہت متلون مزاج ہوتی ہے، اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کب آدمی پر حملہ کر دے۔ خاص طور پر جب وہ پورے دنوں سے ہوتی ہے تو سخت چڑچڑی ہو جاتی ہے اور ذرا سی مداخلت پر غضب ناک ہو جاتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ یہ شیرنی پورے دنوں سے نہیں تھی۔ چند سیکنڈ تک وہ میری طرف اپنی چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ میں بھی اسے خاموشی سے ساکت کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر اس نے منہ کھول کر جمائی لی اور نالے میں سے گزر کر جنگل کے درختوں کی طرف چلی گئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اگر وہ مجھ پر حملہ کر دیتی تو میری دونالی بندوق کا فائر اس کو ہلاک نہیں کر سکتا تھا۔

میں بھی نالہ پار کر کے دوسری طرف نکل گیا۔ میری معلومات کے مطابق رانی بائی کا قلعہ نالے کی دوسری جانب جنگل کے تیسرے بلاک میں ایک تالاب کے عقب میں وہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ شہر کی سڑک پر تو آدمی دو فرلانگ کا فاصلہ پیدل چل کر بھی بڑی جلدی طے کر لیتا ہے مگر جنگل میں اور خاص

طور پر گھنے جنگل میں کوئی سڑک تو ہوتی نہیں۔ آدمی کو بڑی عقل مندی سے کام لیتے ہوئے سمت کو درست رکھتے ہوئے خود راستہ بنانا پڑتا ہے اور دو فرلانگ کافی وقت لے جاتے ہیں۔

اگر مجھے جنگلوں میں گھومنے پھرنے کا تجربہ نہ ہوتا تو میرے لئے رانی بائی کے قلعے تک پہنچنا ناممکن تھا۔ بھری ہوئی ڈبل بیرل گن میں نے اپنے سیدھے ہاتھ میں اٹھا رکھی تھی تاکہ کسی بھی خطرے کا ہر وقت مقابلہ کرسکوں۔ میں جھاڑیوں اور درختوں کی لٹکتی ہوئی شاخوں میں راستہ بناتا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ کئی درختوں کی جڑیں زمین سے باہر نکلی ہوئی تھیں۔ کہیں کوئی درخت جڑ سے اکھڑ کر گرا پڑا تھا۔ آخر گھنے درختوں کا دشوار گزار راستہ ختم ہو گیا اور سامنے تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ اس کھلی جگہ پر بھی اونچی اونچی قد آدم گھاس اگی ہوئی تھی۔ اس گھاس کو ہاتھی چھپواں گھاس کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس میں سے گزرتے ہوئے ہاتھی بھی چھپ جاتا ہے۔ جنگلی جانوروں نے اس گھاس میں چھوٹا سا راستہ بنا دیا ہوا تھا۔ میں اس راستے پر پھونک پھونک کر قدم بڑھاتا اس گھاس کے قطعے سے بھی باہر نکل آیا۔

آگے پھر جنگل تھا۔ مگر درخت الگ الگ کھڑے تھے۔ ایک کھائی آگئی۔ میں اس میں سے اتر گیا۔ کھائی کی دوسری جانب باہر نکلا تو سامنے ایک چھوٹا سا ٹیلہ تھا جس کی ڈھلان جھاڑیوں نے ڈھانپ رکھی تھی۔ میں ٹیلے کے پہلو سے ہوتا ہوا دوسری جانب آیا تو سامنے بانس کے درختوں کے جھنڈ کے درمیان ایک چھوٹا سا تالاب تھا اور اس کے پیچھے ایک دیو ہیکل قلعے کی سیاہی مائل بھوری دیوار دکھائی دی۔ یہی رانی بائی کا وہ پراسرار قلعہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی اور جس کے بارے میں رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں مشہور تھیں۔ میں تالاب کے پاس آگیا۔ تالاب زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے تین طرف بانس کے درختوں کے جھنڈ تھے ایک جانب یعنی جس جانب میں کھڑا تھا دیوار کے درختوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی ایک پگڈنڈی آگے کو نکل گئی تھی۔



اس پگڈنڈی پر سے ایک راستہ جھاڑیوں کے درمیان سے ہوتا رانی بائی کے قلعے کی طرف جاتا تھا۔

میں اس راستے پر چلتے ہوئے قلعے کی دیوار کے سامنے آکر رک گیا۔ قلعے کی دیوار کے پتھر کئی جگہوں سے اکھڑ چکے تھے اور وہاں جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ یہ بوسیدہ کھنڈر نما دیوار کافی بلند تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا قلعے کے دروازے کے سامنے آگیا۔ اس محرابی دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے۔ دروازہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس کی دونوں جانب گول چبوترے تھے۔ ان چبوتروں کی شکستہ دیواریں بھی آدھی جھاڑیوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ اندر ایک ڈیوڑھی تھی جہاں دھندلا دھندلا سا اندھیرا تھا۔ میں ڈیوڑھی میں آگیا۔ ڈیوڑھی کے فرش کی بڑی بڑی سلیں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ڈیوڑھی کے کونے میں ایک زینہ تھا جو اوپر کو جاتا تھا۔ میں زینے کی چار پانچ سیڑھیاں چڑھا تو آگے دیوار آگئی۔ خدا جانے یہ دیوار وہاں کس لئے بنائی گئی تھی۔ میں نیچے اتر آیا اور ڈیوڑھی پار کر کے قلعے کے صحن میں آگیا۔ صحن چھوٹا سا تھا۔ اس کے وسط میں گول دائرے میں پتھر کا فوارہ تھا۔ فوارہ تو ٹوٹ پھوٹ گیا تھا صرف اس کی گول دیوار ہی باقی رہ گئی تھی۔ فوارے کے اندر گھاس اگ رہی تھی۔ فوارے کی دوسری جانب پھر ایک چھتی ہوئی سرنگ نما ڈیوڑھی تھی۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا اس سرنگ نما ڈیوڑھی سے بھی گزر گیا۔ اب میں رانی بائی کے قلعے کے درمیانی حصے میں تھا۔ یہاں تین جانب راہ داریاں تھیں۔ ان کے سنگ مرمر کے پتلے پتلے ستون تھے۔ راہ داریوں کے اوپر محل کے جھروکے تھے جن کی بارہ دریوں کے ساتھ جنگلی بیلیں لپٹی ہوئی تھیں۔ یہ یقینی طور پر رانی بائی کا وہ محل تھا جو اس کے عاشق یا خاوند مغل صوبیدار نے اس کے لئے خاص طور پر بنوایا تھا۔ میں خاموش کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

جس چیز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا وہ صحن میں ایک طرف گول چبوترے پر بنی ہوئی چھوٹی سی بارہ دری تھی۔ میں بارہ دری کے پاس آگیا۔ بارہ دری کے اندر ایک مخروطی برجی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ رانی بائی کی وہ مڑھی ہے جہاں رانی بائی کے قتل ہونے کے بعد اس کی لاش کو جلا کر اس کی ہڈیاں یعنی پھول دفن کئے گئے تھے۔ چبوترے کا فرش بھی ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور کہیں کہیں گھاس اگی ہوئی تھی۔ مڑھی کی برجی کا رنگ بھی بارشوں اور دھوپ کی وجہ سے سیاہ پڑ چکا تھا۔

میں مڑھی کے چبوترے سے اتر کر راہداری میں پھرنے لگا۔ ایک جگہ سے زینہ اوپر محل کے چوبارے کو جاتا تھا۔ میں زینہ طے کر کے اوپر آگیا۔ ایک نیم تاریک چھوٹا سا خالی کمرہ تھا جس کی سیاہ دیواریں گویا آگے کو جھکی ہوئی تھیں۔ ایک عجیب قسم کی ٹھنڈی آسیبی خاموشی طاری تھی۔ میں چھوٹے سے دروازے میں سے گزر کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ یہ مستطیل کمرہ تھا اور اس کے جنگل کی جانب تین جھروکے تھے۔ ایک جھروکے میں سے چھوٹی سے گیلری باہر کو نکلی ہوئی تھی مگر گیلری کا فرش غائب تھا اور نیچے گہرائی میں زمین نظر آ رہی تھی۔ میں اس لمبے کمرے میں سے بھی گزر گیا۔ کمرے کے آخر میں پتھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر میں ایک اور گیلری میں آگیا۔

یہ گیلری ایک بڑے سے ہال کے گھیرے کی دیوار کے ساتھ نصف دائرے کی شکل میں بنی ہوئی تھی۔ گیلری کا جنگلا جالی دار پتھروں کا تھا اور فرش سے دو ڈھائی فٹ اونچا تھا۔ میں نے نیچے جھانک کر دیکھا نیچے گول ہال کمرہ تھا جس کے وسط میں ایک گول چبوترہ تھا۔ اس چبوترے پر سنگ سرخ کا ایک تخت بنا ہوا تھا۔ تخت خالی تھا۔ ہال کمرے کی ایک جانب دیوار میں ایک چھوٹا محراب دار دروازہ تھا جس کے اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ میں ایک مسلمان سیاح کی حیثیت سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے ذہن پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ مجھے اس تین سو سال پرانے قلعے میں ابھی تک



عقل کو حیران کر دینے والی یا رونگٹے کھڑے کر دینے والی کوئی شے نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے ان لوگوں پر ہنسی آ رہی تھی جنہوں نے اس قلعے کے بارے میں عجیب و غریب آسیبی کہانیاں گھڑ رکھی تھیں۔

ہندوؤں کا کوئی مذہب نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہے وہ ایک دیومالا ہے۔ ان کے ہاں کوئی آسمانی کتاب نہیں ہے۔ وید ہیں جو رشیوں مینوں نے لکھے ہیں۔ یہ رشی منی بڑے جتی ستی اور دانا لوگ تھے مگر ویدوں میں انہوں نے بھی ہر قسم کے توہمات کو بھر دیا ہے۔ دیوتاؤں کا ذکر ہے جو زمین پر آ کر غیر عورتوں سے رومانس لڑاتے ہیں اور پھر انہیں اغوا کر کے آکاش میں لے جاتے ہیں جہاں ان دیوتاؤں کے مسکن ہیں۔ رامائن میں رام چندر کے بن باس اور راون کے ہاتھوں سیتا جی کے اغوا کی داستان ہے۔ سب سے پہلے رامائن والمیک جی نے سنسکرت میں لکھی تھی بعد میں درویش شاعر تلسی داس نے اسے اس زمانے کی برج بھاشا یعنی عام فہم ہندی زبان میں دوبارہ لکھا۔ یہ دوسری رامائن ہندوؤں میں آج بھی بڑی مقبول ہے۔ تیسری کتاب گیتا ہے۔ گیتا بیس پچیس صفحوں کے حجم کی ایک چھوٹی سی تقریر ہے جو ہندوؤں کے اوتار کرشن جی نے مہابھارت کے میدان جنگ میں اپنے ساتھ ارجن کے آگے اس وقت کی تھی جب اس نے یہ کہہ کر دشمن پر تیر چلانے سے انکار کر دیا تھا کہ دشمنوں کی صفوں میں اس کے سارے رشتے دار موجود ہیں اور وہ اپنے عزیزوں پر تیر نہیں چلا سکتا۔ اس کے جواب میں ہری کرشن نے ارجن کے آگے جو تقریر کر کے اسے لڑائی پر آمادہ کیا تھا وہ تقریر گیتا ہے۔ اس کے علاوہ پران ہیں، اپنشد ہیں جو ویدوں کی شرحیں یا تشریحیں ہیں۔ سینکڑوں دیوی دیوتا ہیں۔ یہ دیوی دیوتا انسانوں کی طرح ایک دوسرے سے حسد بھی کرتے ہیں، نفرت بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو گزند پہنچانے اور ہلاک کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ ہر دیوی دیوتا کی اپنی دیومالا ہے اور اپنا الگ فرقہ ہے ایسے ہزاروں، سینکڑوں فرقے ہیں۔ غرض ہندی دیومالا ایک

عجیب گورکھ دھندا ہے جو خود بڑے بڑے پڑھے لکھے ہندوؤں کی بھی سمجھ میں نہیں آتا۔

پھر آواگون ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہر ہندو مرد اور عورت اپنے اعمال کے مطابق مرنے کے بعد دوبارہ جنم لیتا ہے۔ وہ کسی درندے، کسی جانور، کسی کیڑے مکوڑے، پھل، سبزی، گھاس کی پتی اور پتھر کی شکل میں بھی دوسرا جنم لے سکتا ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ہر ہندو کو ایک لاکھ چوراسی ہزار بار اس دنیا میں جنم لینا پڑتا ہے۔

ہے نا گورکھ دھندا.....!

O



مجھے چونکہ اس قلعے میں کم از کم ایک رات ضرور گزارنی تھی۔ اس لئے میں کسی ایسی جگہ کی تلاش میں تھا کہ جہاں بیٹھ کر رات گزار سکوں۔ میں گیلری والے ہال کمرے سے نکل کر اس کے ساتھ والے چھوٹے کمرے میں آ گیا۔ یہاں جنگل والے تالاب کے رخ پر ایک چھوٹا سا جھروکا بنا ہوا تھا جس میں سے تازہ ہوا بھی اندر آ رہی تھی۔ میں وہیں جھروکے کے پاس بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھے رہنے کے سوائے میرا اور کوئی کام نہیں تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ جو لوگوں نے مشہور کر دیا ہے کہ رانی بائی کا قلعہ آسیب زدہ ہے اور آدھی آدھی راتوں کو اس قلعے میں سے کسی عورت کے دردناک گیت اور سسکیاں بھرنے کی آوازیں آتی ہیں اس کی کیا حقیقت ہے۔ میں کسی اخبار یا کسی رسالے کی طرف سے یہ تحقیقات کرنے نہیں گیا تھا۔ یہ محض میرا ذوقِ تجسس تھا۔

مجھے بچپن ہی سے جن بھوتوں اور چڑیلوں وغیرہ کو دیکھنے کا شوق تھا۔ میں اپنے شہر کے قبرستانوں میں اکثر جایا کرتا تھا کہ شاید وہاں کسی روح سے ملاقات ہو جائے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میری کبھی کسی روح، کسی چڑیل یا جن بھوت سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

کچھ دیر میں رانی بائی کے قلعے سے باہر آ کر تالاب کے کنارے اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ میں نے دو ہرن دیکھے جو تالاب پر آ کر پانی پی رہے تھے۔ جیسے ہی انہیں میری موجودگی کا احساس ہوا وہ ڈر کر جنگل میں بھاگ گئے۔ جب سورج مغرب کی جانب

ڈھلنے لگا اور جنگل میں شام کا دھندلکا چھانا شروع ہو گیا تو میں قلعے میں آ کر جھروکے کے پاس بیٹھ گیا۔ بھری ہوئی بندوق میں نے اپنے پاس ہی رکھی ہوئی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو وہیں تھیلے کا سرہانہ بنا کر لیٹ گیا۔ مجھے نیند آ گئی۔

معلوم نہیں کتنی دیر سویا رہا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے ایسے لگا جیسے میں نے کوئی آواز سنی تھی لیکن یہ نیند کی حالت میں سنی ہوئی کوئی آواز بھی ہو سکتی تھی۔ میرے چاروں جانب اندھیرا تھا۔ جھروکے میں سے رات کی پھیکی پھیکی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کان لگا کر سننے لگا کہ وہ آواز کیا تھی مگر وہاں سوائے جنگل کے سناٹے اور تالاب کے کنارے بولتے ایک دو جھینگروں کی آوازوں کے اور کوئی آواز نہیں تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ ٹیک لگالی اور آنکھیں بند کر کے دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے آنکھیں بند کئے بمشکل ایک ڈیڑھ منٹ ہی گزرا ہو گا کہ مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کسی نے آہ بھرنے کے انداز میں گہرا سانس لیا ہو۔ میں نے دیوار کے ساتھ بیٹھے بیٹھے آنکھیں کھول دیں اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر جلایا۔ لائٹر کی روشنی نے اس چھوٹے سے پرانے کمرے کی تاریکی کو تھوڑی دیر کے لئے روشن کر دیا۔

کمرہ بالکل خالی تھا۔ میں نے لائٹر بجھا کر جیب میں ڈالا تو مجھے ایک بڑی پراسرار سی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس قسم کی خوشبو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ شاید وہ خواب میں دیکھے ہوئے باغ کی خوشبو تھی اس کے ساتھ ہی کسی کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ ایسے لگا جیسے کوئی ریشمی لباس والی عورت میرے قریب سے گزر گئی ہو۔ میں نے جلدی سے دوبارہ لائٹر جلایا۔ کمرہ خالی تھا وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ لیکن میں نے اپنے ہوش و حواس کے ساتھ کسی عورت کے آہ بھرنے اور اس کے ریشمی ملبوس کی خوشبو محسوس کی تھی۔



اس کے بعد ایک بار پھر وہی پراسرار سناٹا چھا گیا۔

اب میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ اچانک جنگل میں سے انسانی چیخوں کی آوازیں بلند ہوئیں۔ یقین کریں میں جو اپنی طرف سے بڑا حقیقت پرست اور بہادر بنتا تھا ایک بار میں بھی خوف سے لرز گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی درندے نے اچانک کسی انسان کو دبوچ لیا ہو اور اسے پھاڑ رہا ہو۔ دوسرے لمحے چیخوں کی آواز بند ہو گئی اور جنگل کی خاموشی اور زیادہ گہری اور وحشت ناک ہو گئی۔ مجھے یاد آ گیا۔ اس قلعے کے بارے میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ قلعے کے آس پاس جنگل میں سے رات کے وقت ان بدنصیب انسانوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں جنہیں جنگلی درندوں نے ہڑپ کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ کم از کم یہ روایت ضرور سچی تھی۔

میری نیند غائب ہو چکی تھی۔ میں قلعے کے چھوٹے سے ویران کمرے کے جھروکے کے پاس کان لگائے اس انتظار میں بیٹھا تھا کہ دیکھیں اب کون سی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں نے لائٹر جلا کر اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کے پونے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے گردن اونچی کر کے پتھر کے جھروکے میں سے باہر دیکھا جنگل ایسے ساکت اور خاموش تھا جیسے کسی نے اس پر جادو پھونک دیا ہو۔ میں نے جنگل کی کئی راتیں دیکھی تھیں۔ جنگل کتنا ہی خاموش کیوں نہ ہو اس کی خاموشی میں بھی کوئی نہ کوئی آواز ضرور سنائی دے جاتی ہے۔ کسی درخت کی سوکھی شاخ کے اپنے آپ اچانک گرنے کی آواز، کسی بھٹکے ہوئے پرندے کی آواز جو راستہ بھول کر ادھر آ نکلا ہو یا پھر دور کسی بھیڑیئے یا لگڑ بگڑ کے بولنے کی آواز..... اور کچھ نہیں تو کہیں نہ کہیں کوئی جھینگر ضرور بول رہا ہوتا ہے۔

لیکن اس جنگل میں تو موت کی خاموشی چھا گئی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے جنگل کی ہر چیز بے جان ہو گئی ہے یا پھر کسی نے جنگل کی ہر شے پر خاموشی کا طلسم پھونک دیا ہے۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ اس بے جان خاموشی کا اثر مجھ پر بھی ہونے لگا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرے دل نے بھی دھڑکنا بند کر دیا ہے اور میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ سینے پر رکھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا مگر اس کی دھڑکن بڑی مشکل سے محسوس ہو رہی تھی۔

اتنے میں مجھے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دی۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ پراسرار آسیبی آواز سن کر کچھ دیر کے لئے میرے جسم کے رونگٹے بھی کھڑے ہو گئے تھے لیکن اپنے حقیقت پسند مزاج کی وجہ سے میں نے بڑی جلدی اپنے حواس پر قابو پا لیا اور سسکیوں کی آواز کو بڑے غور سے سننے لگا۔ سسکیوں کی آواز کسی غم زدہ عورت کی تھی جو کبھی تو مجھے اپنے بالکل قریب محسوس ہوتی اور کبھی دور چلی جاتی۔ چند لمحوں کے بعد سسکیوں کی آواز بند ہو گئی اور ایک بار پھر خاموشی چھا گئی......

مگر یہ خاموشی زیادہ دیر تک نہ رہی۔ پھر ایسی آواز آنے لگی جیسے کوئی غم نصیب عورت روتے ہوئے کوئی دردناک گیت گا رہی ہو۔ یہ روایت بھی میں نے سن رکھی تھی کہ اس قلعے میں سے آدھی رات کو پہلے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور پھر روتے ہوئے درد بھرے گیت گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میں کان لگا کر غور سے سننے لگا۔ عورت کی آواز ایسی تھی جیسے بین کرتے ہوئے ساتھ ساتھ گیت کے بول دہرا رہی ہو۔ گیت کے بول میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہے تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح سے معلوم کر سکوں کہ وہ کس زبان کا گیت گا رہی ہے مگر کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ عورت کے بین ایسے تھے کہ ان میں خوف بھی تھا اور دہشت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ پھر ایک دم یہ آواز بھی غائب ہو گئی۔

رانی بائی کے قلعے کے بارے میں، میں نے جو روایتیں سنی تھیں وہ سچی ثابت ہو چکی تھیں۔ اب میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی حقیقت کیا ہے اور یہ عورت کون



ہے جو پہلے سسکیاں بھرتی رہی تھی اور پھر درد بھرے گیت گاتے ہوئے رو رہی تھی۔ میں نے بیٹھے بیٹھے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ آوازیں قلعے کی اس جانب سے آ رہی ہیں جس طرف قلعے کا بڑا کمرہ تھا جس کی دیوار کے ساتھ نصف دائرے میں سنگ سرخ کی پرانی گیلری بنی ہوئی تھی۔

میں نے بندوق سنبھالی اور اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل کر گیلری والے کمرے کی طرف بڑھا۔ اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جیب سے لائٹر نکال کر جلا لیا۔ لائٹر کی روشنی میں، میں نے پتھر کے زینے کی تین سیڑھیاں چڑھیں اور اوپر گیلری میں آ گیا۔ وہاں آتے ہی میں نے لائٹر بجھا دیا اور وہیں بیٹھ گیا اور گیلری کے جنگلے کی جالیوں میں سے نیچے ہال کمرے میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہال کمرے کے وسط میں چبوترہ اسی طرح خالی خالی تھا۔ چبوترے کے اوپر بنا ہوا پتھر کا تخت بھی خالی اور ویران پڑا تھا۔ فضا میں ایک سنسناہٹ سی لرز رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہاں کچھ ہونے والا ہے۔ میں پتھر کی جالی کے ساتھ لگ کر چپ چاپ اور دم بخود سا ہو کر بیٹھا نیچے دیکھ رہا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہال کمرے کی دیواروں پر اندھیرا تھا مگر کمرے کے درمیان میں خدا جانے کہاں سے دھندلی دھندلی روشنی آ رہی تھی۔ یہ روشنی دھند کی طرح صرف چبوترے اور اس کے اوپر والے خالی تخت تک ہی محدود تھی۔

جنگل کی طرف تو پہلے ہی سناٹا طاری تھا۔ سنسناہٹ کی لرزتی ہوئی آواز ایسی تھی جیسے یہ کسی آواز کی صدائے بازگشت ہو اور آہستہ آہستہ مدھم پڑ رہی ہو۔ پھر یہ آواز بھی گم ہو گئی۔ میں نے اپنی شکاری اور جہاں گردی کی زندگی میں کئی راتیں جنگلوں، صحراؤں اور بیابانوں میں کاٹی ہیں مگر ایسی خاموشی میں نے کسی جگہ محسوس نہیں کی تھی۔ یہ خاموشی کی خاموشی تھی۔ موت کا سکوت بھی اس خاموشی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ مجھے اپنا وجود اس خاموشی میں پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہوتا

محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں پتھر کا مجسمہ نہیں بنا تھا۔ میں اس ازلی اور ابدی اور بہت حد تک آسیب زدہ سکوت کا حصہ بھی تھا اور اس کا تماشائی بھی تھا۔

یہ دہشت ناک سکوت زیادہ دیر تک قائم نہ رہا اور اچانک مجھے کسی عورت کے بین کرنے کی مدھم آواز سنائی دی۔ آواز ایسے لگ رہا تھا جیسے قلعے کے کسی دوسرے حصے سے آ رہی تھی لیکن اس آواز سے موت کی خاموشی کا طلسم ٹوٹ گیا تھا۔ عورت کے آہستہ آہستہ بین کرنے اور رونے کی آواز قریب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ یہ وہی آواز تھی جسے میں جھروکے والے کمرے میں بیٹھا پہلے بھی سن چکا تھا۔ یہ اسی بدنصیب عورت کی آواز تھی۔

مجھے یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ یہ کس عورت کی آواز ہے۔ یہ کون بدنصیب عورت ہے جو آدھی رات کے وقت اس ویران قلعے میں آ کر رو رہی ہے۔ میں اس عورت کو اپنی زندگی کی کوئی زندہ ہستی سمجھ رہا تھا۔

لیکن بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔ لیکن معمہ اس طرح حل ہوا کہ حل ہونے کے بعد اس نے ایک ایسے معمے کی شکل اختیار کر لی جس کا حل شاید کسی کو معلوم نہیں تھا۔

عورت کے رونے اور بین کرنے کی آواز جیسے جیسے قریب ہوتی جا رہی تھی میرے اشتیاق میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور مجھ پر ایک ہیجانی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی کہ یہ عورت کون ہے اور کس طرف سے اس کمرے میں آ رہی ہے۔ دیواروں پر جیسے اندھیرے کے سیاہ گہرے سائے پڑے ہوئے تھے۔ پھر ایک ایسی بات ہوئی جس نے میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑا دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والی دیوار کا اندھیرا ایک جگہ سے غائب ہو گیا اور دیوار میں ایک غار نظر آنے لگا۔ پھر اس غار میں سے ایک سیاہ فام آدمی نمودار ہوا جس نے دونوں ہاتھوں سے تلوار تھام رکھی تھی اور



آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا غار میں سے نکل رہا تھا۔ اس کے پیچھے دو اور حبشی غلام نمودار ہوئے جنہوں نے ایک جوان عورت کو زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور اسے آہستہ آہستہ کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔

عورت نے گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ بال گھنے تھے۔ سر پر سفید ہیروں سے جڑا ہوا چھوٹا سا تاج تھا۔ عورت بڑی خوبصورت تھی۔ اس کے نقش تیکھے تھے اور گلے میں بھی موتیوں کا ہار تھا۔ عورت سر کو دائیں بائیں کرب کے ساتھ ہلاتی دھیمی آواز میں بین کرتے ہوئے رو رہی تھی۔ اس کے پیچھے دو اور سیاہ فام حبشی غلام نمودار ہوئے جنہوں نے ایک زرنگار کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ کرسی پر ایک منڈھے ہوئے سر والا آدمی گردن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اس آدمی کا رنگ گندمی تھا، آنکھوں میں طلسمی چمک تھی۔ جسم کو ایک زرد چادر میں لپیٹ رکھا تھا اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کی چھڑی تھی۔ وہ اس شان سے کرسی پر بیٹھا تھا جیسے اس قلعے کا مالک ہو۔

یہ جلوس کمرے کے وسط میں چبوترے کے پاس آ کر رک گیا۔ منڈھے ہوئے سر والے آدمی کی کرسی حبشی غلاموں نے چبوترے کے سامنے آہستہ سے رکھ دی۔ دونوں غلام بڑے ادب سے کرسی کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے۔ جن دو حبشی غلاموں نے عورت کو پکڑ رکھا تھا وہ عورت کو کھینچتے ہوئے چبوترے پر لے گئے اور اسے تخت پر لٹا دیا۔ عورت نے کوئی مزاحمت نہ کی وہ ایسے لیٹ گئی جیسے پہلے سے تیار ہو۔ دونوں غلام پیچھے ہٹ گئے۔ اب وہ غلام آگے بڑھا جس نے ہاتھوں میں تلوار اٹھا رکھی تھی۔ وہ عورت کے پہلو کی جانب تخت کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ عورت اب بین نہیں کر رہی تھی۔ اس کے منہ سے بار بار یہی الفاظ نکل رہے تھے۔

"مجھے جانے دو..... مجھے جانے دو۔"

تلوار بردار حبشی غلام نے گردن آہستہ سے موڑ کر کرسی پر بیٹھے آدمی کی طرف

دیکھا۔ کرسی پر بیٹھے زرد پوش آدمی نے آہستہ سے اپنی چھڑی اوپر اٹھا دی۔ اس کے ساتھ ہی حبشی غلام نے تلوار کے دستے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر اٹھایا اور پھر تلوار پوری قوت سے تخت پر لیٹی ہوئی عورت کے سینے میں گھونپ دی۔

عورت کے حلق سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی اور ساتھ ہی اس کے سینے سے خون کا فوارہ اچھل پڑا۔ خون کے چھینٹے حبشی غلام کے جسم پر پڑنے لگے۔ حبشی غلام نے تلوار عورت کے سینے سے نکالی اور تلوار کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر دو قدم پیچھے ہٹ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ پھر کرسی پر بیٹھا ہوا زرد پوش آدمی اٹھا اور بڑے وقار سے قدم اٹھاتا چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ کر تخت کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ تخت پر عورت کی لاش خون میں لت پت بے حس و حرکت پڑی تھی۔ زرد پوش آدمی نے ہاتھ اٹھا کر ایسے اشارہ کیا جیسے کوئی چیز طلب کر رہا ہو۔ اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر کرسی کی دونوں جانب کھڑے حبشی غلام دوڑ کر چبوترے کے پاس آئے پھر انہوں نے چبوترے کی دیوار میں سے پتھر کی سل کو پیچھے ہٹایا اندر سے ایک سیاہ مرتبان نکالا جس کا منہ ڈھکن سے بند تھا۔ غلاموں نے سیاہ مرتبان زرد پوش کے سامنے تخت پر عورت کی لاش کے پاس رکھ دیا اور خاموشی سے پچھلے پاؤں چبوترے سے اتر گئے۔

میں یہ منظر خوف زدہ آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ میں خواب میں دیکھ رہا ہوں یا یہ عالم بیداری ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں دہشت زدہ ضرور تھا اور پتھر کی جالی سے لگا پتھر بن کر یہ خونی کھیل دیکھ رہا تھا۔

زرد پوش آدمی نے سیاہ مرتبان کا ڈھکن الگ کر دیا اور عجیب سے منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ منتر پڑھتے ہوئے تھوڑی دیر کے بعد وہ عورت کی لاش پر مرتبان میں سے کوئی راکھ سی نکال کر چھڑک دیتا تھا۔ آہستہ آہستہ عورت کی لاش میں سے دھوئیں کی سیاہ لہریں اٹھنا شروع ہو گئیں۔ یہ دھواں عورت کی لاش سے الگ ہو کر لہروں کی شکل میں اس کے اوپر گول دائرے میں چکر لگانے لگا تھا۔ جیسے جیسے



دھوئیں کی لہریں گہری سیاہ ہو رہی تھیں عورت کی لاش غائب ہونے لگی تھی۔ پھر عورت کی لاش غائب ہو گئی اور اس کی جگہ تخت کے اوپر سیاہ دھوئیں کا ایک گولہ سا چکر لگا رہا تھا۔

زرد پوش آدمی نے منتر پڑھتے پڑھتے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا، دھوئیں کا گولہ گھومتے گھومتے چھوٹا ہوتا چلا گیا۔ پھر اس دھوئیں نے ایک عورت کے جسم کی شکل اختیار کر لی۔ جیسے ہی دھواں عورت کے جسم میں تبدیل ہوا زرد پوش آدمی نے دھوئیں کو اپنی مٹھی میں بند کر لیا۔ دھواں عورت کے چھوٹے سے جسم کی شکل میں زرد پوش آدمی کی مٹھی میں بند تھا۔ وہ منتر اسی طرح پڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آواز پہلے سے بلند ہو گئی تھی۔ پھر زرد پوش آدمی نے منتروں کا جاپ کرتے ہوئے اپنی وہ مٹھی مرتبان کے اندر ڈال دی جس میں عورت کی لاش کا دھواں مجسم روپ میں تھا۔ کچھ دیر اپنی مٹھی مرتبان کے اندر ڈالے رکھنے کے بعد زرد پوش آدمی نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ مرتبان سے باہر نکال کر مرتبان کا منہ ڈھکن سے بند کر کے ڈھکن کو اچھی طرح سے کس دیا اور دونوں بازو پھیلا کر چھت کی طرف دیکھ کر حلق سے ایک چیخ کی آواز نکالی اور مرتبان کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر آہستہ آہستہ چبوترے کی سیڑھیاں اتر کر اس جگہ آ گیا جہاں چبوترے کی دیوار میں سے سل کو ہٹا کر مرتبان باہر نکالا گیا تھا۔

زرد پوش آدمی کے اشارے سے دو حبشی غلام آگے بڑھے۔ انہوں نے زرد پوش کے ہاتھوں سے سیاہ مرتبان اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پھر مرتبان کو چبوترے کے شگاف کے اندر رکھ کر پتھر کی سل سے چبوترے کی دیوار کے شگاف کو بند کر دیا۔ زرد پوش آدمی واپس مڑا اور قدم قدم چل کر اپنی زرنگار کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں غلاموں نے کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ جس حبشی غلام نے عورت کے سینے میں تلوار گھونپی تھی وہ خون آلود تلوار دونوں ہاتھوں میں تھام کر اسے اوپر

اٹھائے کرسی کے آگے آگے چلنے لگا۔ باقی دونوں غلام پیچھے ہو گئے اور سر جھکائے کرسی کے پیچھے پیچھے ادب سے چلنے لگے۔

یہ عجیب و غریب جلوس اس دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے شگاف میں سے یہ نکلا تھا۔ دیوار ساری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ صرف جہاں غار نما شگاف تھا وہاں ہلکی ہلکی پراسرار سی روشنی تھی۔ زرد پوش آدمی اپنے غلاموں کے ساتھ دیوار کے غار نما شگاف میں داخل ہوتے ہی میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہال کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ چبوترے اور تخت پر پہلے جو دھندلی دھندلی روشنی دکھائی دے رہی تھی وہ بھی اب غائب ہو چکی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک خونی ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ میں حیران بلکہ حیرت زدہ وہیں کا وہیں بیٹھا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے کیا وہ حقیقت تھی یا محض میرا وہم تھا۔ کیا یہ سب کچھ حقیقی دنیا میں ہوا تھا یا سب کچھ عالم ماورا میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اگرچہ یہ ساری باتیں، سارے خونی منظر جو میں نے دیکھے تھے میری آنکھوں کے سامنے ہوئے تھے لیکن اس کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تخت پر پڑی عورت کی لاش کیسے غائب ہو کر دھواں بن گئی تھی۔

میرے ذوق تجسس نے کہا کہ چبوترے کی دیوار کی سل ہٹا کر سیاہ مرتبان نکال کر اسے کھول کر دیکھوں کہ اس کے اندر سچ مچ دھواں ابھی تک عورت کے جسم کی شکل میں ہی ہے کہ نہیں؟ حالانکہ مجھے اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا بلکہ الٹا نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا لیکن میرے ارادوں پر میرا شوق اور ذوق تجسس غالب تھا۔ میں یہ راز معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مرتبان کے اندر اور کیا کیا ہے؟

اگر اس وقت مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس مرتبان کے کھولنے سے مجھ پر کیسی کیسی بھیانک مصیبتیں نازل ہو جائیں گی تو میں اس کالے مرتبان کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔

لیکن کہتے ہیں کہ مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ چنانچہ میرے



ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ جب میں نے تسلی کر لی کہ پراسرار ہال کمرے میں اب کوئی بد روح نہیں رہی تو میں گیلری کا تاریک زینہ اتر کر چبوترے کے پاس گیا۔ اندھیرے میں مجھے تھوڑا؛ تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے تخت کو غور سے دیکھا وہاں کسی جگہ پر خون کے نشان نہیں تھے۔ میں چبوترے کی دیوار کے پاس اس جگہ بیٹھ گیا جہاں سیاہ فام حبشی غلاموں نے سیاہ مرتبان چھپایا تھا۔ میں نے ہاتھ سے ٹٹول کر دیکھا کہ ایک جگہ سے پتھر کی سل ذرا سی اکھڑی ہوئی تھی۔

میں نے سل کو دونوں ہاتھوں سے زور لگا کر پیچھے کھسکا لیا۔ پھر شگاف میں جھانک کر دیکھا۔ وہاں سیاہ مرتبان موجود تھا۔ جیسے ہی میں نے مرتبان کو ہاتھ لگایا مجھے ایسے محسوس ہوا جیسے بجلی کا خفیف سا جھٹکا لگا ہو۔ میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ دوسری بار ہاتھ لگایا تو کسی قسم ک جھٹکا نہ لگا۔ میں نے مرتبان کو باہر نکال لیا۔ اس کے ڈھکن کو کھولنے لگا کہ کچھ سوچ کر رک گیا۔ پتھر کی سل کو چبوترے کی دیوار کے ساتھ لگا کر شگاف کو بند کر دیا۔ مرتبان کو بغل میں دبایا اور زینہ چڑھ کر گیلری میں آیا۔ گیلری کا زینہ اتر کر راہ داری میں سے ہوتا ہوا واپس جھروکے والی چھوٹی سی کوٹھڑی میں آ گیا۔ کوٹھڑی میں اندھیرا تھا۔ میں نے لائٹر جلا کر اس کی روشنی میں مرتبان کا جائزہ لیا۔ یہ کسی مضبوط دھات کا بنا ہوا مرتبان تھا۔ اس کا رنگ کچھ اور ہو گا لیکن اتنی مدت سے دیوار کے اندر پڑے پڑے اس کا رنگ سیاہ پڑ گیا تھا۔ میں نے ڈھکن کو دیکھا۔ ڈھکن پیچ دار تھا۔ میں اسے گھما کر کھولنے لگا تو جیسے اندر سے آواز سی آئی کہ اسے مت کھولو۔ میں رک گیا۔ مرتبان کو دیوار کے ساتھ اپنے قریب ہی رکھ لیا اور سوچنے لگا کہ اسے کھولوں یا نہ کھولوں؟

O

میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ جب آدمی کے کسی گناہ کی پاداش میں اس پر سزا کے طور پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو سب سے پہلے اس آدمی کی عقل ماری جاتی ہے۔ عقل ان معنوں میں ماری جاتی ہے کہ قدرت اس سے اس کی قوت فیصلہ چھین لیتی ہے۔ وہ یہ کروں یا نہ کروں کے چکر میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مرتبان کھولوں یا نہ کھولوں۔۔۔۔۔ آدمی خطاکار ہے۔ اس سے زندگی میں خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اس کی بعض خطائیں، بعض گناہ اللہ غفور الرحیم معاف فرما دیتا ہے لیکن بعض خطائیں ایسی ہوتی ہیں جن کی سزا انسان کو ضرور بھگتنی پڑتی ہے۔ مجھے بھی قدرت کی طرف سے میرے کسی ایسے ہی گناہ کی سزا ملنے والی تھی۔ میں آسیبی قلعے کی جھروکے والی کوٹھڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ مرتبان کو کھولوں کہ نہ کھولوں؟

جب میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا تو میں نے کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ سر لگا دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سربستہ رازوں کو بے نقاب کرنے کا شوق کہتا تھا کہ ابھی مرتبان کو کھول کر دیکھو کہ اس کے اندر کیا ہے۔ دل کے اندر سے بڑی دھیمی سی آواز آتی کہ اسے مت کھولنا، اسے وہیں چھوڑ آؤ جہاں سے اٹھا کر لائے ہو۔

اسی تذبذب میں مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ پھر میں عالم خواب میں پہنچ گیا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک تاریک غار میں سے گزر رہا ہوں۔ میں زمین پر چل



نہیں رہا میرے پاؤں زمین سے اوپر اٹھے ہوئے ہیں اور میں ہوا میں پرواز کرتا جا رہا ہوں۔ غار میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ پھر اچانک مجھے کسی عورت کے سسکیاں بھر کر رونے کی آواز آتی ہے۔ میں اپنے آپ اس آواز کی طرف مڑ جاتا ہوں۔ یہ آواز غار کے اندر بنی ہوئی کوٹھڑی میں سے آ رہی ہے۔ کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر دیکھتا ہوں کہ اندر فرش کے درمیان ایک گول کنواں ہے۔ کنوئیں کے اندر روشنی ہو رہی ہے۔ عورت کے رونے کی آواز کنوئیں کے اندر سے آ رہی ہے۔ میں کنوئیں کی منڈیر پر سے کنوئیں میں جھانکتا ہوں۔ کنوئیں کی تہہ میں آگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں۔ عورت کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آواز ان شعلوں میں سے آ رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے۔ "مجھے باہر نکالو۔۔۔۔۔ مجھے باہر نکالو۔۔۔۔۔ میں جل رہی ہوں۔۔۔۔۔ میں جل رہی ہوں۔"

میں عالم خواب میں ہی عورت کو کہتا ہوں کہ "میں تمہیں کیسے باہر نکالوں۔"

عورت روتے روتے کہتی ہے۔ "کنوئیں کا ڈھکن کھول دو۔ کنوئیں کا ڈھکن کھول دو۔ مجھے عذاب سے نجات مل جائے گی۔"

میں عورت کو کہتا ہوں۔ "کنوئیں کا تو کوئی ڈھکن نہیں ہے۔ کنواں تو کھلا ہے۔"

عورت سسکی بھر کر کہتی ہے۔ "کنوئیں کا ڈھکن کھول دو۔ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔"

اس کے ساتھ ہی اچانک میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں چونک کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہوں۔ یقین نہیں آتا کہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں وہ مرتبان میں قید عورت کی روح تو نہیں تھی جو بار بار کہہ رہی تھی کہ "مجھے کنوئیں سے باہر نکالو۔ مجھے عذاب سے نجات دلاؤ۔"

میرا حقیقت پسند ذہن اس خواب کو سچ ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ اچانک اسی عورت کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ وہ سسکیاں بھر کر کہہ رہی تھی۔ "مجھے باہر

نکالو..... مجھے آگ سے باہر نکالو۔"

میں نے محسوس کیا کہ آواز مرتبان میں سے آرہی تھی۔ چونکہ میں بدروحوں کا قائل نہیں تھا اس لئے میں نے اس عورت کی آواز پر کوئی توجہ نہ دی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مرتبان کے اندر سے عورت کی درد بھری آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد آرہی تھی۔ آخر میرا شوق تجسس میری عقل پر غالب آ گیا۔ اور میں نے مرتبان کے پیچ دار ڈھکن کو آہستہ آہستہ کھولنا شروع کر دیا۔ ڈھکن کو کھلتے دیکھ کر عورت کی آواز اب نہیں آرہی تھی۔ میں نے مرتبان کا ڈھکن کھول دیا۔

ڈھکن کے کھلتے ہی ایک ایسی بھیانک چیخ کی آواز بلند ہوئی کہ جس سے جنگل کی فضا دیر تک گونجتی رہی۔ میں نے ڈر کر مرتبان کو ہاتھوں سے چھوڑ دیا تھا۔ مرتبان اندھیرے میں مجھ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر فرش پر ٹیڑھا ہو کر پڑا تھا اور اس میں سے سفید دھوئیں کی لکیر سی نکل رہی تھی۔ میں بندوق تھام کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہی بھیانک چیخ ایک بار پھر بلند ہوئی۔ میں باہر کو بھاگنے لگا تو اچانک مرتبان میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں نے ایک زندہ عورت کی شکل اختیار کر لی۔ یہ عورت وہی تھی جسے میری آنکھوں کے سامنے تخت پر لٹا کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے سر پر سفید ہیروں کا تاج تھا، گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی، بال کھلے تھے۔ وہ گلابی رنگ کی ریشمی ساڑھی میں ملبوس تھی۔

عورت کا جسم اختیار کرتے ہی اس نے مجھے روک کر کہا۔ "باہر مت جانا....."

میرے دل پر ایک خوف سا طاری ہو گیا تھا۔ انسانی چیخ کی بھیانک آواز نے میرے اعصاب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اوپر سے ایک مردہ عورت زندہ ہو کر مرتبان سے نکل کر میرے سامنے آن کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بولنا چاہا لیکن خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ اب بیک وقت کئی انسانوں کی چیخوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں یہ آوازیں ایسے لگ رہا تھا جیسے ہماری کوٹھڑی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔



پھر اچانک کوٹھڑی کے جھروکے میں سے آگ کا ایک شعلہ سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا اندر کی جانب لپکا۔ عورت نے میری کلائی پکڑی اور مجھے کھینچتی ہوئی کوٹھڑی کے دروازے میں سے باہر نکل گئی۔ قلعے کے دالان میں اندھیرا تھا۔ عورت مجھے کھینچتی ہوئی قلعے کے بڑے دروازے کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

چیخوں کی آوازیں زیادہ خوفناک ہو گئی تھیں اور ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے قلعے کے بھوت ہمیں ہلاک کرنے کے لئے ہماری طرف دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے ایک لمحے کے لئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے آگ کے شعلے تھے۔ ہر شعلے کی شکل سانپ کی طرح تھی اور یہ آگ کے سانپ لہراتے، پھنکارتے ہمارے اتنے قریب آگئے تھے کہ کسی بھی لمحے ہم دونوں کو جلا کر بھسم کر سکتے تھے۔ جب آگ کے ایک شعلہ نما سانپ نے میرے جسم کو اپنی لپیٹ میں لینا چاہا تو عورت نے مجھے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا اور پھر ایسا ہوا کہ مجھے نہیں معلوم کس طرح سے میرے پاؤں اپنے آپ زمین سے دو تین فٹ بلند ہو گئے اور میں اس ماورائی عورت کے ساتھ فضا میں پرواز کرتا ہوا تیزی سے قلعے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ جنگل میں رات کے پچھلے پہر کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ عورت میری کلائی تھامے مجھے اپنے ساتھ لے کر درختوں کے درمیان سے اتنی تیزی سے پرواز کرتی چلی جا رہی تھی کہ جیسے درخت اس کو خود بخود راستہ دے رہے ہوں۔ میرا ایک ہاتھ اس ماورائی عورت کی گرفت میں تھا، دوسرے ہاتھ میں بندوق تھی۔ میں اپنے آپ کسی مرئی طاقت کے زیر اثر فضا میں تیرتا جا رہا تھا۔

درخت سامنے آتے تو میں آنکھیں بند کر لیتا کہ درخت سے ٹکرانے لگا ہوں لیکن درخت سے ٹکرائے بغیر میں عورت کے ساتھ آگے نکل جاتا۔ میں کب تک اس عورت کے ساتھ پرواز کرتا رہا؟ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر ایسا ہوا کہ ہم رات کی تاریکی میں ایک دریا کے اوپر سے گزر گئے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مجھے

اندھیرے میں ایک ویران سا کھنڈر دکھائی دیا۔ وہ عورت کھنڈر کے پاس جا کر زمین پر اتر گئی۔ میرے پاؤں بھی زمین پر لگ گئے۔ میں اس عورت سے بات کرتے ڈر رہا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت نارمل زندہ عورت نہیں ہے بلکہ ایک بدروح ہے جو میرے لئے کسی نہ کسی مصیبت کا باعث بن سکتی ہے۔ میں نے غلطی کی تھی کہ اسے مرتبان سے آزاد کر دیا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھی۔ اس نے ابھی تک میری کلائی پکڑ رکھی تھی اس کے ہاتھ کی گرفت بڑی سخت تھی، اتنی سخت کہ میرے جیسے صحت مند شکاری آدمی کی کلائی درد کرنے لگی تھی۔

جب وہ مجھے ساتھ لے کر کھنڈر میں داخل ہونے لگی تو میں نے اپنے قدم روک لئے اور ہمت کر کے اس عورت سے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا۔ تم مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تمہیں آزاد کر دیا ہے۔ اب جہاں جی چاہے چلی جاؤ۔''

عورت نے میری کلائی چھوڑ دی۔ وہ بالکل میرے قریب کھڑی تھی۔ آسمان پر صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا تھا۔ سحر کی دھندلی روشنی میں اس عورت کی آنکھیں سیاہ ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس چمک میں ایک محبت اور رحم کا احساس تھا۔ یہ عورت دراز قد تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا مگر چہرے کے نقوش بڑے دلکش تھے۔ کہنے لگی۔ ''تم نے مجھے رگھو کی قید سے آزاد کر کے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری زندگی کی حفاظت اب میرا فرض بن چکا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں مجھ پر مہربانی کرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو۔'' یہ کہہ کر میں نے بندوق کندھے پر رکھی اور واپس جانے کے لئے مڑا تو اس عورت نے پیچھے سے میرا بازو پکڑ لیا اور بولی۔ ''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔''

میں نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''میں مسلمان ہوں۔ میری زندگی اور



موت میرے اللہ کے اختیار میں ہے۔''

عورت نے ایک بار پھر میرا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ ''میں جانتی ہوں تم مسلمان ہو۔ میں تمہارے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہوں کہ خود تم بھی نہیں جانتے۔ میں اگرچہ ہندو برہمن کے گھر پیدا ہوئی تھی لیکن میں اسلام قبول کر چکی ہوں۔ میں بھی مسلمان ہوں۔ میں جانتی ہوں زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے لیکن اللہ پاک کا یہ بھی حکم ہے کہ اپنی زندگی کی حفاظت کرو اور جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔''

میں حیران سا ہو کر اس عورت کو دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک قتل ہو چکی عورت کی روح یا بدروح تھی مگر بالکل نارمل زندہ عورت کی طرح بول رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ اب مجھے اس سے بالکل خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا مگر میں اس کے پاس ایک سیکنڈ کے لئے بھی ٹھہرنے کو تیار نہیں تھا۔ میں اس روحوں بدروحوں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ''خدا کے لئے میری جان چھوڑ دو۔ تم ایک بدروح ہو۔ میں نے تمہیں قتل ہوتے اور مرتے دیکھا ہے۔ تم ایک مردہ عورت ہو۔ تم ایک بد روح ہو۔ چھوڑ دو مجھے......''

اور میں اپنا بازو چھڑا کر تیز تیز چل پڑا۔ میں نے ایک لمحے کے لئے بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا کہ اس عورت کی بدروح چلی گئی ہے یا وہیں کھڑی ہے۔ صبح کا نور چاروں طرف جنگل میں پھیلنے لگا تھا۔ میرا رخ دریا کی طرف تھا۔ یہ وہی دریا تھا جس کے اوپر سے وہ عورت مجھے پرواز کرتے ہوئے لائی تھی۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھ رہا تھا جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ درخت اتنے گنجان تھے کہ انہوں نے سارے جنگل پر ایک چھت ڈال رکھی تھی۔ ان درختوں کے نیچے دن کی روشنی شاید کبھی نہیں پہنچتی تھی۔ دریا اس جنگل کے پار تھا۔ مجھے امید تھی کہ دریا پر کوئی نہ کوئی گھاٹ ضرور ہوگا جہاں سے دیہاتی لوگ دریا پار کرتے ہیں۔ میں وہیں سے دریا پار کر کے کسی ریلوے سٹیشن پر

پہنچنے کی کوشش کروں گا تاکہ وہاں سے کوئی گاڑی پکڑ کر اس منحوس جنگل سے نکل جاؤں۔

بھری ہوئی ڈبل بیرل بندوق میں نے کندھے پر رکھی ہوئی تھی۔ میگزین والا تھیلا اس منحوس قلعے کی کوٹھڑی میں ہی بھاگتے وقت رہ گیا تھا۔ صرف ایک چاقو میری جیکٹ کی جیب میں تھا۔ چاقو میں نے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا کیونکہ درختوں کے درمیان اگی ہوئی جھاڑیاں اور درختوں سے لٹکتی بیلیں میرے راستے میں آ رہی تھیں۔ میں چاقو سے انہیں کاٹ کر گزرنے کے لئے راستہ بناتا جا رہا تھا۔ آخر یہ گنجان جنگل ختم ہو گیا اور میں نے اپنے سامنے ایک ٹیلے کو دیکھا جس کے دامن میں ایک سیاہ چٹان راستہ روکے کھڑی تھی۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ابھی تک دریا کا کنارہ کیوں نہیں آیا۔

یہ سوچ کر کہ شاید دریا ٹیلے کے عقب میں بہہ رہا ہو میں ٹیلے کی طرف بڑھا۔ چٹان کے قریب پہنچا ہی تھا کہ جنگل ایک بھیانک انسانی چیخ کی آواز سے گونج اٹھا۔

میں ڈر کر وہیں کھڑا ہو گیا اور بندوق سیدھی کر لی۔ چیخ کی آواز کے فوراً بعد چٹان کے پیچھے سے ایک سیاہ فام آدمی نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ اس کی سرخ آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ تلوار لہراتا میری طرف چلا آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اس پر فائر کر دیا۔ بندوق کا دھماکہ ہوا مگر میں یہ دیکھ کر لرز گیا کہ اس سیاہ فام آدمی پر بندوق کے فائر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ اب تلوار اٹھائے مجھے قتل کرنے دوڑتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ جب وہ مجھ سے پندرہ بیس فٹ دور رہ گیا تو میں نے اس کے دل کا نشانہ لے کر ڈبل بیرل گن کا دوسرا فائر کر دیا۔ اس گن میں دو کارتوس تھے کہ جس کے ایک فائر سے طاقتور سے طاقتور شیر بھی گر پڑتا تھا مگر اس سیاہ فام حبشی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا حالانکہ دونوں فائر میں نے قریب سے کئے تھے۔ سیاہ فام حبشی کسی دیو کی طرح اونچا لمبا تھا۔ اس نے مجھ پر جیسے ہی تلوار کا بھرپور وار کرنا



چاہا وہ ایسے لڑکھڑا کر پیچھے کو گرا جیسے کسی نے اسے آگے سے دھکا دے دیا ہو۔ یہ دھکا میں نے نہیں دیا تھا۔ مجھ پر تو موت سے پہلے کا سکتہ سا طاری ہو چکا تھا کیونکہ وہ دیو ہیکل سیاہ فام حبشی تلوار اوپر اٹھائے اتنی تیزی سے میرے قریب پہنچ گیا تھا کہ اگر اسے دھکا نہ لگتا تو اس نے چشم زدن میں میری گردن اڑا دینی تھی۔

اب میں اس بات پر حیران تھا کہ اس کو آگے سے دھکا کس نے دیا تھا۔ وہاں میرے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ سیاہ فام حبشی زمین پر پڑا تھا۔ اس کے سینے میں ایک لمبا خنجر اترا ہوا تھا اور خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔ میرے دیکھتے دیکھتے حبشی کی لاش سینے میں اترے ہوئے خنجر سمیت اسی طرح غائب ہو گئی جس طرح قلعے میں اس خوبصورت عورت کی لاش غائب ہو گئی تھی جسے میری آنکھوں کے سامنے تخت پر لٹا کر قتل کیا گیا تھا۔ یہ سارا بھٹکی ہوئی بدروحوں اور بھوتوں اور چڑیلوں کا کھیل تھا اور اس کا حقیقی اور پاکیزہ دنیا سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میرے ساتھ بھی ان بدروحوں کی مخلوق کا کوئی رشتہ نہ جڑتا اگر میں سیاہ آسیبی مرتبان نہ کھولتا۔ لیکن مجھے بدروحوں اور آسیب زدہ حویلیوں اور قلعوں کا سراغ لگانے کا شوق لے ڈوبا تھا۔ میں نے بدروحوں کی حقیقت معلوم کرنے اور ان کی پراسرار دنیا کا مشاہدہ کرنے کے شوق میں اس مرتبان کو کھول دیا تھا جس میں ایک بدروح قید تھی۔ یہ ساری مصیبت میری اپنی لائی ہوئی تھی۔ اسی لئے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ آدمی کو اپنی حد کے اندر رہ کر اللہ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتے ہوئے پاکیزہ اور سادہ زندگی بسر کرنی چاہئے۔ خواہ مخواہ ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارنے سے آدمی کو کچھ نہیں ملتا اور وہ نیکی اور سادگی کے راستے سے بھی بھٹک جاتا ہے۔

بہر حال اب میں پھنس گیا تھا اور اسی کوشش میں لگا تھا کہ کسی طرح ان بدروحوں کے چکر سے نجات حاصل کر لوں۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے اور میرے بس میں بھی نہیں ہے۔ میری حالت اس آدمی جیسی ہو

گئی تھی جو دلدل میں پھنس گیا ہو۔ ایک پاؤں دلدل سے باہر نکالتا ہو تو دوسرا پاؤں دلدل میں اور زیادہ دھنس جاتا ہو۔ میں نے اپنے دل میں خدا کو حاضر ناظر جان کر توبہ کرلی تھی کہ آئندہ کبھی کسی جن، بھوت، چڑیل یا کسی آسیب کی کھوج میں نہیں نکلوں گا۔ آئندہ کے لئے تو خدا نے ضرور مجھے معاف کر دیا تھا لیکن جو کام میں خراب کر چکا تھا اسے ٹھیک ہوتے ہوتے بھی وقت چاہئے تھا۔

حبشی کی خون آلود لاش غائب ہوتے ہی میں اس منحوس جگہ سے آگے چل دیا۔ میں جنگل کی دریا والی سرحد کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں جنگل سے باہر نکل آیا۔ سامنے دریا بہہ رہا تھا مگر وہاں نہ کوئی گھاٹ تھا نہ کشتی نظر آ رہی تھی۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا، میں اسے تیر کر پار کر سکتا تھا۔ میں دریا میں اترنے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ مجھے ایک طرف سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔ میں وہیں رک گیا۔ کشتی میں ایک ملاح بیٹھا اسے چلا رہا تھا۔ کشتی کا رخ اسی طرف تھا جدھر میں کھڑا تھا۔ کشتی میرے قریب آکر کنارے پر رک گئی۔ کشتی کا ملاح ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا تھا۔ کہنے لگا۔ ”بابو! دریا پار جانا ہے تو آجاؤ۔ میں تمہیں دیکھ کر ہی آیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں بھائی۔ مجھے پار لے چلو۔“

ملاح لڑکا بولا۔ ”دس روپے کرایہ ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”تم بے شک بیس روپے لے لینا۔“

لڑکے نے خوش ہو کر کہا۔ ”تو پھر بیٹھ جاؤ بابو۔“

میں کشتی میں سوار ہو گیا اور کشتی دریا کے بہاؤ کے رخ چلتی ہوئی آہستہ آہستہ دوسرے کنارے کی طرف بڑھنے لگی۔ میں نے لڑکے سے کہا۔ ”تمہارا نام کیا ہے؟“

ملاح لڑکے نے جواب دیا۔ ”میرا نام بھلوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بھلوا یہ بتاؤ دریا پار ادھر کون سا شہر ہے؟“

لڑکے نے چپو چلاتے ہوئے کہا۔ ”ادھر شہر تو کوئی نہیں ہے۔ ہمارا گاؤں منڈالا



ہے۔ تمہیں کہاں جانا ہے بابو؟“

میں نے کہا۔ ”بھائی مجھے جھانسی جانا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میں جھانسی کیسے پہنچ سکتا ہوں؟“

ملاح لڑکا بولا۔ ”بابو جھانسی تو یہاں سے بہت دور ہے۔ یہ دریا بھی اس طرف کو نہیں جاتا۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ تمہیں بیتال گڑھ کے گھاٹ تک پہنچا دیتا ہوں۔ وہاں سے تمہیں جھانسی جانے والی کوئی نہ کوئی گاڑی شاید مل جائے۔ بیتال گڑھ میں ایک ریلوے سٹیشن ہے۔“

مجھے امید کی کرن نظر آئی۔ میں نے پوچھا۔ ”بیتال گڑھ یہاں سے کتنی دور ہے بھلوا؟“

لڑکے نے کہا۔ ”دریا کے بہاؤ پر چلتے دو گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ مگر اس کے پچاس روپے لگیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”میں تمہیں ساٹھ روپے دوں گا مگر مجھے کسی طرح بیتال گڑھ پہنچا دو۔“

ملاح لڑکے نے کشتی کو کنارے کی طرف لے جانے کی بجائے اسے دریا کے بہاؤ پر ڈال دیا اور بولا۔ ”بھگوان بھلی کرے گا۔“

دھوپ خوب نکل آئی تھی۔ موسم دھوپ کی وجہ سے گرم ہو رہا تھا۔ میں نے خالی بندوق کشتی میں ایک طرف رکھ دی تھی۔ ملاح لڑکے نے بندوق کو دیکھا تو بولا۔ ”بابو تم شکاری ہو؟“

میں نے گہرا سانس بھر کر کہا۔ ”ہاں بھائی یہی سمجھ لو۔ شکاری ہوں۔“

لڑکے نے پوچھا۔ ”شیر مارتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”اگر شیر سامنے آجائے اور حملہ کر دے تو اسے مارنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ ویسے میں سانبھر اور ہرنوں وغیرہ کا شکار کرتا ہوں۔“

لڑکا کہنے لگا۔ ''بابو! جس جنگل سے تم آ رہے ہو وہاں تو بھوت پریت رہتے ہیں۔''

میں لڑکے سے زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس کے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور تھا۔ ایک طرح سے میں اس کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے بے دلی سے کہا۔ ''پتہ نہیں۔ رہتے ہوں گے۔''

لڑکا بولا۔ ''بابو! معلوم ہے اس جنگل میں ایک رانی بائی کا قلعہ ہے۔ اس قلعے میں رات کو ایک عورت کے گانے اور رونے کی آوازیں آتی ہیں۔''

میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''آتی ہوں گی۔''

لڑکے نے کہا۔ ''تم نے کوئی آواز ضرور سنی ہو گی۔''

''میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔'' میں نے جواب دیا اور اس کے بعد اپنی آنکھیں بند کر کے سر نیچے کر لیا جیسے سونا چاہتا ہوں۔

لڑکا بولا۔ ''بابو! سونا مت۔'' میں نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں اور لڑکے سے پوچھا۔ ''کیوں کیا بات ہے۔ کیا یہاں سونا منع ہے؟''

لڑکے نے کہا۔ ''منع نہیں ہے بابو جی۔ مگر گاؤں کے مندر کے پجاری جی کا کہنا ہے کہ دریا میں دن کے وقت سفر کرتے ہوئے اگر کوئی مسافر کشتی میں سو جائے تو دریا میں سے مگرمچھ نکل کر حملہ کر دیتا ہے۔''

یہ لڑکا بھی عجیب مصیبت تھا۔ میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی بیتال گڑھ کے گھاٹ تک پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں نے سونے کا خیال دل سے نکال دیا اور باتونی لڑکے کی باتیں سننے اور ان کے جواب دینے پر تیار ہو گیا۔

دو گھنٹے کے سفر کے بعد دریا کے دوسرے کنارے پر دور سے مجھے کسی بستی کے مکان نظر آنا شروع ہو گئے۔

ملاح لڑکے نے کہا۔ ''وہ دیکھو بابو! وہ بیتال گڑھ کے مکان ہیں۔''



میں نے لڑکے سے پوچھا۔ ''بیتال گڑھ کا ریلوے سٹیشن کس طرف ہے۔''

لڑکا کشتی کنارے کی طرف لا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''گاؤں سے تھوڑی دور آگے دریا کے کنارے پر ہی ہے۔''

میں نے لڑکے سے کہا کہ وہ مجھے کنارے پر اس جگہ لے جائے جہاں ریلوے سٹیشن ہے۔ اس کے جواب نے لڑکے نے کہا۔ ''نہیں بابو! میں اس طرف نہیں جا سکتا۔ میں گھاٹ پر بھی نہیں جاؤں گا۔ وہاں ٹھیکیدار مجھ سے کرائے کے آدھے پیسے لے لے گا۔ میں تمہیں اسی جگہ اتار دوں گا۔ تم خود ہی ریلوے سٹیشن پہنچ جانا۔''

میں نے کہا۔ ''چلو ٹھیک ہے بھائی تم مجھے اسی جگہ اتار دو۔ تمہارا شکریہ!''

لڑکا کشتی کو کنارے کے قریب لاتے ہوئے بولا۔ ''شکریہ کس بات کا بابو۔ تم نے مجھے ساٹھ روپے کرایہ دیا میں نے تمہیں بیتال گڑھ پہنچا دیا۔''

ملاح لڑکے نے کشتی کنارے پر ایک طرف کر کے کھڑی کر دی۔ میں بندوق کندھے سے لٹکا کر کشتی سے اتر گیا اور جیب سے پیسے نکالنے لگا کہ لڑکے کو ساٹھ روپے دوں۔ میری پشت کشتی کی طرف تھی۔ جیب سے روپے نکال کر میں نے کشتی کی طرف منہ کیا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہاں نہ کشتی تھی نہ ملاح لڑکا تھا۔ دریا کا کنارہ خالی پڑا تھا۔ دس دس روپے کے چھ نوٹ میرے ہاتھ میں تھے اور میں عالم حیرت میں ڈوبا دریا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دریا میں دور دور تک کسی کشتی کا نام و نشان تک نہ تھا۔

میں نے کرنسی نوٹ واپس جیب میں رکھے اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ کافی بڑا گاؤں تھا۔ کھیتوں میں کچھ کسان کام کر رہے تھے۔ ملاح لڑکے نے کہا تھا کہ ریلوے سٹیشن گاؤں کی دوسری جانب دریا کے قریب ہی ہے۔ میں گاؤں کا چکر کاٹ کر اس کی دوسری طرف نکل آیا۔ یہاں مجھے ذرا اونچائی پر ایک ریلوے سگنل دکھائی دیا۔ اس کی راہ نمائی میں، میں بیتال گڑھ کے سٹیشن پر پہنچ گیا۔ یہاں سے بٹاوا تک مجھے ایک پینجر

ٹرین مل گئی۔ بٹاوا چھوٹا سا جنکشن تھا وہاں سے ریلوے لائن جھانسی کو جاتی تھی۔ دو گھنٹے مجھے انتظار کرنا پڑا۔ میں نے سٹیشن پر ہی کچھ کھا پی لیا۔ جھانسی جانے والی گاڑی آئی تو میں اس میں بیٹھ گیا وہاں سے جھانسی کافی دور تھا۔ ریل گاڑی بھی ہر سٹیشن پر کھڑی ہوتی تھی۔ دن کے دو بجے اس نے مجھے جھانسی پہنچا دیا۔ یہاں سے مجھے ایک میل ٹرین مل گئی اس نے مجھے دوسرے دن بمبئی پہنچا دیا۔ سٹیشن سے آٹو رکشا لے کر میں سیدھا اپنے دوست جمشید کی آٹو سپیئر پارٹس کی دکان پر آ گیا۔

جمشید دکان پر ہی تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو کاؤنٹر چھوڑ کر میرے پاس آ کر بولا۔ ”یہ کیا؟ کوئی شکار مار کر نہیں لائے۔ مامندر کے جنگلوں میں تو سانبھر اور ہرن بہت ہوتے ہیں۔

میں نے رکشے سے اترتے ہوئے کہا۔ ”مجھے دیکھ کر ہرن، سانبھر بھاگ گئے تھے۔“

جمشید نے رکشے میں مزید جھانک کر دیکھا اور بولا۔ ”میگزین کا تھیلا کہاں چھوڑ آئے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”جنگل میں ایک جگہ سو گیا تھا کوئی اٹھا کر لے گیا۔“

جمشید بولا۔ ”چلو نہا دھو کر کپڑے بدلو۔ کھانا اکٹھے کھائیں گے۔“

جمشید کا مکان دکان کے اوپر ہی تھا۔ یہ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ جمشید وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ میں نے نہا دھو کر کپڑے بدلے۔ اس دوران سوچتا رہا کہ رانی بائی کے قلعے میں میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے بارے میں جمشید کو بتاؤں یا اس سے اس بات کو راز ہی رکھوں۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ یہ راز مجھے اپنے تک ہی رکھنا چاہئے اور جمشید کو کچھ نہیں بتانا چاہئے اس کو بتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں اسے بتا بھی دیتا تو اس نے مجھے برا بھلا ہی کہنا تھا کہ تم تو بمبئی کے قرب و جوار میں شکار کھیلنے گئے تھے جھانسی کی طرف کیسے نکل گئے اور رانی بائی کے آسیبی قلعے میں جانے کی



تمہیں کیا ضرورت تھی۔ ویسے بھی جمشید سیدھا سادھا شکاری ٹائپ کا دنیادار آدمی تھا اس قسم کی ماورائے عقل اور مافوق الفطرت باتوں کے بارے میں وہ مجھے کوئی مفید مشورہ نہیں دے سکتا تھا۔“

O

فیروز مجھے اپنی زندگی کی پراسرار اور دہشت خیز داستان سنا رہا تھا جسے میں آپ کے لئے لکھ رہا ہوں۔ میں وہی کچھ لکھ رہا ہوں جو مجھے فیروز نے سنایا تھا۔ میں اپنی طرف سے ایک لفظ بھی فالتو نہیں لکھ رہا۔

فیروز کہنے لگا۔ ''میں نے آپ کو ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ پاکستان بننے سے پہلے میں پنجاب کے کس شہر میں رہتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ اب وہ شہر جہاں میں رہتا تھا اب انڈیا میں ہے اس لئے اس کا نام بتا دیتا ہوں۔ اس شہر کا نام امرتسر تھا۔ میں امرتسر میں جی ٹی روڈ پر محصول چونگی کے قریب ایک آبادی مقبول پورے میں رہتا تھا۔ میری پیدائش بٹالے میں ہوئی تھی لیکن میرے ماں باپ میرے پیدا ہونے کے دو سال بعد امرتسہر آ کر آباد ہو گئے تھے۔ میں اپنے ماں باپ کی اکیلی اولاد تھا۔ نہ میرا کوئی بھائی تھا نہ بہن تھی۔ میں امرتسر کے سکول میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا کہ میرے ماں باپ کا انتقال ہو گیا۔ میرے باپ نے تھوڑی سی زمین اور ایک پھل دار باغ چھوڑا تھا۔ میرے چچا نے میری پرورش کی ذمہ داری اٹھائی اور یوں باغ اور زمین کی آمدنی پر قبضہ کر لیا۔ مجھے زمین اور باغ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شروع ہی سے میرا مزاج آوارہ گردی کی طرف مائل تھا اور میں جنگلوں میں گھوم پھر کر شکار کھیلنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک چھوٹی بندوق خریدی تھی جس میں چھرے کی بجائے شلگ پڑتے تھے۔ میں اپنی زمین اور باغ میں گھوم پھر کر پرندوں کا شکار کیا کرتا تھا۔ میں دسویں جماعت تک ہی پڑھ سکا اس کے بعد اپنے باپ



کی دکان سنبھال لی۔ دکان سے کافی آمدنی ہونے لگی۔ میں نے دو چار نوکر رکھ لئے اور انہیں دکان پر بٹھا کر شکار کھیلنے کبھی کسی طرف اور کبھی کسی طرف نکل جاتا تھا۔ اب میں کافی بڑا ہو گیا تھا۔ میرے چچا نے ایک جگہ میری شادی کر دی۔ میرے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ بیوی میری آوارہ گردیوں اور شکار کے شوق سے تنگ آ کر مجھ سے طلاق لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ میں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا میں زندگی آزادی سے گزارنا چاہتا تھا۔ جمشید میرا دوست بن گیا تھا اسے بھی شکار کا شوق تھا۔ اس کے باپ کی بمبئی شہر میں آٹو سپیئر پارٹس کی دکان تھی۔ جمشید کو اس کے باپ نے بمبئی بلا لیا۔ جمشید نے باپ کا کاروبار سنبھال لیا۔ جب اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تو جمشید بمبئی کا ہی ہو کر رہ گیا۔ میں کبھی کبھی اس سے ملنے بمبئی چلا جاتا تھا۔ اسی طرح وقت گزرتا چلا گیا۔ 946. . کا سال آ گیا۔ ملک کے مسلمانوں نے قائداعظم کی قیادت میں پاکستان کے مطالبے کا اعلان کر دیا تھا اور تحریک پاکستان بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ اسی سن 1946ء کے آخری ایام تھے جب میں امرتسر سے جمشید کے پاس بمبئی آیا ہوا تھا اور میں نے رانی بائی کے قلعے کے بارے میں دہشت انگیز اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیاں سنی تھیں اور ایک روز ان خوفناک روایتوں کا کھوج لگانے رانی بائی کے قلعے کی جانب روانہ ہو گیا تھا اور میرے ساتھ وہ ماورائے عقل اور حیرت انگیز واقعات پیش آئے تھے جو میں پوری تفصیل کے ساتھ آپ کو بتا چکا ہوں۔ اب میں کہانی کو آگے بیان کرتا ہوں.....''

فیروز ایک لمحے کے توقف کے بعد کہنے لگا۔

''میں نے اور جمشید نے اکٹھے بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا۔ جمشید مجھ سے شکار کے بارے میں باتیں پوچھنے لگا۔ کہاں کہاں پھرے، راتیں جنگل میں کہاں گزاریں، کوئی شکار کیوں نہیں ملا؟ ان سب باتوں کا میں نے اسے ایک ہی جواب دیا کہ اس بار شکار میں میرا جی نہیں لگا تھا اور میں زیادہ تر جنگلوں میں گھومتا پھرتا رہا تھا۔ جمشید نے میری

طرف گھور کر دیکھا اور کہنے لگا۔ ''تم مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے فیروز؟''

آخر وہ میرا دوست تھا اور میری طبیعت اور میری نفسیات سے واقف تھا۔ اس نے میرے چہرے کی خاموشی سے اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے ساتھ جنگل میں کوئی پراسرار واقعہ ضرور ہوا ہے۔ میں نے کہا۔ ''تم سے مجھے کچھ چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر کوئی خاص بات ہوئی ہوتی تو میں سب سے پہلے تمہیں بتاتا۔''

پھر میں نے جان بوجھ کر گفتگو کا موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''ملک کے سیاسی حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اعلان کر دیا ہے کہ ہم پاکستان نہیں بننے دیں گے۔''

جمشید بولا۔ ''ماسٹر جی سکھوں کے صحیح لیڈر نہیں ہیں۔ کانگریس نے انہیں ورغلایا ہوا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ پنجاب میں فسادات شروع ہو جائیں گے۔''

میں بھی ایسے ہی سوچ رہا تھا۔ میں نے جمشید سے کہا۔ ''تم بمبئی میں ہو۔ بمبئی ایک کاسموپولیٹن شہر ہے شاید یہاں کچھ نہ ہو لیکن پنجاب میں بہت خون خرابہ ہو گا۔ میں سوچتا ہوں میں امرتسر اپنے گھر چلا جاؤں.....''

جمشید کہنے لگا۔ ''وہاں تمہارا کون ہے۔ ایک دکان ہے، ایک چھوٹا سا باغ ہے اور تھوڑی سی زمین ہے جس پر تمہارے چچا نے قبضہ کر رکھا ہے۔ نہ تمہارے وہاں ماں باپ ہیں، نہ بہن بھائی ہیں اور نہ بیوی بچے ہیں۔ وہاں جا کر کیا کرو گے؟ میں تو کہتا ہوں کہ بمبئی میں میرے پاس ہی رہ جاؤ۔ پاکستان بن گیا تو یہیں سے پاکستان چلے جانا۔''

میں نے کہا۔ ''کہتے تو تم ٹھیک ہو۔ امرتسر میں میرا کچھ نہیں ہے لیکن میرے ماں باپ کی قبریں ہیں۔ میں پاکستان جانے سے پہلے ان کی قبروں پر فاتحہ ضرور پڑھنا چاہتا ہوں۔''

جمشید بولا۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''



میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی میں بمبئی میں ہی رہوں گا۔ تمہارے پاس.....''

کچھ دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔ پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آج میرا دل کوئی فلم دیکھنے کو چاہتا ہے۔ میٹرو سینما میں شیر کے شکار کی ایک انگریزی فلم لگی ہوئی ہے۔ 9 بجے والا شو ابھی شروع نہیں ہوا ہو گا۔ تم بھی میرے ساتھ چلو اکٹھے فلم دیکھیں گے۔''

جمشید کہنے لگا۔ ''آج سارا دن گیراج میں کام کرتا رہا ہوں۔ تھک گیا ہوں۔ تم چلے جاؤ۔''

رانی بائی کے قلعے میں اور اس کے بعد جنگل میں میرے ساتھ جو دہشت ناک واقعات گزرے تھے انہوں نے میرے ذہن کو کافی پریشان کیا تھا۔ میرا دل تفریح کرنے کو چاہتا تھا اور وہاں فلم ہی میرے لئے ایک تفریح کا ذریعہ تھی۔ چنانچہ میں جمشید کو اس کے فلیٹ میں ہی چھوڑ کر فلم دیکھنے چل پڑا۔ دو منزلہ بس میں بیٹھ کر میٹرو سینما پہنچ گیا۔ اگر آپ کبھی بمبئی گئے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ میٹرو سینما بمبئی کے گیٹ وے آف انڈیا کے قریب ہی واقع ہے اور وہاں انگریزی فلمیں لگا کرتی تھیں۔''

چھ بجے والا شو ختم ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ میں سینما کے پاس ہی ایک ایرانی ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ گیا۔ اس زمانے میں بمبئی سے گجراتی، ہندی اور انگریزی کے علاوہ اردو کے بھی دو تین اخبار شائع ہوتے تھے جن میں روزنامہ ''خلافت'' بمبئی کے مسلمانوں میں بڑا مقبول تھا۔ ہوٹل میں ''خلافت'' کا ایک پرچہ پڑا تھا۔ میں چائے پیتے ہوئے اسے پڑھنے لگا۔ اس میں بھی یہی لکھا تھا کہ پاکستان برصغیر کے مسلمانوں کی سنہری منزل ہے اور قائداعظم کی بے لوث قیادت میں مسلمان اپنی منزل کو حاصل کر کے رہیں گے۔

مجھے سیاست سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں بھی چاہتا تھا کہ مسلمانوں کا ایک الگ اسلامی ملک قائم ہونا چاہئے جہاں

وہ دین اسلام کی روشنی میں اپنی زندگی بسر کر سکیں۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ فلم کا آخری شو شروع ہونے میں آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا۔ میں اٹھ کر میٹرو سینما آ گیا۔ وہاں آخری شو کے لئے ٹکٹ والی کھڑکی کھل چکی تھی۔ میں نے سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لیا اور سینما ہال میں آ کر بیٹھ گیا۔ ہال میں ہلکی ہلکی انگریزی موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ لوگ آہستہ آہستہ ہال میں آ رہے تھے۔ میں اپنی سیٹ پر خاموش بیٹھا ان عجیب و غریب اور ناقابل یقین واقعات پر غور کر رہا تھا جو میرے ساتھ گزر چکے تھے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس قسم کے واقعات حقیقی زندگی میں بھی پیش آ سکتے ہیں۔ ایسی باتیں تو خواب میں ہوا کرتی ہیں اور وہ بھی ڈراؤنے خواب میں..... میری آنکھوں کے سامنے بار بار قلعہ رانی بائی کے بڑے کمرے کا وہ منظر آ جاتا تھا جب میری آنکھوں کے سامنے ایک خوبصورت نازک اندام عورت کو جس نے مہارانیوں والا ہیروں کا تاج پہن رکھا تھا ایک تخت پر لٹا کر قتل کر دیا گیا ہو اور پھر اس کی لاش غائب ہو کر دھواں بن گئی ہو اور اس دھوئیں نے عورت کے جسم کی شکل اختیار کر لی ہو اور زرد پوش آدمی نے اسے ایک مرتبان میں بند کر دیا ہو۔

پھر مجھے وہ خوفناک منظر یاد آ جاتا جب میں نے چبوترے کے شگاف میں سے مرتبان نکال کر اس کا ڈھکن کھول دیا تھا اور اس میں سے حسین و جمیل عورت کی روح یا بدروح ایک چیخ کے ساتھ آزاد ہو گئی تھی اور اس کی چیخ سے سارا جنگل لرز گیا تھا۔

پھر مجھے خیال آتا کہ کس طرح وہ بدروح زندہ عورت کی شکل میں میرے سامنے ظاہر ہو گئی تھی اور مجھے میرے دشمنوں سے بچا کر ہوا میں اڑاتی ہوئی دریا پار ایک پرانے کھنڈر میں لے گئی تھی اور اس نے میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”تم نے مجھے رگھو کی قید سے آزاد کر کے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اب تمہاری زندگی کی حفاظت میرا فرض بن چکا ہے۔“

اور پھر جب میں نے اسے کہا تھا کہ مجھے تمہاری حفاظت کی ضرورت نہیں ہے



اور مجھ پر مہربانی کرو اور میرا پیچھا چھوڑ دو میں مسلمان ہوں اور میری زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔ تو اس حسین اور پراسرار عورت نے جو اپنے مقتول جسم کی بدروح تھی کہا تھا۔ ”میں بھی اسلام قبول کر چکی ہوں۔ میں بھی مسلمان ہوں لیکن اللہ پاک کا حکم ہے کہ انسان کو جان بوجھ کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہیں ڈالنا چاہیئے۔“

مگر میں اس بدروح کے پاس ایک منٹ کے لئے بھی ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے میرا بازو پکڑا تو میں اسے چھڑا کر جنگل میں دریا کی طرف چل دیا۔ پھر مجھے وہ حبشی یاد آ گیا جس نے جنگل میں مجھ پر تلوار سے حملہ کیا تھا لیکن عین وقت پر کسی غیبی روح نے اس سیاہ فام حبشی کو ہلاک کر دیا تھا اور میں وہاں سے ڈر کر دریا کی طرف بھاگنے لگا تھا۔ پھر مجھے وہ ملاح لڑکا یاد آ گیا جس نے مجھے کشتی میں بٹھا کر بیتال گڑھ پہنچایا تھا اور جب میں اسے کرائے کے لئے پیسے دینے کے لئے اس کی طرف مڑا تھا تو ملاح لڑکا کشتی سمیت غائب ہو چکا تھا۔ یہ سارے واقعات ایک فلم کی طرح میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

میرے کان میں اس حسین و جمیل عورت کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی جب اس نے مجھے خبردار کیا تھا کہ میری زندگی خطرے میں ہے اور اب اس کا فرض بن گیا ہے کہ وہ میری جان کی حفاظت کرے۔

یہ ساری باتیں میری عقل اور فہم سے باہر تھیں لیکن جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اس پر مجھے یقین کرنا ہی پڑ رہا تھا۔ میں انہی پریشان خیالات کے ساتھ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک سینما ہال کی روشنیاں بجھ گئیں اور پردہ سیمیں پر سے ریشمی پردہ آہستہ آہستہ اوپر کو اٹھنے لگا۔

پھر فلم شروع ہو گئی۔ جنگل کا سین تھا۔ ایک شکاری شیر کی تلاش میں جنگل میں چلا جا رہا تھا۔ میرا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ صرف آنکھیں پردہ سیمیں پر تھیں۔

اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی آدمی سیٹوں کے درمیان جھک کر چلتا چلا آرہا ہے۔ وہ ایک لمحے کے لئے سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھتا ہے اور پھر آگے چل پڑتا ہے۔ اس کا رخ میری طرف تھا۔ جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے ہال کی ہلکی ہلکی روشنی میں اسے پہچان لیا۔ وہ میرا دوست جمشید تھا۔ جمشید نے بھی مجھے پہچان لیا اور میرے کان کے قریب منہ لے جا کر بولا۔ ''فیروز ایک ایمرجنسی ہو گئی ہے۔ ذرا باہر آؤ۔''

میں جلدی سے اٹھا اور جمشید کے ساتھ سینما ہال سے باہر آگیا۔ جمشید کچھ پریشان بھی تھا اور جلدی میں بھی تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''بات کیا ہے جمشید؟ میں نے تمہیں اتنا پریشان کبھی نہیں دیکھا۔''

جمشید جلدی جلدی چل رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں فیروز۔ بس مجھے تمہاری تھوڑی سی مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔''

میں نے کچھ نہ کہا اور میں بھی اس کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ یا اللہ خیریت ہی ہو۔ اس شخص کو اچانک میری کیا ضرورت پڑ گئی ہے کہ مجھے سینما ہال سے لینے آگیا ہے۔ سینما ہاؤس کے باہر اس کی پرانی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ گاڑی میں آیا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھایا اور گاڑی سٹارٹ کر کے سینما ہاؤس کے احاطے سے نکل کر بمبئی کی ایک سڑک پر روانہ ہو گیا۔

میں نے ایک بار پھر اس سے پوچھا۔ ''بھائی کچھ بتاؤ تو سہی۔ ہوا کیا ہے؟ تمہیں میری مدد کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟''

سڑک کشادہ تھی۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا۔ جمشید گاڑی کافی تیز چلا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ''بات یہ ہے کہ دوبئی کی ایک پارٹی اچانک آگئی ہے۔ اس سے 80 ہزار روپے کا سودا طے پا گیا ہے۔ رقم میں نے وصول کر لی ہے۔ اب پارٹی کو مال لا کر دینا ہے۔ میں نے مال ایک خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس خفیہ جگہ سے مال باہر نکالنے کے



لئے ایک اعتباری آدمی کی ضرورت ہے۔ پہلے اس کام کے لئے میرا ملازم عبدل میرے ساتھ جاتا تھا۔ وہ کم بخت آج ہی اپنی بیمار ماں کی خبر گیری کرنے ناسک چلا گیا ہے۔ کسی دوسرے آدمی کو میں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ اچانک مجھے تمہارا خیال آگیا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

جمشید نے پہلے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا کہ وہ اس قسم کے مال کا کاروبار بھی کرتا ہے جس کو اسے کسی خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھنا پڑتا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ منشیات وغیرہ کا معاملہ ہے۔ گاڑی بمبئی سے باہر ایک کھلی سڑک پر پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ میں نے جمشید سے انجان بن کر پوچھا۔ ''یہ کس قسم کا مال ہے جس کو تم خفیہ جگہ پر چھپا کر رکھتے ہو؟''

جمشید نے گاڑی کو ایک اور نسبتاً ویران سڑک پر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''یار اب تم مجھے ذلیل کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں بتا دوں گا تمہیں کہ مال کیا ہے۔ پارٹی بڑی سالڈ ہے اور اسے اچانک مال کی ضرورت پڑ گئی ہے۔''

80 ہزار روپے کی رقم سن 1946ء میں بہت بڑی رقم تھی۔ مجھے دل میں افسوس ضرور ہوا کہ میرا دوست یہ کس مذموم دھندے میں پڑ چکا ہے۔ میں اس کا جگری دوست ہوں اور اس نے مجھ سے بھی یہ بات پوشیدہ رکھی۔ میں خاموش ہو گیا اور کوئی بات نہ کی۔ مجھے خاموش دیکھ کر شاید جمشید کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ گاڑی اس وقت شہر کی مضافاتی آبادیوں کو چھوڑ کر ایک ویران علاقے میں داخل ہو چکی تھی جہاں اِدھر اُدھر جھاڑیاں اور تاڑ کے درخت رات کی تاریکی میں آسمان کی طرف اٹھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

جمشید کہنے لگا۔ ''تم دل میں ضرور مجھے برا بھلا کہہ رہے ہو گے کہ میں نے آج تک تم سے یہ بات کیوں چھپائے رکھی..... یہ میری مجبوری تھی۔ میں تمہیں اتنا ہی کہوں گا کہ ایک آدمی کی وجہ سے میں اس کام میں پھنس گیا کہ کوشش کے باوجود اس

دلدل سے نجات حاصل نہیں کر سکا لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں اس کام سے توبہ کرلوں گا چاہے اس کے لئے مجھے کتنی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے......"

گاڑی ویران علاقے کے کچے راستے پر اچھلتی ہوئی چلی جارہی تھی۔ تین چار موڑ گھومنے کے بعد جمشید نے ایک جگہ گاڑی روک لی۔ گاڑی کی بتیاں روشن تھیں ان کی روشنی سامنے ایک گودام نما عمارت پر پڑرہی تھی۔ جمشید نے بتیاں گل کر دیں اور گاڑی سے اترتے ہوئے بولا۔ "مال اس شیڈ کے اندر ہے۔"

یہ ایک ویران سا شیڈ تھا اس کا دروازہ اکھڑ کر ایک طرف گرا پڑا تھا۔ جمشید نے جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کرلی تھی۔ جگہ جگہ اینٹوں اور پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے۔ ایک جگہ لوہے کی زنگ خوردہ گول پہیے والی کوئی ٹوٹی پھوٹی مشین پڑی تھی۔ اس کی دوسری جانب فرش پر پتھر کی ایک سیاہ سل رکھی ہوئی تھی۔ جمشید نے ٹارچ روشن کر کے ایک طرف اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی پتھر کی بھاری سل پر پڑ رہی تھی۔ پھر وہ لوہے کی زنگ خوردہ مشین کے پاس گیا اور اس کے نیچے سے رسی کا ایک بڑا سا گچھا اٹھا کر لے آیا۔ رسی کا گچھا اس نے پتھر کی سل کے پاس ہی رکھ دیا اور بولا۔

"فیروز! میرے ساتھ لگ کے اس سل کو ایک طرف ہٹادو۔"

پتھر کی سل کافی وزنی تھی۔ ہم دونوں نے مل کر اسے بڑی مشکل سے ایک طرف کو سرکایا۔ جمشید نے ٹارچ اٹھا کر اس گول سوراخ کے اندر روشنی ڈالی جو پتھر کی سل کے نیچے نمودار ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ "مال نیچے اینٹوں کے ڈھیر کے نیچے ٹین کے ایک چوکور ڈبے میں پڑا ہے۔ تم صرف اتنا کرو کہ نیچے اتر کر ڈبہ اوپر لے آؤ میں نیچے رسی لٹکاتا ہوں رسی کو میں اوپر سے پکڑے رکھوں گا۔"

اس نے رسی کا گچھا کھولا تو وہ رسی کی ایک سیڑھی تھی۔ اس نے رسی کی سیڑھی نیچے تہہ خانے میں لٹکادی اور اس کا دوسرا سرا اپنے جسم کے گرد لپیٹ لیا۔ میں نے



نیچے جھانک کر دیکھا۔ نیچے کوئی پندرہ فٹ کی گہرائی میں اینٹوں کی ایک ڈھیری نظر آ رہی تھی۔ جمشید بولا۔ "فکر نہ کرنا۔ میں نے رسی کو اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا ہے۔ عبدل بھی اسی طرح نیچے اترا کرتا تھا۔"

جمشید کا بدن بھاری تھا اور اس معاملے میں وہ مجھ سے دوگنی طاقت والا تھا۔ اس نے رسے کا سرا بالکل ایسے جسم کے گرد لپیٹ رکھا تھا جس طرح رسہ کشی کے کھیل میں سب سے آخری آدمی نے رسہ جسم کے گرد لپیٹا ہوتا ہے۔ اس نے رسا اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اپنا ایک پاؤں آگے کو جمالیا تھا۔

وہ ایک ہاتھ سے نیچے تہہ خانے میں ٹارچ کی روشنی ڈالے ہوئے تھا۔ میں نے رسی کو پکڑا اور اس کے چھوٹے چھوٹے زینوں پر پاؤں رکھتا نیچے اترنے لگا۔ تہہ خانے کی فضا میں عجیب قسم کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر سے جمشید کہہ رہا تھا۔ "اینٹوں کے ڈھیر کی دائیں جانب دو چار اینٹوں کے نیچے ٹین کا چوکور ڈبہ پڑا ہوگا۔ بس اسے اٹھا کر واپس اوپر چڑھ آنا میں ٹارچ کی روشنی ڈال رہا ہوں....."

جمشید میرا ایسا جگری یار تھا کہ اس کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتا تھا۔ یہ تو محض ایک پندرہ فٹ گہرے ایک اندھیرے تہہ خانے میں اترنے کی بات تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میرے پاؤں نیچے اینٹوں کے ڈھیر سے ٹکرائے۔ اوپر سے ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے رسی کی سیڑھی کو چھوڑ دیا اور اینٹوں کے ڈھیر کی دوسری طرف آگیا۔ اوپر سے جمشید کی آواز آئی۔ "بس اسی جگہ الگ سے چار اینٹیں پڑی ہیں۔ ٹین کا ڈبہ ان اینٹوں کے درمیان رکھا ہوا ہے۔"

میں نے جھک کر دیکھا۔ وہاں کچھ اینٹیں ضرور پڑی تھیں۔ میں نے انہیں دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر ایک طرف پھینکا ان کے نیچے سوائے مزید اینٹوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے جمشید کو آواز دے کر کہا۔ "یہاں کوئی ڈبہ نہیں ہے۔"

اوپر سے جمشید کی آواز آئی۔ "دوسری طرف دیکھو۔ شاید وہاں پڑا ہوگا۔"

میں اینٹوں کے ڈھیر کی دوسری جانب آ گیا وہاں بھی دس بارہ اینٹوں کو ہٹا کر دیکھا۔ وہاں بھی نیچے سوائے اینٹوں اور پتھروں کے اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ جمشید کو آواز دی اور کہا۔ ''یہاں بھی کچھ نہیں ہے۔''

اوپر سے جمشید کی آواز آئی۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے خود ڈبہ مال سے بھر کر یہاں رکھا تھا۔ ذرا اچھی طرح سے دیکھو۔''

جمشید نے اوپر سے ٹارچ کی روشنی ڈال رکھی تھی۔ میں نے اس کی روشنی میں اینٹوں کے ڈھیر کو چاروں طرف سے اینٹوں کو ہٹا ہٹا کر دیکھا مگر وہاں مجھے کوئی ڈبہ نہ ملا۔ میں نے کہا۔ ''جمشید! یاد کرو۔ تم نے ڈبہ کسی دوسری جگہ تو نہیں چھپایا تھا؟''

اوپر سے جمشید نے کہا۔ ''ایسا کرو کونے میں جا کر دیکھو۔ کہیں میں نے غلطی سے کونے میں نہ رکھ دیا ہو۔''

اس نے ٹارچ کی روشنی کونے میں پھینکی۔ کونے میں بھی اینٹ، پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ میں کونے میں جا کر جھک کر دیکھنے لگا۔ اچانک ٹارچ کی روشنی بجھ گئی۔ بالکل ایسے جیسے گھروں میں کبھی کبھی اچانک بتی چلی جاتی ہے۔ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''ٹارچ کیوں بجھا دی؟ ٹارچ روشن کرو۔ مجھے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا۔''

جمشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے کنوئیں نما تہہ خانے کے منہ پر پتھر کی بھاری سل رکھنے کی آواز سنائی دی۔ میں دوڑ کر اس جگہ آ گیا جہاں چھت کا سوراخ تھا۔ سوراخ پتھر کی سل سے بند ہو چکا تھا۔ میں نے چلا کر کہا۔ ''جمشید! یہ مذاق مجھے بالکل پسند نہیں۔ سل کو ہٹاؤ اور ٹارچ کی روشنی ڈالو۔ مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

میں اسے مذاق سمجھ رہا تھا۔ مگر بہت جلد مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہو گیا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔ اوپر سے جمشید نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے اسے دو تین بار آوازیں دیں مگر جمشید تو جیسے تہہ خانے کے منہ پر پتھر کی بھاری سل رکھ کر جا چکا تھا۔ میں نے



دونوں ہاتھ فضا میں اِدھر اُدھر ہلائے کہ اگر رسی لٹک رہی ہو تو اس کے سہارے اوپر چڑھ کر پتھر کی سل کو ہٹانے کی کوشش کروں۔ مگر وہاں کوئی رسی لٹکی ہوئی نہیں تھی۔ تہہ خانے کا منہ بند کرنے سے پہلے جمشید نے رسی کو اوپر کھینچ لیا تھا۔

یقین کریں میں سناٹے میں آ گیا۔

میں کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ جمشید بھی ایسی حرکت کر سکتا ہے کہ مجھے تہہ خانے میں بند کر کے چلا جائے۔ میں تہہ خانے کے گھپ اندھیرے میں حیران پریشان بالکل ساکت کھڑا اوپر دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر جمشید کو آوازیں دینی شروع کر دیں۔ ''جمشید! بس کافی مذاق ہو چکا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکالو۔''

لیکن اوپر کوئی ہوتا تو مجھے جواب دیتا۔ اوپر تو موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تب مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ جمشید مجھے تہہ خانے میں چھوڑ کر جا چکا ہے۔ مگر اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کیا وہ پاگل ہو گیا ہے؟ ضرور وہ پاگل ہو چکا ہے اس کے دماغ کا کوئی پرزہ ڈھیلا ہو گیا ہے ورنہ وہ ایسا کبھی کر ہی نہیں سکتا تھا کہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر اس ویران جگہ پر لائے اور تہہ خانے میں بند کر کے چلا جائے۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ جمشید نے اپنے ہوش و حواس میں ایسا نہیں کیا تو میں نے وہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ پہلے تو مجھے اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اندھیرے میں اینٹ، پتھروں کے ڈھیروں کے خاکے ابھرنے لگے۔ میں اس بات کی تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی جمشید نے یہاں منشیات کا کوئی ڈبہ چھپایا ہوا تھا یا نہیں۔ میں نے اندھیرے میں ہی کونے میں اینٹوں کو اِدھر اُدھر ہٹا کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا اسی طرح میں نے چاروں کونوں کی چھان بین کی۔ کسی جگہ بھی مجھے وہ ٹین کا ڈبہ نہ ملا جس کو حاصل کرنے کی خاطر جمشید مجھے وہاں لایا تھا۔ تو کیا یہ سب اس کی سازش تھی؟ مگر اسے یہ جال بچھانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں تو اس کا جگری دوست تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟

میں پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ جمشید کی عقل ٹھکانے نہیں رہی۔ میں نے اِدھر اُدھر سے اینٹیں لا کر جہاں چھت کا منہ تھا اور جو پتھر کی سل سے بند تھا اس کے بالکل نیچے جو اینٹوں کی چھوٹی سی ڈھیری تھی وہاں اینٹوں کو جوڑنا شروع کر دیا تاکہ جب ڈھیری ذرا اونچی ہو جائے تو میں اس پر کھڑے ہو کر پتھر کی سل کو ہٹانے کی کوشش کروں۔ اندھیرے میں کسی وقت نظر آتا تھا اور کسی وقت کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور اینٹیں جوڑتا رہا۔ ڈھیری ڈھائی تین فٹ اونچی ہو گئی۔ پھر میں سنبھل سنبھل کر بڑی احتیاط کے ساتھ ڈھیری کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے دونوں ہاتھ اوپر بلند کئے۔ میرے ہاتھوں کی انگلیاں چھت کے دہانے پر رکھی ہوئی پتھر کی سل کو چھونے لگی تھیں۔

لیکن میں زور لگا کر سل کو کسی طرف کھسکا نہیں سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے سل کو ایک طرف کھسکانے کے لئے ذرا سا زور لگایا تو اینٹیں میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گئیں اور میں دھڑام سے اینٹوں کے ساتھ ہی ایک طرف گر پڑا۔ میرے ایک گھٹنے میں چوچل جم ئی تھی اور وہ درد کرنے لگا تھا۔ مگر اس وقت میں نے درد کی پرواہ کئے بغیر دوبارہ اینٹوں کی ڈھیری بنانی شروع کر دی۔ مجھے کافی وقت لگ گیا۔ جب دوبارہ اینٹوں کی ڈھیری دو ڈھائی فٹ اونچی ہو گئی تو میں پہلے سے زیادہ احتیاط کے ساتھ اس کے اوپر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ اٹھنا شروع کیا۔ جیسے ہی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا اینٹیں اپنی جگہ سے ہلیں اور مجھے ساتھ لے کر ساری اینٹیں نیچے گر پڑیں۔

میں سخت مایوسی کے عالم میں وہیں سر جھکا کر بیٹھ گیا اور خدا سے دعا مانگنے لگا کہ وہ مجھے اس مصیبت سے نکالے لیکن مقدر میں جو لکھا تھا اسے تو ہونا ہی تھا۔ ایک تو مجھ پر ایک ناگہانی مصیبت نازل ہو گئی تھی دوسرے مجھے یہ صدمہ بھی تھا کہ جمشید جو میرا اتنا عزیز دوست تھا اس نے میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کیا۔ کیا واقعی وہ پاگل ہو گیا تھا؟



تہہ خانے میں اُترتے وقت مجھے فضا میں جو ناگوار بو محسوس ہوئی تھی وہ اب مجھے محسوس نہیں ہو رہی تھی لیکن اندر بند ہونے کی وجہ سے مجھے سانس لیتے وقت گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے اٹھ کر ایک بار پھر باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہاں جتنے اینٹ پتھر بکھرے ہوئے تھے میں نے وہ سارے اٹھا کر چھت کی سل کے نیچے ڈھیری پر جمع کر دیئے۔ اس کے باوجود ڈھیری دو ڈھائی فٹ سے زیادہ اونچی نہ ہوئی اور صرف میری انگلیاں ہی پتھر کی سل کو چھو رہی تھیں۔ صرف انگلیوں سے میں اتنی بھاری سل کو تہہ خانے کے منہ کے اوپر سے پرے نہیں ہٹا سکتا تھا۔

اس خیال سے کہ شاید وہاں سے اوپر جانے کا کوئی خفیہ راستہ بھی ہو۔ میں اندھیرے میں دیواروں کو ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اچانک میرا ہاتھ ایک انسانی کھوپڑی سے ٹکرایا جو دیوار میں سے آدھی باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ میں ڈر کر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور آنکھیں سکیڑ کر تاریکی میں کھوپڑی کو تکنے لگا۔ عجیب بات ہے کہ کھوپڑی ایک دو سیکنڈ کے بعد مجھے بالکل صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس انسانی کھوپڑی کا منہ کھلا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو تاریک گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ اس دیوار میں یہ کھوپڑی کہاں سے آ گئی ہے۔ کیا کسی نے کسی انسان کو قتل کرنے کے بعد اس کی لاش دیوار میں چن دی تھی؟ لیکن ایسی صورت میں دیوار میں انسانی پنجر بھی ہونا چاہئے تھا جبکہ دیوار میں صرف کھوپڑی ہی نظر آ رہی تھی۔

میرے ذہن میں طرح طرح کے توہمات پیدا ہونے لگے تھے۔ کہیں اس تہہ خانے میں بھی تو کسی بدروح کا بسیرا نہیں ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جبکہ تہہ خانے میں باقی ہر جگہ گہری تاریکی تھی تو پھر اس کھوپڑی پر روشنی کہاں سے پڑ رہی تھی۔ اس سے پہلے وہاں روشنی کا نشان تک نہیں تھا۔ میرے ہاتھ لگانے کے بعد کھوپڑی پر دھیمی دھیمی روشنی سی آ گئی تھی۔ میں خوف زدہ نظروں سے دیوار میں سے ابھری ہوئی کھوپڑی کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک مجھے پھنکار کی آواز سنائی دی۔ یہ کسی سانپ

کی پھنکار تھی اور بڑی غصیلی اور غضب ناک آواز تھی۔ میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میری خوف زدہ نظریں کھوپڑی پر جمی ہوئی تھیں کیونکہ مجھے پھنکار کی آواز اس کھوپڑی میں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ ہی میں نے ایک منظر دیکھا جسے دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ کھوپڑی کے منہ میں سے ایک کالا سانپ نکلا اور اس نے اپنا پھن کھول کر کھوپڑی کی پیشانی پر ڈسنا شروع کر دیا۔ کھوپڑی کے حلق میں سے کراہنے کی بڑی دردناک آوازیں نکلنے لگیں۔ اب میں واقعی بہت خوف زدہ ہو گیا تھا اور خوف کے مارے میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میرے پاؤں ایک ایک من بھاری ہو گئے تھے۔ میں نے دوڑ کر سامنے والی دیوار کے پاس جانے کی کوشش کی لیکن میرے پاؤں نے ہلنے سے انکار کر دیا جیسے زمین نے میرے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ سانپ اب دیوار سے آدھی باہر نکلی ہوئی انسانی کھوپڑی کے اوپر کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ اس کا پھن پھیلا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں پر سرخ خون لگا ہوا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد پھنکار رہا تھا۔ پھر اچانک سانپ نے میرے اوپر چھلانگ لگا دی۔

میرے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔

دوسرے لمحے میں نے دیکھا کہ جیسے ہی سانپ میرے چہرے سے ٹکرایا کسی نے جیسے اسے دُم سے پکڑ کر زور سے دیوار کے ساتھ پٹخ دیا۔ سانپ کے دیوار کے ساتھ ٹکراتے ہی ایک بھیانک انسانی چیخ بلند ہوئی اور سانپ بھی غائب ہو گیا اور دیوار میں سے ابھری ہوئی کھوپڑی بھی غائب ہو گئی۔ میں نے دل میں کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا تھا کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سب بدروحوں کا کھیل ہے جو مجھ پر حملہ کر رہی ہیں اور قدرت مجھے ان سے محفوظ رکھ رہی ہے۔ تہہ خانے کی گھٹن بہت بڑھ گئی تھی اور اب میرے لئے سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ میں ایسے جلدی جلدی سانس لے رہا تھا جیسے آدمی نزع کے عالم میں ہو۔ مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ تہہ خانے کی فضا میں سے



آکسیجن غائب ہونا شروع ہو گئی ہے۔

میرے اندازے کے مطابق اتنی جلدی تہہ خانے سے آکسیجن کم نہیں ہونی چاہئے تھی۔ ایسے لگ رہا تھا کہ کوئی غیبی طاقت فضا کی آکسیجن کو جذب کر رہی ہے۔ میرا سانس اکھڑنا شروع ہو گیا مجھے اپنے کانوں میں گھنٹیوں اور چیخوں کی آوازیں آنے لیں۔ آنکھوں کے آگے ڈراؤنی شکلیں گردش کرنے لگیں۔ پھر مجھ پر نیم بے ہوشی طاری ہو گئی اور میں کھڑے کھڑے وہیں اینٹوں کے ڈھیر پر گر پڑا۔ میں کچھ ہوش میں تھا۔ کچھ ہوش میں نہیں تھا۔ میری آنکھیں نیم وا تھیں۔ یعنی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھیں۔ مجھے تہہ خانے کی تاریکی میں دیوار کا دھندلا دھندلا خاکہ نظر آ رہا تھا۔

اس دیوار میں سے ایک سایہ دھوئیں کی طرح لہراتا ہوا نمودار ہوا۔ دیوار سے باہر آتے ہی اس سائے نے ایک بھیڑیئے کی شکل اختیار کر لی جس کی سرخ آنکھوں میں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر سائے نے ایک مگرمچھ کی شکل اختیار کر لی جو منہ پھاڑے میری طرف بڑھ رہا تھا جیسے مجھے اپنے نوکیلے دانتوں میں دبوچ لے گا۔ یہ مگرمچھ میرے قریب آتے آتے ایک سیاہ فام عورت بن گئی جس کے جبڑوں سے خون کے قطرے اس کے جسم پر ٹپک رہے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں چھریاں تھیں۔ ان چھریوں کے ساتھ بھی خون لگا ہوا تھا۔ وہ اپنے زرد نوکیلے دانت نکالے غراتے ہوئے میری طرف بڑھ رہی تھی۔

میں جانتا تھا وہ مجھے قتل کرنے والی ہے مگر میں پتھر کی طرح پڑا تھا اور اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کر سکتا تھا۔ میرے پاس آکر اس نے دونوں چھریوں والے ہاتھ اوپر اٹھا لئے اور ایک چیخ کے ساتھ میرے سینے اور پیٹ پر وار کیا۔ لیکن ابھی اس کی چھریاں میرے جسم سے ایک فٹ اونچی ہوں گی کہ اس سیاہ فام چڑیل نما عورت کے حلق سے نکلتی چیخ آدھی اس کے حلق کے اندر ہی رہ گئی اور اس کی گردن ایسے کٹ کر

اس کے کندھوں سے نیچے گر پڑی جیسے کسی غیبی انسان نے اس کی گردن پر تلوار کا بھرپور وار کیا ہو۔

سیاہ فام عورت کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا تھا۔ سر زمین پر گرا ہوا تھا مگر دھڑ اپنی جگہ پر اسی طرح کھڑا تھا۔ میں ادھ کھلی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن میں سے خون نکل نکل کر اس کے جسم پر آبشاروں کی طرح بہہ رہا تھا۔ پھر اس کا دھڑ کھڑے کھڑے ایسے کانپنے لگا جیسے اس پر لرزہ طاری ہو گیا ہو۔ اچانک سیاہ فام عورت کی کٹی ہوئی گردن کے اندر سے ایک سیاہ سانپ خون آلود شاہ رگ کی طرح تڑپ کر باہر نکلا اور اس نے پھن کھول کر پھنکار ماری اور عورت کے سینے پر تین چار مرتبہ ڈس لیا۔ عورت کا جسم کھڑے کھڑے موم کی طرح پگھل کر بہنے لگا اور چند لمحوں کے اندر اندر سیاہ فام عورت کا مردہ دھڑ پانی کی طرح بہتے بہتے غائب ہو گیا۔ پھر دیوار میں میری نگاہوں کے بالکل سامنے روشنی کا ایک گولہ نمودار ہوا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ روشنی کے اس دائرے میں باغ کا ایک راستہ بنا ہوا تھا جس کی دونوں جانب پھولوں والی کیاریاں تھیں۔

روشنی کے اس دائرے کی طرف سے تازہ ہوا آ کر میرے چہرے کو چھونے لگی۔ اس ہوا میں خدا جانے کیا طاقت تھی کہ میرے جسم کی کھوئی ہوئی توانائی واپس آ گئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں اٹھا اور خداوند کریم کی اس غیبی امداد پر اس کا شکر ادا کرتے روشنی کے دائرے کے اندر چلا گیا۔ روشنی کے دائرے کے اندر آتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک خوشنما خوب صورت باغ میں ہوں جس کے آسمان پر موتیوں کی طرح تارے چمک رہے ہیں۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی تہہ خانہ اور تہہ خانے کی دیوار نہیں تھی۔ پیچھے بھی اسی باغ کی ایک خوبصورت روش تھی جس پر ستاروں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں کھڑے ہو کر حیرت سے دائیں بائیں دیکھنے لگا کہ میں کہاں تھا اور کہاں آ گیا ہوں۔ اگر قدرتِ خداوندی میری مدد نہ کرتی تو خدا جانے



میرا اس بند تہہ خانے میں کیا حشر ہوتا۔ جمشید تو مجھے اس دوزخ میں ڈال کر چلا گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ آخر اس نے مجھ سے کس جنم کا بدلہ لیا تھا کہ مجھے ایسی ہلاکت خیز جگہ پر پھینک گیا تھا۔ میں باغ میں سے باہر ایک سڑک پر آ گیا تھا۔ میں نے اتنی سعی کر لی تھی کہ میں بمبئی شہر میں ہی تھا۔

O

میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

رات کے تین بج رہے تھے۔ پہلے تو میرا جی چاہا کہ وہیں سے بمبئی کے ریلوے سٹیشن پر چلا جاؤں اور پنجاب کو جاتی جو پہلی ٹرین ملے اس میں سوار ہو کر اپنے شہر امرتسر پہنچ جاؤں اور جمشید ایسے بے وفا بلکہ دشمن دوست کی پھر کبھی شکل تک نہ دیکھوں۔ پھر خیال آیا کہ کم از کم ایک بار تو اس کے پاس ضرور جا کر اسے ذلیل کروں اور اس سے پوچھوں کہ آخر میں نے اس کے ساتھ کیا برائی کی تھی جس کا اس نے مجھ سے یوں بدلہ لیا کہ مجھے اندھے تہہ خانے میں بند کر کے موت کے حوالے کر دیا۔

سڑک دونوں جانب دور دور تک خالی پڑی تھی۔ کھمبوں کی بتیاں روشن تھیں۔ یہ بمبئی شہر سے باہر جانے والی کوئی سڑک تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں بمبئی کے کس علاقے میں ہوں۔ میں نے یونہی ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ پیچھے سے کسی گاڑی کی مجھ پر روشنی پڑی۔

میں نے رک کر پیچھے دیکھا۔ کوئی بہت بڑا ٹرک آ رہا تھا۔ میں نے اس خیال سے اسے ہاتھ دے دیا کہ شاید رک جائے۔ مجھے بہت کم امید تھی مگر ٹرک مجھ سے تھوڑا آگے جا کر رک گیا۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا۔ ڈرائیور نے کھڑکی میں سے سر نکال کر پوچھا۔ ”میں کولابہ جا رہا ہوں۔ جانا ہے تو پیچھے بیٹھ جاؤ۔“

میں نے کہہ دیا کہ مجھے بھی کولابہ جانا ہے۔ اور میں ٹرک کے پیچھے جا کر اس پر چڑھ گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ ٹرک چل پڑا۔ حالانکہ مجھے کولابہ نہیں جانا تھا بلکہ



پریل کے علاقے میں جانا تھا جہاں میرے دشمن دوست جمشید کی گیراج نما دکان اور اوپر فلیٹ تھا۔ کولابہ پہنچ کر میں ٹرک سے اتر گیا۔ بمبئی بہت وسیع شہر تھا۔ ساری رات سڑکوں پر ٹیکسیاں وغیرہ چلتی رہتی تھیں۔ میری جیب میں پیسے موجود تھے۔ میں نے ایک ٹیکسی لی اور پریل کے علاقے میں جمشید کے فلیٹ کے باہر آ کر ٹیکسی چھوڑ دی۔

جمشید کا گیراج بند تھا۔ ایک طرف اس کی پرانی گاڑی کھڑی تھی۔ جمشید کے فلیٹ کو سیڑھیاں جاتی تھیں اور سیڑھیوں کے دروازے پر گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ اس بٹن کے اوپر رات کے وقت ایک سرخ بتی جلتی رہتی تھی۔ دروازہ بند تھا۔ جی تو میرا چاہتا تھا کہ میرے پاس بھری ہوئی بندوق ہو اور گھنٹی بجانے پر جب جمشید نیچے آئے تو میں اسے فوراً گولی سے اڑا دوں۔ میں گھنٹی کا بٹن دبانے کے لئے آگے بڑھا تو میں نے دیکھا کہ جمشید کی گاڑی کا بونٹ ایک طرف سے اوپر کو اٹھا ہوا تھا اور گاڑی کا سارا انجن غائب تھا۔

میں نے دل میں جمشید کو گالی دی اور سوچا کہ کس قدر عیار شخص ہے یہ جمشید..... مجھے اندھے تہہ خانے میں مرنے کے لئے چھوڑ کر آنے کے بعد اس نے گاڑی کا انجن نکلوا کر ایک طرف رکھوا لیا تا کہ اگر میں اس پر کسی قسم کا الزام لگا دوں تو وہ کہہ سکے کہ میری گاڑی کا تو انجن ہی نکلا ہوا ہے میں تمہارے پاس گاڑی لے کر سینما ہاؤس کیسے آ سکتا تھا۔

میں نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ فلیٹ میں اوپر کسی جگہ گھنٹی بجی جس کی دھیمی سی آوز مجھے وہاں کھڑے کھڑے بھی سنائی دی۔ تیسری گھنٹی پر جمشید نے فلیٹ کی بازار والی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھا اور نیند بھری آواز میں پوچھا۔ ”کون ہے اس وقت؟“

جمشید کی آواز سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ میرا جی اسے وہ تمام گالیاں دینے کو چاہا جو میں نے بچپن سے لے کر اس وقت تک سنی تھیں۔ مگر میں نے اپنے غصے پر ضبط

کرتے ہوئے اسے صرف اتنا ہی کہا۔ ”نیچے آؤ۔“

جمشید نے مجھے دیکھا تو بولا۔ ”تم اوپر کیوں نہیں آجاتے۔ کہاں تھے تم؟“

میں نے طیش میں آکر کہا۔ ”جس قبر میں تم مجھے زندہ دفن کر آئے تھے میں وہیں تھا۔“

”یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ میں آرہا ہوں۔“ جمشید نیچے آگیا۔ جیسے ہی وہ میرے سامنے آیا میں نے زور سے اس کے منہ پر ایک تھپڑ مارا اور دوسرے ہاتھ سے تھپڑ مارنے ہی والا تھا کہ جمشید نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”پاگل ہوگئے ہو؟ لگتا ہے بہت شراب پی رکھی ہے تم نے..... چلو..... اوپر چلو۔“

میں نے غصے میں اسے گالیاں دینی شروع کردیں۔ وہ مجھے کھینچتا ہوا، گھسیٹتا ہوا اوپر لے گیا اور مجھے صوفے پر گراتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے شراب کب سے شروع کر دی ہے؟“

میں نے اسے گالی دے کر کہا۔ ”میں نے شراب نہیں پی۔ اگر شراب پی ہوتی تو میں تمہیں دیکھتے ہی قتل کر ڈالتا.....“

جمشید نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ میں نے شراب نہیں پی ہوئی۔ شاید اس لئے کہ میرے منہ سے شراب کی بالکل بو نہیں آرہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے مجھے سنبھالا اور بولا۔ ”فیروز! فیروز! خدا کے لئے ہوش میں آجاؤ۔ مجھے بتاؤ آخر بات کیا ہوئی ہے۔ ٹھیک ہے تم نے شراب نہیں پی رکھی۔ لیکن تم مجھے کیوں گالیاں دے رہے ہو؟ میں نے کیا کیا ہے؟

میں نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پالیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جمشید! پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے مجھ سے کس چیز کا بدلہ لیا ہے۔ میں نے تمہارے ساتھ ایسا کون سا برا سلوک کیا تھا کہ تم مجھے ورغلا کر مال لانے کے بہانے ویران علاقے میں لے گئے اور پھر ایک جھوٹا ڈرامہ کھیل کر مجھے ایک اندھے کنوئیں میں پھینک کر آگئے؟ اگر قدرت



میری مدد نہ کرتی تو صبح تک وہاں میری لاش کو چیونٹیاں کھا رہی ہوتیں۔“

جمشید حیران ہو کر میری صورت تک رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”تم کس اندھے کنوئیں کا ذکر کر رہے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ کون سا ڈرامہ کھیلا ہے۔ میں تو جب سے تم میٹرو سینما ہاؤس میں فلم دیکھنے گئے ہو اس وقت سے لے کر اب تک اپنے گیراج اور فلیٹ پر ہی ہوں۔ ایک لمحے کے لئے یہاں سے نہیں گیا۔“

میں نے کہا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیا تم گاڑی لے کر میٹرو سینما نہیں آئے تھے اور وہاں سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر یہ کہہ کر ایک ویران شیڈ میں نہیں لے گئے تھے کہ دوبئی سے ایک پارٹی مال لینے آئی ہے.....“

جمشید پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”میری گاڑی تو انجن کے بغیر باہر پڑی ہے۔ میں تو پرسوں سے اس کا انجن اوورہال کر رہا ہوں۔ بے شک نیچے جا کر دیکھ لو۔ گاڑی کا انجن نہیں ہے۔“

جب میں نے اسے پورا واقعہ بیان کیا تو جمشید مجھے ایسے دیکھنے لگا جیسے اسے میری دماغی حالت کے نارمل ہونے پر شک پڑ گیا ہو۔ کہنے لگا۔ ”فیروز! میں نے زندگی میں کبھی منشیات کا کام نہیں کیا۔ میرے پاس کوئی دوبئی والی پارٹی نہیں آئی۔ میں تمہارے پاس میٹرو سینما نہیں پہنچا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”تو پھر وہ کون تھا؟ وہ تم ہی تھے۔ تم..... جمشید تھے۔ کیا میں تمہیں پہچانتا نہیں؟“

جمشید کہنے لگا۔ ”تم کہہ رہے ہو کہ میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرا نوکر عبدل اپنی بیمار ماں کی خبر گیری کرنے ناسک گیا ہوا ہے۔ نوکر عبدل کہیں نہیں گیا جا کر دیکھ لو۔ وہ نیچے گیراج میں سو رہا ہے۔ وہ گزشتہ کئی مہینوں سے ناسک نہیں گیا۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب کچھ کیا کہہ رہے ہو۔“

جمشید کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ آدمی جھوٹ بول رہا ہو تو اس

کا پتہ چل جاتا ہے اور جمشید تو میرا بچپن کا دوست تھا۔ میں اس کے مزاج کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ آخر وہ کون تھا جو جمشید بن کر میرے پاس آیا تھا اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے اندھے تہہ خانے میں پھینک گیا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں یہ ان بدروحوں کا کام تو نہیں تھا جو مجھے رانی بائی کے قلعے کی حسین روح یا بدروح کو مرتبان سے آزاد کرنے کی وجہ سے میری جان کی دشمن بن گئی تھیں اور اس سے پہلے بھی مجھے دوبار ہلاک کرنے کی کوشش کر چکی تھیں۔

چونکہ میں نے جمشید سے قلعہ رانی بائی میں اپنے ساتھ گزرے ہوئے مافوق الفطرت واقعات کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا اس لئے اب بھی میں نے اسے یہ نہ بتایا کہ ویران علاقے کے اندھے تہہ خانے میں میرے ساتھ کیا گزری اور پھر کیسے دیوار میں روشنی کا ایک دائرہ اپنے آپ ظاہر ہو گیا اور اس دائرے کے اندر باہر جانے کا راستہ مل گیا۔

اس خیال سے کہ جمشید اس واقعے کو میری دماغی کمزوری پر محمول نہ کرے میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے یہ کسی جن، بھوت یا آسیب کی کارستانی ہے۔ ایک بار امرتسر میں جب میں چھوٹا سا تھا تو پہلے بھی ایک جن مجھے گھر سے اٹھا کر بڑی نہر پر لے گیا تھا اور وہاں مجھے نہر کی سیر کروانے کے بعد گھر لا کر چھوڑ گیا تھا۔"

جمشید نے انتہائی تعجب کے ساتھ کہا۔ "شاید ایسا ہی ہوا ہو۔ لیکن کسی جن بھوت کو کیا ضرورت تھی کہ وہ میری شکل بنا کر تمہارے پاس میٹرو سنیما ہاؤس میں آتا۔ وہ ویسے بھی تمہیں وہاں سے اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔"

یہ بات میری سمجھ سے بھی باہر تھی۔ میں اس کے بعد وہیں صوفے پر ہی سو گیا۔ دوسرے روز گیارہ بجے اٹھا۔ نیچے جا کر جمشید کی گاڑی کا بغور معائنہ کیا۔ اس کی گاڑی کا انجن غائب تھا۔ یہ وہی گاڑی تھی جس پر جمشید کی شکل کا جن بھوت یا وہ جو کوئی بھی تھا سوار ہو کر میرے پاس میٹرو سینما آیا تھا۔ لیکن جمشید کے ایک مستری نے مجھے بتایا



کہ جمشید صاحب کی گاڑی کا انجن تو تین روز سے باہر نکلا ہوا ہے۔

میرے ساتھ اوپر تلے دو تین اس قسم کے واقعات گزرے تو میں گھبرا گیا۔ جان سب کو پیاری ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قلعہ رانی بائی کے زرد پوش کاہن کی بدروح میری دشمن بن گئی ہے کیونکہ میں نے قلعے کی حسین و جمیل رانی کی روح یا بدروح کو اس مرتبان سے آزاد کر دیا ہے جس میں زرد پوش کاہن نے رانی کو قتل کرنے کے بعد بند کر کے چبوترے کے شگاف میں چھپا دیا تھا۔ زرد پوش کاہن کی بدروح اپنی غلام بدروحوں سے تین بار مجھ پر قاتلانہ حملہ کرا چکی تھی لیکن قدرت کی کوئی خفیہ طاقت میری مدد کر رہی تھی اور اس نے ہر بار مجھے اس شیطانی زرد پوش کی بدروح کے حملے سے بچا لیا تھا۔

میں نے سوچا کہ میں بمبئی سے چلا ہی جاؤں تو اچھا ہے۔ یہاں رہا تو زرد پوش شیطان میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اس زرد پوش پجاری کا نام رانی بائی کے قلعے والی پراسرار حسین عورت کی روح نے رگھو بتایا تھا۔ اُس حسین عورت نے مجھے اپنا نام نہیں بتایا تھا لیکن اس نے مجھے خبردار کر دیا تھا کہ تم نے مجھے مرتبان سے آزاد کر دیا ہے اس کی وجہ سے رگھو تمہاری جان کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ تمہیں جان سے مار دینے کی ہر ممکن کوشش کرے گا لیکن تمہاری حفاظت مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔

میں نے ان حالات کے پیش نظر فیصلہ کر لیا کہ بمبئی میں نہیں رہوں گا، واپس امرتسر چلا جاؤں گا۔ ویسے بھی حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے تھے۔ پنجاب کے ایک دو شہروں میں فسادات بھی شروع ہو گئے تھے۔ جب میں نے جمشید سے کہا کہ میرا امرتسر واپس جانے کا ارادہ ہے تو اس نے کسی قسم کا اعتراض نہ کیا بلکہ کہنے لگا۔ "میں نے تو تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ امرتسر جا کر اپنی تھوڑی سی جو زمین اور پھلوں کا ایک باغ ہے وہ فروخت کر ڈالو۔ حالات کا کچھ پتہ نہیں ہے پاکستان ضرور بن جائے گا، پھر لگتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کو ہندوستان کے شہروں اور دیہات میں نہیں رہنے

دیں گے۔ ہو سکتا ہے امرتسر کے مسلمانوں کو بھی لاہور یعنی پاکستان کی طرف ہجرت کرنی پڑ جائے۔"

ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے آخر میں ایک روز بمبئی سے امرتسر کی جانب روانہ ہو گیا۔ 1947ء شروع ہو چکا تھا۔ جنوری کا مہینہ تھا پنجاب میں اس موسم میں بہت سردی پڑتی ہے۔ حالات ابھی نارمل تھے فضا میں کشیدگی ضرور تھی۔ گھر آ کر میں نے دکان پر کاروبار سنبھال لیا۔ امرتسر میں مسلم لیگ کے جلسے جلوس ضرور نکلتے تھے مگر ابھی فسادات شروع نہیں ہوئے تھے۔ میں نے جب اپنے چچا سے زمین اور باغ فروخت کر دینے کی بات کی تو اس نے اس کی مخالفت کی۔ کہنے لگا۔ "تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ ہمارے پاس اس تھوڑی سی زمین اور باغ کے سوا اور ہے کیا؟ یہ بھی بیچ دیا تو کھائیں گے کہاں سے؟"

میں نے چچا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ حالات کا کچھ پتہ نہیں کب بدل جائیں اور ہمیں امرتسر سے ہجرت کر کے پاکستان جانا پڑے۔ مگر چچا نہ مانا۔ مارچ کے مہینے میں فسادات شروع ہو گئے۔ پھر فسادات کی آگ بھڑکتی ہی چلی گئی۔ کرفیو لگنے لگے۔ چچا کو نہ جانے کیا سوجھی کہ اپنے بال بچوں کو لے کر جموں چلا گیا۔ وہاں اس کے چھوٹے بھائی کا بڑا وسیع کاروبار تھا۔ چچا یہ کہہ کر جموں گیا کہ جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو وہ امرتسر واپس آ جائے گا۔

میں پیچھے اکیلا رہ گیا۔ دکانداری ختم ہو چکی تھی۔ میرا سارا دن محلے کے لوگوں کے ساتھ بیٹھے گزرتا۔ فسادات تیز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ 14 اگست کا دن قریب آ گیا۔ مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے لٹے پٹے قافلے پاکستان کی طرف ہجرت کر رہے تھے۔ ہمارا محلہ ہندو، سکھوں کے محلوں میں گھرا ہوا تھا۔ حملے کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ لیکن امرتسر کے مسلمان بڑی دلیری کے ساتھ فسادیوں کے ہر حملے کا ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ لیکن جب ڈوگرہ اور ہندو گورکھا فوج بھی فسادیوں کے ساتھ مل



گئی تو حالات نازک شکل اختیار کر گئے۔ پھر بھی ہماری گلی کے مسلمان پاکستان ہجرت کرنے کے لئے ان ٹرکوں کے انتظار میں تھے جنہوں نے انہیں پاکستان پہنچانا تھا۔ ٹرک تو کوئی نہ آئے مگر ڈوگرہ فوج آ گئی۔ فوج نے دستی بموں سے گلی کے منہ پر چڑھا ہوا لوہے کا دروازہ اڑا دیا۔ گلی میں افراتفری مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا دوڑ پڑا۔ میں بھی ایک مکان کے خفیہ دروازے میں سے نکل کر ساتھ والے بازار میں آ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بازار سنسان پڑا تھا، کہیں کہیں انسانوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک مکان میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ریلوے لائن کے پار مہاجرین کا ایک کیمپ تھا جہاں سے مہاجرین کو مال گاڑیوں کے ذریعے واہگہ یعنی پاکستان کے بارڈر تک پہنچایا جاتا تھا۔ میں اس کیمپ میں جانا چاہتا تھا۔

میں آبادی کو چھوڑ کر ویران کھیتوں میں سے دوڑ کر گزرتا ریلوے لائن پر آ گیا۔ وہاں سے مہاجرین کیمپ ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ میں تقریباً دوڑتا ہوا جا رہا تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری طرف آموں کا باغ تھا۔ وہاں شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اچانک مجھے "جے بجرنگ بلی" کے نعروں کی آواز سنائی دی۔ میں زیادہ تیز دوڑنے لگا۔ اتنے میں آموں کے باغ میں سے ہندو، سکھ فسادیوں کا ایک جتھہ تلواریں، بندوقیں اور نیزے لہراتا نمودار ہوا۔ انہوں نے مجھے گھیر لیا اور مجھے قتل کرنے ہی والے تھے کہ ایک ہندو نے کہا۔ "اسے شمشان بھومی میں لے چلو۔ ہم اسے ستی کریں گے۔"

انہوں نے میرے گلے میں رسی باندھی اور مجھے کھینچتے ہوئے واپس آموں کے باغ میں لے آئے۔ یہاں سے وہ مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف نعرے لگاتے ایک ویران جگہ پر آ گئے جہاں شروع رات کے مٹیالے اندھیرے میں ایک احاطہ سا نظر آ رہا تھا۔ وہ مجھے احاطے کے اندر لے گئے۔

یہ اصل میں شمشان بھومی کی چار دیواری تھی جہاں ہندو لوگ اپنے مردوں کو جلاتے تھے۔ وہاں ایک طرف چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ کوٹھڑی کے دروازے پر ہلکی

روشنی والا بجلی کا بلب جل رہا تھا۔ اس کی کمزور سی روشنی میں، میں نے ایک چبوترہ دیکھا جس پر لکڑیاں چنی ہوئی تھیں۔ جب کسی مردے کو جلانا ہوتا تھا تو چبوترے پر لکڑیوں کا فرش بچھا کر مردے کو اس پر لٹا دیا جاتا تھا اور پھر اس کے اوپر بھی دو تین فٹ اونچی لکڑیاں چن دی جاتی تھیں اس کو چتا کہتے تھے۔ اس کے بعد مردے کا کوئی بیٹا یا قریبی عزیز چتا کی لکڑیوں پر گھی یا تیل چھڑک کر لکڑیوں کو آگ دکھاتا تھا اور چتا مردے سمیت جلنے لگتی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ چتا میں پہلے سے کوئی مردہ موجود ہے جس کو کسی وجہ سے ابھی جلایا نہیں گیا۔

وہ وجہ دوسرے ہی لمحے میری سمجھ میں آگئی۔ ان ہندو غنڈوں کو کسی ایسے مسلمان کی تلاش تھی جس کو ہندو مردے کے ساتھ جلایا جائے۔ میں انہیں ایک ایسا مسلمان مل گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے پکڑ کر چتا کی ایک جانب لٹا دیا اور میرے ہاتھ اور پاؤں چتا کی لکڑیوں کے بڑے بڑے مڈھوں کے ساتھ لوہے کی تار سے باندھ دیئے..... میں سمجھ گیا کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے اور قدرت نے میری موت اسی طرح لکھی تھی۔ میں نے اس مردے کو بھی دیکھ لیا تھا جو میری دائیں جانب لکڑیوں کی دو تین تہوں کے نیچے پڑا مجھے نظر آگیا تھا۔

وہ مرا ہوا تھا۔ میں انسان تھا۔ مگر مجھے اس مردے کے ساتھ جل کر راکھ ہونا تھا جس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا مگر اب ایسا میرے ساتھ ہونے والا تھا، بلکہ ہو رہا تھا۔ ہندو غنڈوں میں سے ایک غنڈے کے ہاتھ میں ہاکی تھی۔ اس نے ”جے بجرنگ بلی“ کا نعرہ لگا کر کہا۔ ”اس مُسلے کو جلا دو۔“

اس کے ساتھ ہی ایک غنڈہ کوٹھڑی میں سے تیل کا کنستر اٹھا کر لایا اور لکڑیوں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ باقی غنڈے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک نے چتا کو آگ لگا دی۔ تیل کی وجہ سے لکڑیوں نے فوراً آگ پکڑ لی۔ غنڈے چتا کے چبوترے کے ارد گرد حبشیوں کی طرح ناچنے لگے۔



مجھے اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ میں نے کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ مجھے اپنے خدا پر یقین تھا کہ جب تک وہ نہیں چاہے گا مجھے دنیا کی کوئی طاقت ہلاک نہیں کر سکے گی۔ لیکن آگ کے شعلے میری چاروں طرف بلند ہو رہے تھے۔ ان شعلوں نے میرے ارد گرد ایک دیوار بنا دی تھی۔ میں اس بات پر حیران تھا کہ مجھے ان شعلوں کا سینک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں لکڑیوں کے بھاری مڈھوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ میں اٹھ کر بھاگ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہندو غنڈوں کے نعروں کی آواز اب دور چلی گئی تھی۔ وہ مجھے سپردِ آتش کر کے شاید جا چکے تھے۔

اچانک ایسی بات ہوئی جس نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ کوئی میرے ہاتھ پاؤں کھول رہا ہے۔ دوسرے لمحے میرے ہاتھ پاؤں رسیوں سے آزاد ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے کانوں میں کسی عورت کی سرگوشی کی آواز آئی۔

”چتا پر سے کود جاؤ۔“

میں اٹھا اور چتا کے شعلوں میں سے باہر چھلانگ لگا دی۔ میں زمین پر گرا۔ میرے کپڑے اور جسم بالکل صحیح سلامت تھا۔ آگ کے شعلوں نے جیسے انہیں چھوا تک نہیں تھا۔ میں نے اس عورت کی سرگوشی کو پہچان بھی لیا۔ یہ وہی ویران قلعہ نما حویلی والی آسیبی عورت تھی جس کی بدروح کو میں نے مرتبان سے آزاد کر دیا تھا اور جس نے مجھے کہا تھا کہ میری حفاظت کرنا اس کا فرض بن چکا ہے۔

چتا میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ شعلوں کی روشنی میں، میں شمشان کے گیٹ کی طرف دوڑا۔ جیسے ہی گیٹ سے باہر نکلا میرے کانوں میں اس عورت کی سرگوشی ایک بار پھر سنائی دی۔ ”فیروز! اس طرف مت جاؤ۔“

اس کے فوراً بعد کسی نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور مجھے ایک طرف دھکیلنا شروع کیا۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔ میرے سامنے بائیں جانب جی ٹی روڈ تھی جو پاکستان کی طرف جاتی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی پراسرار حسین و جمیل

عورت ہے جس نے مجھے بازو سے پکڑ رکھا ہے اور مجھے کسی محفوظ مقام کی طرف لے جا رہی ہے۔ وہ مجھے جی ٹی روڈ سے ہٹا کر کھیتوں میں لئے جا رہی تھی۔ وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی مگر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم رانی بائی کی ویران حویلی والی عورت کی بدروح ہی ہو؟''

اب مجھے اس عورت کی باقاعدہ آواز سنائی دی۔ ''ہاں! میں وہی ہوں۔''

''تم مجھے کہاں لئے جا رہی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس غیبی عورت نے جواب دیا۔ ''وہاں جہاں تمہاری زندگی محفوظ ہو گی۔''

میں اس عورت کا ممنونِ احسان ضرور تھا۔ خدا نے اس عورت کے وسیلے سے میری زندگی بچالی تھی لیکن یہ الجھن بھی ہو رہی تھی کہ یہ بدروح آخر کب تک میرا پیچھا کرتی رہے گی۔ میں اس قسم کی خرافات اور توہمات میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میرا ہندو نام روہنی ہے۔ مگر جیسا کہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں میں نے روہت گڑھ کے مغل صوبیدار ہاشم خان سے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور میرے پتی دیو ہاشم خان نے میرا اسلامی نام قمر النساء سلطانہ رکھ دیا تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔ میرا خاوند ہاشم خان مجھے سلطانہ کہہ کر بلاتا تھا۔ مجھے بھی اپنا یہ نام پسند ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس بدروح کے ہندو نام سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اس کے مسلمان نام سے کوئی سروکار تھا۔ میں تو کسی طرح اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا۔ ہم رات کے دھندلے اندھیرے میں ایک اونچی فصل والے کھیت میں سے گزر رہے تھے۔ میں نے اُس سے کہا۔ ''مجھے ایک بات بتاؤ۔''

''پوچھو۔'' اس عورت کی مجھے آواز آئی۔

مجھے اس کی آواز ہی آ سکتی تھی کیونکہ وہ اگرچہ میرا بازو چھوڑ کر میرے ساتھ



ساتھ چل رہی تھی اور مجھے اس کے ریشمی ملبوس میں سے اٹھتی ایک پراسرار سی خوشبو باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ''تم کہاں تک میرے ساتھ ساتھ چلتی رہو گی؟''

اُس نے کہا۔ ''میں تمہیں پاکستان چھوڑ کر واپس آؤں گی۔''

میں نے اسے کہا۔ ''آگے راستہ بالکل صاف ہے میں خود ہی چلا جاؤں گا تم یہاں سے واپس چلی جاؤ۔''

اُس نے کہا۔ ''پجاری رگھو تمہاری جان کا دشمن بن چکا ہے۔ کوئی پتہ نہیں وہ تم پر کہاں حملہ کر کے تمہیں موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش کرے۔ میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔''

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم سائے کی طرح میرے ساتھ لگی رہو۔ میں تم سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ بدروح کہنے لگی۔ ''مجھے تمہاری پریشانی کا احساس ہے لیکن تم میری مجبوری کو نہیں سمجھ رہے۔ جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا کہ تمہاری زندگی پجاری رگھو کی بدروح سے محفوظ ہو گئی ہے میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی اور میں تمہیں یہ بتا دینا چاہتی ہوں کہ میری اپنی نجات بھی اسی میں ہے کہ تم زندہ رہو۔''

میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''آخر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو۔ تم جو کچھ چاہتی ہو مجھے ایک بار بتا دو اور میری جان چھوڑ دو۔''

حسین و جمیل بدروح کی ٹھنڈا سانس بھرنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''وقت آنے پر میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گی کہ میں تم سے کیا چاہتی ہوں اور میں تمہاری جان بچانے کی کس لئے کوشش کر رہی ہوں۔''

معاملہ اور زیادہ الجھتا جا رہا تھا۔ یہ بدروح میرا پیچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی اور میں اس سے ہر حالت میں پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں چلتے چلتے رک گیا اور ہاتھ جوڑ کر

کہا۔ "خدا کے لئے اب واپس جاؤ۔ میں پاکستان پہنچ جاؤں گا۔ تم نے میری جان بچائی میں اس کے لئے تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن اب مجھے تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

اس عورت کی طرف سے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس کے لباس میں سے جو پراسرار سی ہلکی ہلکی خوشبو آرہی تھی اب وہ بھی غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں چاروں طرف غور سے دیکھا۔ پھر کہا۔ "کیا تم چلی گئی ہو؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ وہ جا چکی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جس طرف وہ مجھے لے جارہی تھی اسی طرف چلنے لگا۔ میرے اِرد گرد کھیت ہی کھیت تھے۔ رات کے اندھیرے میں کہیں کھیتوں میں اونچی اونچی فصل نظر آرہی تھی کہیں کھیت خالی پڑے تھے۔ نہ کوئی گاؤں قریب نظر آتا تھا اور نہ کسی کتے کے بھونکنے کی ہی آواز سنائی دیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی پاکستان کا بارڈر بہت دور ہو گا کیونکہ امرتسر سے لاہور کا فاصلہ جی ٹی روڈ پر تیس پینتیس میل ہوا کرتا تھا اور میں دائم گنج کے علاقے سے اس عورت کے ساتھ کھیتوں میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ایک میل ہی چلا ہوں گا۔ مجھے امرتسر سے لاہور کے فاصلے کا پورا اندازہ تھا۔ میرے خیال میں، میں اس وقت چھ ہرٹہ گاؤں کے قریب ہوں گا مجھے کھیتوں میں کچھ فاصلے پر بجلی کی دو چار روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔

میں سمجھ گیا کہ چھ ہرٹہ میں سکھوں کا جو متبرک گردوارہ ہے یہ اس کی روشنیاں ہیں۔ یہ گردوارہ چھ ہرٹہ ریلوے سٹیشن کے قریب ہی تھا اور میرا دیکھا ہوا تھا۔ میں نے ان روشنیوں سے ہٹ کر کھیتوں میں دوسری طرف چلنا شروع کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہاں ہندو غنڈے ضرور ہوں گے جو پاکستان کی طرف جانے والے مسلمان مہاجرین کے قافلوں پر حملے کر رہے ہوں گے۔ میں کھیتوں میں چلتا چلتا دوسری طرف سے ہو کر کافی آگے نکل گیا۔ میرا رُخ لاہور ہی کی طرف تھا۔



رات کے اندھیرے میں مجھے اتنا ضرور اب نظر آنے لگا تھا کہ میں راستہ دیکھ کر اور سمت کو برقرار رکھ کر چل رہا تھا۔ اپنی دائیں جانب مجھے کھیتوں کے پار بہت سے آدمیوں کے سائے سے چلتے دکھائی دیئے۔ پھر ایک جیپ کی آواز بھی دور سے سنائی دی۔ میں رُک گیا۔ یہ سوچ کر رُک گیا کہ کہیں یہ ہندو سکھوں کا جتھہ نہ ہو جو پاکستان کی طرف جاتے مہاجرین کا بے دریغ قتل عام کر رہے تھے۔ پھر بھی میں کھیتوں میں اُگی ہوئی اونچی فصل کی آڑ لیتا اسی طرف بڑھنے لگا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد میں قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ مہاجرین کا قافلہ ہے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان کی طرف جا رہا ہے۔ لٹے پٹے بدحال لوگ سڑک پر پیدل چلے جا رہے تھے۔ عورتیں اور بچے گڈوں پر سوار تھے۔ ان میں شدید زخمی بھی تھے۔ بلوچ رجمنٹ کے فوجیوں کی ایک جیپ ان کی حفاظت کے لئے ان کے ساتھ تھی۔ یہ جیپ سڑک پر کبھی آگے چلی جاتی تھی اور کبھی واپس آکر قافلے کے پیچھے چلنے لگتی تھی کہ کہیں قافلے پر کوئی جتھہ پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور میں بھی اسی قافلے میں شامل ہو گیا۔ قافلہ بمشکل ایک ڈیڑھ میل ہی چلا ہو گا کہ دور سے پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوا کہ قافلہ پاکستان کے واہگہ بارڈر کے قریب پہنچ گیا ہے۔ مجھے خوشی بھی ہو رہی تھی اور حیرانی بھی ہو رہی تھی۔ خوشی اس بات کی ہو رہی تھی کہ میں آخر جان بچا کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ پینتیس میل کا فاصلہ اتنی جلدی کیسے طے ہو گیا میں تو ابھی امرتسر کی آبادی دائم گنج سے چلا ہی تھا اور میرے اندازے کے مطابق تو ابھی چھ ہرٹہ کا سٹیشن بھی نہیں آتا تھا جو امرتسر سے لاہور آتے ہوئے پہلا سٹیشن تھا۔ قافلہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تو مہاجرین کے مردہ جسموں میں جیسے جان پڑ گئی۔ قافلے میں بھی پاکستان زندہ باد، قائداعظم زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔

O

میں پاکستان پہنچ گیا۔

پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھنے کے بعد جان و مال کے جس تحفظ اور جس خوشی کا احساس ہوا وہ آج بھی مجھے یاد ہے۔ میرے پاس اسے بیان کرنے کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ بے پایاں مسرت کا یہ ایسا ہی احساس تھا جیسے کسی کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو اور پھر اچانک اس کی جان بخشی کے آرڈر آگئے ہوں۔ یہ وہ خون آشام زمانہ تھا جب مشرقی پنجاب میں خاص طور پر کسی مسلمان کی عزت اور جان محفوظ نہیں تھی۔ شہروں اور گاؤں میں جگہ جگہ ہندو، سکھ غنڈے مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہے تھے۔ جگہ جگہ میں نے مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی کٹی ہوئی لاشیں بکھری دیکھی تھیں۔ بچوں کو ماؤں کی گودیوں سے چھین کر انہیں نیزوں کی نوک پر اچھالا اور نیزوں میں پرو دیا گیا تھا۔ مسلمان عورتوں کو ان کے بالوں سے درختوں کی شاخوں پر لٹکا کر ان کے پیٹ چاک کئے گئے تھے۔ معصوم بچوں کو میخوں کے ساتھ درختوں میں ٹھونک دیا گیا تھا۔ پاکستان کی موجودہ ڈسکو بوائز کی نسل کو شاید اس کا احساس نہ ہو لیکن آنے والا مورخ جب پاکستان کی تاریخ رقم کرنے بیٹھے گا تو وہ یہ دیکھ کر ایک بار ضرور لرز اٹھے گا کہ مسلمانوں نے کس قدر بے مثال اور ہوش ربا قربانیاں دے کر پاکستان حاصل کیا تھا۔ اس زمانے کو یاد کرتا ہوں تو میری آنکھوں کے سامنے قیامت خیز آگ کے شعلے بھڑکنے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے خون ناحق کے



چھینٹے اڑنے لگتے ہیں۔ میں کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ پاکستان کی موجودہ اور آنے والی نسلوں کے نوجوان اپنے اجداد کی ان اندوہناک بے مثال قربانیوں کو فراموش کر دے گی۔

خدا نہ کرے کہ ایسا ہو..... آمین!

بہر حال میں اپنی دہشت خیز داستان کو آگے چلاتا ہوں۔ میں بھی دوسرے مہاجرین کے ساتھ پاکستان پہنچ گیا۔ پاکستان میں ہمارا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں تھا۔ ایک ہفتہ میں والٹن لاہور کے مہاجرین کیمپ میں رہا جہاں سن سنتالیس کے زمانے میں لٹے پٹے مہاجرین کا والٹن کیمپ ہوا کرتا تھا وہاں آج کل لاہور کی سب سے بڑی ماڈرن اور خوبصورت ڈیفنس کالونی آباد ہے۔ رات کو یہاں کی جگمگاتی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے یہاں کی روشنیاں اور شاپنگ سینٹروں اور کشادہ سڑکوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ آدمی یورپ کے کسی شہر میں آگیا ہے۔ ڈیفنس کی آبادی کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے ہر شہر، شہر کی ہر آبادی اور یہاں کی جگمگاتی روشنیوں کو ہمیشہ سلامت رکھے۔ قائم و دائم رکھے۔ آمین!

لیکن ڈیفنس کی جگمگاتی سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے کبھی کبھی ایک لمحے کے لئے ہی سہی ہمیں یہ ضرور یاد کر لینا چاہئے کہ جب پاکستان بن رہا تھا یہاں وہ لوگ بھی آئے تھے جن کے ننگے پاؤں زخمی تھے، جسموں سے خون بہہ رہا تھا اور جو اپنے پیاروں کی کٹی ہوئی لاشیں مشرقی پنجاب کے گلی کوچوں میں بے گور و کفن چھوڑ آئے تھے جن کے چہروں پر گرد جمی تھی اور جن کی آنکھوں کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے پاکستان بنایا تھا۔

ایک ہفتہ والٹن کے مہاجرین کیمپ میں رہنے کے بعد میں فکر معاش کی تگ و دو میں لاہور سے راولپنڈی آگیا۔ میں مشرقی پنجاب سے کچھ روپے بچا کر ساتھ لانے میں کامیاب ہو گیا تھا وہی خرچ کر کے گزارہ کر رہا تھا۔ جب پنڈی میں کام کا کوئی

سلسلہ نہ بنا تو واپس لاہور آ گیا۔ یہاں لاہور کے ایک سینما ہاؤس میں بکنگ کلرک کی نوکری مل گئی ساتھ ہی سینما کی عمارت میں ایک چھوٹا سا کمرہ بھی رہنے کو مل گیا۔ حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے۔ اس دوران بمبئی سے میرے پرانے اور بچپن کے دوست جمشید کا خط آیا کہ اگر پاکستان میں کوئی کام وغیرہ نہیں مل رہا تو بمبئی میرے پاس آ جاؤ۔ میں نے اسے لکھ دیا کو میں پاکستان میں ہی رہنا چاہتا ہوں اور مجھے اب نوکری بھی مل گئی ہے۔ کچھ میں اس لئے بھی بھارت کے شہر بمبئی نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہاں وہ پرانی قلعہ نما حویلی ہے جہاں روہنی عرف سلطانہ کی بدروح سے میرا واسطہ پڑ گیا تھا اور جو ابھی تک میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے اور جس سے میں چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مگر کہتے ہیں کہ مقدر کے لکھے کو کوئی نہیں ٹال سکتا، وہ ہو کر ہی رہتا ہے۔ اس کی شدت میں کمی بیشی انسان کے اعمال کے مطابق ہو سکتی ہے مگر وہ ٹل نہیں سکتا۔ یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کو اس سے اختلاف ہو مگر میرا تجربہ یہی کہتا ہے۔

پاکستان بن جانے کے بعد میں لاہور کے ایک سینما ہاؤس میں گمنامی اور خاموشی سے بکنگ کلرکی کر رہا تھا۔ یہ کھٹکا مجھے برابر لگا رہتا تھا کہ پرانی حویلی نما قلعے کی حسین و جمیل بدروح روہنی عرف سلطانہ کسی بھی وقت نمودار ہو سکتی ہے اور اس کو آزاد کر دینے کی پاداش میں اس کے اور میرے دشمن رگھو پجاری عرف زرد پوش کی بدروح کسی بھی وقت مجھ پر حملہ کر سکتی تھی۔ میں لاہور میں ایک بزرگ عامل سے اس سلسلے میں ملا۔ انہیں ساری حکایت بیان کی تو انہوں نے مجھے کوئی تعویذ وغیرہ تو نہ دیا صرف مجھے باقاعدگی سے نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی اور میں نے نماز پڑھنی شروع کر دی۔ لیکن میری سینما کی ملازمت کی نوعیت ایسی تھی کہ دوپہر اور شام کی نماز اکثر قضا ہو جاتی تھی۔

دن گزرتے چلے گئے۔ ایک سال گزر گیا۔ پرانی حویلی کی بدروح روہنی اور زرد



پوش پجاری رگھو کی بدروح کی طرف سے اس دوران ان کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بلائیں میرے سر سے ٹل گئی تھیں۔ لاہور سے ہندو اور سکھ شرنارتھی ہندوستان جا چکے تھے۔ ان کے خالی مکان مشرقی پنجاب اور ہندوستان سے آنے والے دوسرے مسلمان مہاجرین کو الاٹ ہو گئے تھے۔ سینما ہاؤس کا ایک گیٹ کیپر انور میرا دوست بن گیا تھا۔ ہم اکثر ہوٹل میں اکٹھے ناشتہ کرنے اور کھانا کھانے جایا کرتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم شام کا شو شروع کرانے کے بعد ہوٹل میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ میرے دوست گیٹ کیپر انور نے کہا۔ ”فیروز! تمہیں معلوم ہے ہندو سکھ لاہور سے جاتے ہوئے یہاں کئی جگہوں پر اپنا سونا اور زیورات مکانوں میں دبا گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”سنا تو میں نے بھی ہے لیکن آج تک کسی مکان سے دبا ہوا سونا چاندی نکلتے نہیں سنا۔

انور کہنے لگا۔ ”وہ کسی کو بتا کر تھوڑی گئے ہیں کہ ہم نے سونا چاندی کہاں دبایا ہوا ہے۔“

”تو پھر وہ کس لئے دبا گئے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

انور نے کہا۔ ”وہ اس خیال سے اپنی دولت مکانوں کے اندر، زمین اور دیواروں میں گاڑ گئے ہیں کہ جب ذرا حالات ٹھیک ہوں گے تو آ کر لے جائیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ان کا مال ہے۔ لے جائیں۔“

انور بولا۔ ”کیوں؟ اب یہ ان کا مال نہیں ہے۔ اب یہ پاکستان کی دولت ہے۔ ہمارے بھائی بھی تو اُدھر بہت کچھ چھوڑ آئے ہیں۔ وہ تو اپنے ساتھ ایک تنکا تک اٹھا کر نہیں لا سکے۔“

میں نے کہا۔ ”یار تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں

ہے۔"

انور خاموش ہو کر کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "میں تمہیں ایک بات بتانے والا ہوں۔ مگر شرط یہ ہے کہ تم آگے کسی کو نہیں بتاؤ گے۔"

میں نے کہا۔ "میرے یہاں تم ہی ایک دوست ہو جس کو میں بتا سکتا ہوں۔ اور تو کوئی دوست نہیں ہے جس کو میں بتاؤں۔"

انور بولا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

ہم کھانا کھا چکے تو میں نے چائے کا آرڈر دے دیا۔ انور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ چائے آ گئی۔ ہم چائے پینے لگ گئے۔ چائے کا ایک گھونٹ پی کر انور کہنے لگا۔ "فیروز! تم میرے دوست ہو اس لئے تمہیں یہ بات بتا رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بات کیا ہے۔ وہ بھی تو بتاؤ۔"

انور نے ایک نگاہ اپنے دائیں بائیں ڈالی۔ چھوٹا سا دکان نما ہوٹل تھا کچھ اور لوگ بھی بیٹھے کھانا وغیرہ کھا رہے تھے لیکن ہمارے ساتھ والی میزیں خالی تھیں۔ انور نے میری طرف ذرا جھکتے ہوئے کہا۔ "مجھے ہندوؤں کے دبائے ہوئے ایک خزانے کا پتہ چلا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

انور بڑی رازداری سے بولا۔ "تم اسے ضرور مذاق سمجھ رہے ہو گے مگر یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ راز مجھے یا میری خالہ کے بیٹے سراج کو معلوم ہے۔"

میں نے بھی یونہی دلچسپی کی خاطر پوچھا۔ "اچھا تو یہ خزانہ کہاں دفن ہے؟"

انور بولا۔ "لاہور سے قصور کی طرف تین چار میل کے فاصلے پر ہندوؤں کی ایک بستی تیر تھ گڑھ ہوتی تھی اب تو وہاں سب مسلمان مہاجرین آباد ہیں۔ اس بستی کے باہر ایک تالاب کے پاس ہندوؤں کا ایک مندر ہے جو کالی مندر کے نام سے مشہور ہے۔ اس بستی تیر تھ گڑھ میں سراج کا ایک ہندو دوست شیو رام رہتا تھا۔



پچھلے دنوں سراج ویزا لے کر ہندوستان گیا ہوا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات شیو رام سے ہوئی تو شیو رام نے اسے بتایا کہ اس کے پتا جی نے پانچ سیر وزن کے سونے کے زیورات کالی مندر کی پچھلی کوٹھڑی میں زمین کے نیچے دبائے ہوئے ہیں اور وہ حالات ذرا ٹھیک ہو جانے کے بعد پاکستان جا کر یہ زیورات نکال کر لے آئیں گے۔"

میں نے انور سے کہا۔ "اگر یہ راز تمہارے خالہ زاد بھائی سراج کو بھی معلوم ہے تو وہ تو اب تک سونا نکال کر لے گیا ہو گا۔"

انور نے ہنس کر کہا۔ "سراج بڑا ڈرپوک ہے۔ میں نے یہ کہہ کر اسے اور بھی ڈرا دیا ہے کہ یہ سونا ایک طرح سے اب پاکستان کی حکومت کی ملکیت ہے۔ اگر تم نے اسے نکالا اور کسی کو پتہ لگ گیا تو تم پکڑے جاؤ گے اور تمہیں سات سال قید ہو جائے گی۔ میں نے ساتھ ہی اسے یہ بھی یقین دلایا ہے کہ میں سوہے بازار کے ایک سنیارے سے بات کرتا ہوں۔ ہم سونا نکال کر اپنے پاس رکھنے کی بجائے فوراً اس کے حوالے کر کے رقم وصول کر لیں گے۔ پھر وہ سنیارا جانے اور حکومت جانے۔ سراج میری اس بات پر لگ گیا ہے اور میری اجازت کے بغیر وہ زیورات کبھی نہیں نکالے گا۔"

وہ کہنے لگا۔ "فیروز! تم میرے جگری یار ہو۔ میں اکیلا یہ کام نہیں کر سکتا۔ میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔ ہم رات کے اندھیرے میں یہ زیورات نکال کر لے آئیں گے۔ میں نے ایک سنیارے سے بات کر لی ہوئی ہے وہ اس کے عوض مجھے اسی وقت ساری رقم ادا کرنے کو تیار ہے۔ ہم وہ رقم آدھی آدھی کر لیں گے کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ ہزار کی مالیت کا سونا تو ضرور ہو گا۔"

اس زمانے میں سونے کا بھاؤ جہاں تک مجھے یاد رہ گیا ہے بارہ تیرہ روپے تولہ ہوا کرتا تھا۔ مگر اس زمانے کے بارہ تیرہ روپے آج کے زمانے کے بارہ تیرہ سو بلکہ اس سے بھی زیادہ کی مالیت کے ہوتے ہیں۔ میں نے انور سے کہا۔ "بھائی! مجھے روپے پیسے کا کوئی لالچ نہیں ہے۔ میں ان چند روپوں کی نوکری میں بڑا خوش ہوں۔ اور میں اس

قسم کے کام میں پڑنا بھی نہیں چاہتا۔ جو روپیہ میں نے اپنی محنت سے نہ کمایا ہو میں اس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا۔"

انور بولا۔ "یار! تم میرے جگری یار ہو۔ کم از کم میری اتنی مدد تو کردو کہ میرے ساتھ رات کے وقت مندر تک چلو۔ میں اکیلا زمین نہیں کھود سکتا۔ کیا معلوم خزانہ کتنی گہرائی میں دبایا ہوا ہے۔ تمہارے سوا میں کسی کے آگے یہ راز ظاہر بھی نہیں کر سکتا۔"

انور میرے چھوٹے چھوٹے کئی کام کر دیا کرتا تھا۔ میں اس کے آگے انکار نہ کر سکا اور میں نے اس کے ساتھ کالی مندر جانے کی حامی بھرلی۔

ایک روز شام کے وقت ہم دونوں نے اپنی جگہوں پر دوسرے آدمی بٹھا کر سینما والوں سے چھٹی لے لی اور مزنگ چونگی سے قصور جانے والی لاری میں بیٹھ گئے۔ ستمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ بارشوں کا موسم گزر چکا تھا۔ رات کو ہلکی خنکی ہو جاتی تھی۔ انور نے اپنے ساتھ ایک تھیلا رکھ لیا تھا جس میں ہاتھ سے زمین کھودنے والی دو کھرپیاں تھیں۔ ہم احتیاطاً رات کے دس سوا دس بجے لاہور سے روانہ ہوئے تھے۔ تیر تھ گڑھ قصور جانے والی سڑک پر زیادہ دور نہیں تھا۔ انور نے کالی مندر دیکھ رکھا تھا بلکہ وہ ایک روز دن کے وقت خفیہ طور پر اس کا سروے بھی کر آیا تھا۔ اب تو فیروز پور روڈ پر بڑی بتیاں بھی لگ گئی ہیں جو رات کو جگمگاتی ہیں۔ اس زمانے میں یہ سڑک چھوٹی بھی تھی اور لاہور سے نکلنے کے بعد یہ سڑک رات کے وقت اندھیرے میں ڈوب جاتی تھی اور لاریاں اپنی بتیوں کی روشنی میں چلا کرتی تھیں اور ان کی سپیڈ بھی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ انور لاری کی کھڑکی میں سے باہر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ جب دور سے اسے تیر تھ گڑھ گاؤں کی چند ایک روشنیاں اندھیرے میں جھلملاتی دکھائی دیں تو اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "ہمیں تیر تھ گڑھ والے سٹاپ پر اترنا ہے۔" اور لاری تیر تھ گڑھ کے سٹاپ پر کھڑی ہو گئی۔



ہم لاری سے اتر پڑے۔ سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ لاری آگے نکل گئی۔ ہم سڑک سے اتر کر تیر تھ گڑھ جانے والے کچے راستہ پر پڑ گئے۔ ہم اندھیرے میں چل رہے تھے۔ آس پاس جھاڑیاں اور شاید پھلاہی کے درخت تھے۔ کسی طرف سے جھینگر کے بولنے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔

انور کہنے لگا۔ "گاؤں کے پیچھے ایک پرانا تالاب ہے۔ کالی مندر اس تالاب کے پاس ہی ہے۔ پہلے یہاں بڑی پوجا پاٹ ہوا کرتی تھی۔ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد یہ مندر ویران ہو گیا ہے۔ یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ کسی کسی وقت رات کو کالی مندر میں گھنٹیوں کی آوازیں آتی ہیں۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جب پوجا پاٹ کرنے والے ہی نہیں ہیں تو پھر گھنٹیوں کی آواز کیسے آ سکتی ہے۔"

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انور کے ساتھ آ کر غلطی کی ہے۔ مجھے نہیں آنا چاہئے تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ سوئی ہوئی کلا پھر سے جاگ اٹھے۔ مگر اب میں اپنے دوست کو اکیلا چھوڑ کر واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔

تیر تھ گڑھ گاؤں کی اکا دکا بتیاں نظر آنے لگی تھیں۔ دور سے انسانوں کی بو پا کر گاؤں کے ایک دو کتے بھونکنے لگے۔ انور مجھے لے کر گاؤں کے پیچھے سے چکر کاٹ کر پرانے تالاب کے پاس آ گیا۔ رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف عجیب ڈراؤنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تیر تھ گڑھ کی طرف سے آنے والی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی خاموش ہو گئی تھیں۔ تالاب اندھیرے میں بڑا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اندھیرے میں اس کی سطح ساکت اور دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے یہ تالاب بھی مر چکا ہے۔ اس کے عقب میں ایک کھنڈر سا اندھیرے میں کسی بھوت کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ انور مجھے لے کر اسی بھوت نما کھنڈر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اُس ڈراؤنے ویران کالی مندر سے اتنا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا جتنا خوف مجھے اس بات کا محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں مجھ پر زرد پوش پجاری رگھو کی بدروح حملہ نہ

کر دے کیونکہ وہاں ماحول بد روحوں کا ہی بنا ہوا تھا۔

کالی مندر زمین سے تین چار فٹ اونچے چبوترے پر بنا ہوا تھا اس کی سیڑھیوں کی اینٹیں اکھڑی ہوئی تھیں۔ صرف اتنی اینٹیں باقی تھیں کہ آدمی ان پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ سکتا تھا۔ انور میرے آگے آگے چل رہا تھا۔ مندر کی ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔ انور نے تھیلے میں سے ٹارچ نکال کر روشن کر دی۔ کہنے لگا۔ "جس کوٹھڑی میں زیورات دفن ہیں وہ آگے ہے۔"

ڈیوڑھی میں سے ایک تنگ سرنگ نما راستہ دوسری کوٹھڑی کو چلا گیا تھا۔ ہم دونوں کوٹھڑی میں آگئے۔ انور نے ٹارچ کی روشنی کوٹھڑی کے فرش پر ڈالی۔ فرش پر ٹوٹی پھوٹی اینٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ دیوار میں کسی دیوی کا کالا بت لگا ہوا تھا جس کے بازو، ٹانگیں اور سر غائب تھا، صرف دھڑ دیوار میں باقی رہ گیا تھا۔ مجھے خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے دوست کی وجہ سے وہاں کھڑا تھا۔

انور جھک کر ٹارچ کی روشنی میں فرش کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک جگہ کونے میں ٹوٹی ہوئی اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔ انور نے تھیلا ایک طرف رکھ دیا اور بولا۔ "زیورات یہاں دفن ہیں۔ مجھے یقین ہے۔"

میں نے کہا۔ "جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔ کوئی آگیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔"

انور نے ٹارچ ایک طرف اس طرح رکھ دی کہ اس کی روشنی اینٹوں کے ڈھیر پر پڑ رہی تھی۔ اس نے تھیلے میں سے ایک کھرپی نکال کر مجھے دی اور دوسری اپنے ہاتھ میں پکڑ لی۔ پہلے اس نے اینٹوں کو اِدھر اُدھر ہٹایا۔ پھر زمین کھودنی شروع کر دی۔ میں اس کے سامنے کے رخ پر آکر بیٹھ گیا اور کھرپی سے زمین کھودنے لگا۔ زمین بھربھری تھی۔ بڑی جلدی ہم نے دو ڈھائی فٹ زمین کھود ڈالی نیچے سے کچھ بھی نہ نکلا۔

میں نے کہا۔ "انور! تمہیں غلط اطلاع دی گئی ہے۔ یہاں کوئی زیورات وغیرہ



نہیں ہیں۔"

وہ برابر کھرپی چلا رہا تھا۔ کہنے لگا۔ "ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

ہم نے ایک فٹ اور زمین کھودی ہو گی کہ میری کھرپی کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ ٹکرانے کی آواز سن کر انور نے خوش ہو کر کہا۔ "فیروز! ضرور یہ زیوروں کا ڈبہ ہو گا۔"

ہم اور تیزی سے زمین کھودنے لگے۔ انور نے ٹارچ کو گڑھے کے کنارے پر اس طرح رکھ دیا تھا کہ اس کی روشنی گڑھے میں پڑتی تھی۔ بہت جلدی ہمیں مٹی میں دبی ہوئی کوئی چمکتی ہوئی شے دکھائی دی۔ اس کا رنگ سونے کی طرح زرد تھا۔

انور بولا۔ "یہ سونے کا ڈلا ہو گا۔"

ہم نے کھرپی کی مدد سے اس شے کو مٹی میں سے باہر نکالا تو دیکھا کہ وہ ایک سوڈا واٹر کی بوتل کے سائز کا ایک بت تھا۔ انور نے اس کی مٹی صاف کی اور اس پر اپنا ناخن زور سے رگڑتے ہوئے کہنے لگا۔ "فیروز! ہماری قسمت کھل گئی ہے۔ یہ سونے کا بت ہے۔"

نہ جانے مجھے کیوں خیال آگیا کہ یہ بت کہیں ہماری بدقسمتی کا باعث نہ بن جائے۔ میں نے انور سے کہا۔ "انور میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں۔ اس بت کو اسی جگہ دبا ہوا رہنے دو۔"

انور نے بت کو تھیلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں پاگل نہیں ہوں کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت کو چھوڑ دوں۔"

ہم مندر سے باہر آگئے اور تیز تیز قدموں سے قصور لاہور روڈ کی طرف چلنے لگے۔ انور کہنے لگا۔ "میرا خیال تھا زیور ہوں گے مگر اب معلوم ہوا کہ یہاں سونے کا بت دبا ہوا ہے۔ یہاں سے ہندوستان بھاگتے ہوئے پجاری نے اسے دبا دیا ہو گا۔ مجھے تو خالص سونا لگتا ہے۔ یہ لوگ اپنی مورتیوں میں خالص سونا استعمال کرتے تھے۔"

میں چپ رہا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی منحوس سایہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے بدن میں دوڑ گئی جس نے میری ہتھیلیوں کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ میرے دوست انور کو بالکل علم نہیں تھا کہ کیسے کیسے دہشت ناک واقعات مجھ پر گزر چکے تھے۔ میں خوف محسوس کرنے میں حق بجانب تھا۔ انور خوفزدہ بالکل نہیں تھا۔ اس پر ایک ایسے شخص کی جذباتی کیفیت طاری تھی جس کو اچانک قارون کا خزانہ مل گیا ہو۔ اگر وہ بت سونے کا ہی تھا تو اس کی قیمت ایک لاکھ روپے سے کم نہیں تھی اور اس زمانے میں ایک لاکھ روپیہ آج کے کروڑوں کے برابر تھا۔

انور نے دونوں کھرپیاں کھیتوں میں پھینک دی تھیں۔ بت کو تھیلے میں لپیٹ کر اس نے بغل میں دبایا ہوا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”اس وقت لاہور کی طرف جاتی ہوئی کوئی لاری بھی شاید ہی ملے۔“

میں نے کہا۔ ”شاید مل جائے۔“

مجھے بت کے سونے کی مالیت سے کوئی دلچسپی اور سروکار نہیں تھا۔ میں اس بت کو ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتا تھا۔ انور نے کہا۔ ”میں صبح صبح اسے لے کر سوہے بازار جا کر اس کا وزن کراؤں گا۔ بڑا بھاری ہے فیروز مجھے تو تین سیر کا لگتا ہے۔ تین سیر سونا..... یار! تم کوئی خیال نہ کرنا۔ جتنی رقم ملے گی آدھی آدھی بانٹ لیں گے۔ تم بے شک میرے ساتھ ہی سوہے بازار جانا۔“

ہم لاہور قصور روڈ پر آ گئے۔ رات کے اندھیرے میں سڑک سنسان پڑی تھی۔ انور کہنے لگا۔ ”اس وقت لاہور جانے والی لاری نہیں ملے گی۔ پیدل ہی چل پڑتے ہیں۔“

ہم سڑک کے کنارے کنارے لاہور کی طرف پیدل ہی چل پڑے۔ کچھ دور چلنے کے بعد انور نے تھیلے کو بغل میں سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔ کہنے لگا۔ ”یہ گرم



کیوں ہو رہا ہے؟“

میں نے چونک کر پوچھا۔ ”کون گرم ہو رہا ہے؟“

انور بولا۔ ”سونے کا بت لگتا ہے گرم ہو گیا ہے۔ ہاتھ لگا کر دیکھو۔“

اس نے تھیلا میری طرف کر دیا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو واقعی بت گرم تھا۔ میں نے دل میں کہا مصیبت شروع ہو گئی ہے۔ میں انور کو سمجھا نہیں سکتا تھا اس کی آنکھوں پر دولت حاصل کرنے کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے آج کے ایک کروڑ روپے کے برابر دولت مل گئی تھی۔ اسے اور کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا پھر بھی میں نے اسے کہا۔ ”انور! میں جانتا ہوں تم میری بات نہیں مانو گے۔ مگر میں تمہیں کہنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ میری مانو اور اس بت کو یہیں کھیتوں میں پھینک دو۔“

انور جھنجلا کر بولا۔ ”یار! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ مجھے بتاؤ میں اسے کیوں پھینک دوں؟ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے کہ ہاتھ آئی دولت کو پھینک دوں؟ یہ اللہ کی زمین میں دبی ہوئی ملی ہے۔ اس پر ہم دونوں کا حق ہے۔ بس اب تم چپ رہو۔“

ظاہر ہے مجھے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ انور تھوڑی دیر بعد سڑک پر کھڑے ہو کر پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تھا۔ ”ایک لاری رات کے بارہ بجے قصور سے چلتی ہے۔ اسے اب تک آ جانا چاہئے۔“

مگر ہمیں کوئی لاری نہ ملی۔ اس زمانے میں لوگوں کے پاس کہاں اتنی موٹر کاریں ہوتی تھیں۔ کوئی موٹر کار بھی پیچھے سے نہ آئی۔ انور نے بت والے تھیلے کو دوبارہ بغل میں دبا لیا تھا۔ کہنے لگا۔ ”اب یہ اتنا گرم نہیں ہے۔ وہ زمین کی گرمی تھی۔ میرے استاد نے ایک بار کہا تھا کہ زمین کے اندر زیور یا سونا ایک سال تک دبا رہے تو وہ گرم ہو جاتا ہے۔“

انور اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کرتا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ آخر دور سے ہمیں ماڈل ٹاؤن کی اکا دکا بتیاں نظر آئیں۔ ابھی لاہور کی اضافی کالونیاں کوٹ لکھپت

وغیرہ آباد نہیں ہوئی تھیں۔ ماڈل ٹاؤن پاکستان سے پہلے کی کالونی تھی۔ اتنے میں سڑک پر پیچھے سے لاری کے ہارن کی آواز آئی۔ ہم نے مڑ کر دیکھا۔ سڑک پر دور لاری کی بتیاں روشن تھیں۔ انور خوش ہو کر بولا۔ ”یہ لاہور والی لاری ہے۔“

اس نے لاری کو زور زور سے ہاتھ کے اشارے کرنے شروع کر دیئے۔ لاری ہمارے قریب آ کر رُک گئی۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ لاری میں دس بارہ سواریاں ہی بیٹھی اونگھ رہی تھیں۔ لاری نے ہمیں مزنگ چونگی اتار دیا۔ وہاں سے ہم پیدل چل کر اپنے سینما ہاؤس آ گئے۔ انور نے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو یہ سونے کا بت اپنے پاس رکھ لو۔ مجھے تم پر اعتبار ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تم پر بھی اعتبار ہے انور! اسے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مگر کہاں رکھو گے؟“

انور بولا۔ ”فکر نہ کرو۔ میں اسے اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوؤں گا۔ کل صبح صرافہ بازار کھلتے ہی میں تمہیں ساتھ لے لوں گا پھر ہم سوہے بازار جا کر اس کی قیمت ڈلوائیں گے۔ وہاں ایک سنیارا میرا واقف ہے۔ اب تم بھی آرام کرو۔“

انور کی کوٹھڑی سینما ہاؤس کی پہلی منزل میں پیچھے کی طرف تھی۔ میرا چھوٹا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ وہ اپنی کوٹھڑی کی طرف چل دیا۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ چارپائی پر اسی طرح پڑ گیا۔ کچھ دیر تک کالی مندر کے بت یا مورتی کے متعلق سوچتا رہا۔ طرح طرح کے تشویش پیدا کرنے والے خیالات آتے رہے پھر نیند غالب آ گئی اور میں سو گیا۔

دوسرے روز دن کے دس بجے کے قریب کسی نے میرے کمرے کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ میں سو رہا تھا، دروازے کے شور سے ہڑبڑا کر اٹھا۔ دروازہ کھولا سامنے تھرڈ کلاس کا گیٹ کیپر حنیف شاہ کھڑا تھا۔ سخت گھبرایا ہوا تھا۔ کہنے لگا۔ ”بڑا برا ہوا ہے بھاجی۔“



”کیا ہوا ہے؟“ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

حنیف شاہ بولا۔ ”انور شاہ قتل ہو گیا ہے۔“

میں اس کا منہ تکتا رہ گیا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“

حنیف شاہ بولا۔ ”بھاجی! جلدی آئیں۔ کسی نے انور شاہ کا سر ہتھوڑے سے کچل دیا ہے..... پولیس آئی ہوئی ہے۔“

میں اسی طرح گیٹ کیپر حنیف کے ساتھ انور کی کوٹھڑی کی طرف گیا۔ وہاں سینما ہاؤس کا مینجر، دوسرا اسٹاف اور پولیس پہلے سے موجود تھی۔ سینما کا مینجر پولیس انسپکٹر کو اپنا بیان دیتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”کل انور شاہ نے شام کی چھٹی لے لی تھی۔ کہنے لگا مجھے ایک ضروری کام ہے اس کے بعد میں نے اسے نہیں دیکھا کہیں رات کو آ کر کوٹھڑی میں سو گیا ہو گا۔“

پولیس انسپکٹر نے پوچھا۔ ”اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس کام کی وجہ سے چھٹی لے رہا ہے؟“

مینجر نے کہا۔ ”کچھ نہیں بتایا۔“

وہاں سوگ کی فضا طاری تھی۔ انور کی لاش اس کی کوٹھڑی کے باہر چارپائی پر چادر سے ڈھکی ہوئی پڑی تھی۔ پولیس انسپکٹر نے کہا۔ ”رات کو کسی نے ہتھوڑے کی ضربات سے اس کا سر کچل دیا ہے۔ یہ پرانی دشمنی کا معاملہ ہی ہو سکتا ہے.....“

مجھ سے کسی نے کوئی سوال نہ کیا۔ سونے کے بت یا مورتی کا بھی کسی نے ابھی تک ذکر نہیں کیا تھا کہ انور کے سرہانے کے نیچے سے سونے کی مورتی برآمد ہوئی ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ بدقسمت انور کا سر سونے کی مورتی کی ضربات سے ہی کچلا گیا ہے۔ مگر ایسا کس نے کیا تھا؟

O

جب پولیس انور کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے لے گئی تو میں نے حنیف شاہ سے پوچھا۔ "انور شاہ کی کوٹھڑی سے آلۂ قتل بھی برآمد نہیں ہوا؟"

حنیف شاہ بولا۔ "بھاجی! اگر آلہ قتل وہاں ہوتا تو پولیس ضرور برآمد کرتی۔ مگر ایسی کوئی شے کوٹھڑی میں نہیں تھی۔"

پولیس انور کی لاش اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئی تھی۔ اس کی چارپائی ابھی تک کوٹھڑی کے باہر ایک طرف پڑی تھی۔ میں چارپائی کے قریب چلا گیا۔ سرہانے پر خون ہی خون جما ہوا تھا۔ بستر پر بھی خون تھا۔ انور نے رات کو مجھے کہا تھا کہ وہ سونے کا بت اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوئے گا۔ حنیف شاہ میرے ساتھ ہی تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سرہانے کو ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ سرہانے کے نیچے کالی مندر والا سونے کا بت ضرور موجود ہوگا۔ مگر سرہانے کے نیچے کچھ نہیں تھا۔ سونے کا بت غائب تھا۔

اب مجھے اپنی فکر پڑ گئی۔ اگر انور کی موت کالی مندر کے بت کی وجہ سے ہوئی تھی تو میری جان بھی خطرے میں تھی کیونکہ میں بھی بت کو چرانے کے لئے انور کے ساتھ کالی مندر میں گیا تھا۔ اگر کالی مندر کا بت انور کی کوٹھڑی سے برآمد ہو جاتا تو پھر بھی میری تسلی ہو جاتی لیکن بت غائب تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ کام انور کے خالہ زاد بھائی کا ہو جس نے انور کو بتایا تھا کہ کالی مندر میں زیورات دفن ہیں۔ ہو سکتا ہے رات کے وقت وہ چھپ کر ہمارا تعاقب کرتا رہا ہو اسے معلوم



ہو گیا ہو کہ میں اور انور سونے کا بت نکال کر لے آئے ہیں اور اسے انور اپنی کوٹھڑی میں لے گیا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے کسی ساتھی کو لے کر انور کی کوٹھڑی میں آ گیا ہو یا اکیلا ہی انور کی کوٹھڑی میں گھس گیا ہو اور اسے جگا کر سونے کے بت کی بابت بات کی ہو انور نے انکار کیا ہو اور کہا ہو کہ اس کو کالی مندر سے کچھ نہیں ملا۔ دونوں کی تکرار ہو گئی ہو اور انور کے خالہ زاد بھائی نے تلاشی لیتے ہوئے سرہانے کے نیچے سے بت نکال لیا ہو۔ اس کے بعد دونوں کی ہاتھا پائی ہوئی ہو اور اس کے خالہ زاد بھائی نے اسی بت سے اس کا سر کچل دیا ہو اور بت لے کر فرار ہو گیا ہو۔

مجھے یقین ہو گیا کہ ایسا ہی ہوا ہو گا ورنہ اگر کوئی دشمن انور کا سر ہتھوڑے سے کچل کر فرار ہوتا تو سونے کا بت اس کے سرہانے کے نیچے موجود ہونا چاہئے تھا جو نہیں تھا۔ میرے ذہن میں کالی مندر کے بت کے بارے میں جو طرح طرح کے اندیشے پیدا ہو رہے تھے وہ اس کے بعد غائب ہو گئے اور میں مطمئن ہو گیا کہ یہ کام کسی بدروح کا نہیں ہے بلکہ انور کا خون اس کے خالہ زاد بھائی نے یا اس کے کسی ساتھی نے ہی کیا ہے۔

میرے اندیشے تو ختم ہو گئے تھے لیکن انور کی موت کا مجھے بہت افسوس ہوا تھا۔ یہ خون سونے کے بت کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ اب اس سینما ہاؤس سے میرا دل اچاٹ ہو گیا اور کچھ روز بعد ہی میں نے سینما کی نوکری چھوڑ دی۔ میں پڑھا لکھا تھا۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ سینما کی نوکری تو اس لئے کر لی تھی کہ اس وقت کوئی اچھی نوکری ملنی مشکل تھی۔ افراتفری کا زمانہ تھا۔ مہاجرین آ رہے تھے ابھی لوگ اپنی اپنی جگہوں پر جم کر نہیں بیٹھے تھے۔

اب پاکستان بنے ڈیڑھ سال گزر گیا تھا۔ حالات بہتر ہونے لگے تھے۔ کاروبار بھی شروع ہو گئے تھے۔ مجھے لاہور ہی میں ایک انشورنس کمپنی کے دفتر میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ میں نے دفتر کے پچھواڑے میں ایک کٹڑی میں ایک کمرہ کرائے پر لے

لیا اور خاموشی سے اپنے کام میں لگ گیا۔

انور کی موت کو دو مہینے گزر گئے تھے۔

میرا سارا دن اپنے آفس میں گزر جاتا۔ دفتر سے فارغ ہونے کے بعد میں کبھی محلے کے ایک ریستوران میں چائے پینے بیٹھ جاتا اور کبھی موسم اچھا ہوتا تو سیر کرنے جناح باغ کی طرف نکل جاتا۔

روہت گڑھ کے پرانے قلعے کی حویلی کی حسین و جمیل بدروح روہنی عرف سلطانہ اور اس کے اور میرے دشمن زرد پوش پجاری رگھو کی خوفناک یادیں اب میرے دل و دماغ سے محو ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک سے واسطہ پڑے ایک طویل مدت گزر چکی تھی۔ لگتا تھا کہ ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے درمیان پاسپورٹ ویزا سسٹم رائج ہو چکا تھا اور بغیر ویزا پاسپورٹ کے بارڈر کراس کرنے والے کو پکڑ کر جیل بھیج دیا جاتا تھا۔

بھارت کا رویہ اس معاملے میں ایک دشمن ملک کے رویئے جیسا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھارت کو پاکستان کے بن جانے کا بے حد صدمہ تھا اور وہ شروع دن ہی سے کبھی کھل کر اور کبھی اندر ہی اندر پاکستان سے دشمنی کرنے لگا تھا۔ کشمیر پر اپنی فوج بھیج کر اس نے غاصبانہ قبضہ کر لیا۔ کشمیری اپنا حق خود ارادی اور بھارتی تسلط سے آزادی حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور بھارتی حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں ظلم و تشدد کا سلسلہ شروع کر دیا جو اس وقت تک جاری ہے۔ چنانچہ بھارت میں اگر کوئی بھارتی مسلمان بھی بارڈر ایریا کے قریب چلتا پھرتا نظر آ جاتا تھا تو اسے پاکستانی جاسوس کہہ کر گرفتار کر لیا جاتا تھا اور پھر اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں گیا۔

میرا بچپن کا دوست جمشید ابھی تک بمبئی میں ہی تھا اور وہیں اپنا کاروبار کر رہا تھا۔



اس نے کئی بار بلایا کہ بمبئی آ کر اسے مل جاؤں۔ میں نے اسے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ پاسپورٹ بنوا لوں پھر ویزا لگوا کر دو ایک دن کے لئے آ جاؤں گا۔ میری صحت پہلے سے اچھی ہو گئی تھی۔ جسم بھر گیا تھا۔ امرتسر میں میری شادی میری کم عمری میں ہی ہو گئی تھی اور چند ایک سال کے بعد یہ ڈرامہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اپنے آفس کے ہیڈ کلرک سے میری سلام دعا ہو گئی تھی۔ ایک بار اس نے بھی کہا کہ فیروز! تم برسر روزگار ہو گئے ہو۔ اب شادی کر کے اپنا گھر بسا لو۔ لیکن میری شادی کا تجربہ اس قدر تلخ تھا کہ مجھے شادی کے نام سے ہی نفرت ہو گئی تھی۔ عورتوں سے الٹی سیدھی دوستی کرنے کا مجھے کبھی شوق نہیں رہا تھا۔ بس اکیلا زندگی بسر کر رہا تھا اور اسی میں ہی خوش تھا۔

صرف اتنی تفریح کر لیتا تھا کہ کبھی کبھی پلازا یا ریگل سینما میں انگریزی فلم دیکھنے چلا جاتا تھا۔ مجھے انگریزی کی مار دھاڑ والی فلمیں دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ انور کے قتل ہو جانے کے بعد میں نے کسی کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ تنہا زندگی بسر کر رہا تھا اور اس میں بڑا خوش تھا۔

ایک رات ایسا ہوا کہ سردیوں کا موسم تھا۔ میں رات کے وقت اپنے کمرے میں لحاف اوڑھ کر ایک جاسوسی ناول پڑھ رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ بند تھا۔ میں نے اندر سے کنڈی لگا رکھی تھی۔ میرے سرہانے کی جانب دیوار والا بلب روشن تھا اور میں پلنگ پر نیم دراز ناول پڑھنے میں محو تھا۔ باہر کٹڑی میں خاموشی تھی ویسے بھی ابھی آبادی کا سیلاب نہیں آیا تھا۔ شام ہونے کے بعد لاہور کی سڑکوں پر ٹریفک بہت ہی کم ہو جاتی تھی اور سردیوں میں تو رات دس گیارہ بجے تک سڑکیں خاموش ہو جاتی تھیں۔ یہی حالت اس رات کٹڑی کی اور کٹڑی کے باہر والی سڑک کی تھی۔ میں جاسوسی ناول کی فضاؤں میں کھویا ہوا تھا کہ اچانک مجھے کمرے میں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے ناول پر سے نگاہیں ہٹا کر کمرے کا جائزہ لیا۔

دروازہ میں نے اندر سے چٹخنی لگا کر بند کیا ہوا تھا۔ وہاں کسی دوسرے شخص کی موجودگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے اسے محض اپنا وہم خیال کیا اور دوبارہ ناول کے مطالعے میں کھو گیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے کسی کے قدموں کی آہٹ سی سنائی دی۔ میں دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ مجھے ایسے لگا جیسے باہر جو چھوٹی سی راہداری تھی وہاں کوئی دبے پاؤں چلتے چلتے دروازے کے پاس آکر رک گیا ہے۔ میں بند دروازے کی طرف مسلسل تک رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر محلے کا کوئی شخص مجھ سے ملنے آیا ہے تو وہ ابھی دستک دے گا۔ لیکن ایک تو کٹڑی میں میری سلام دعا کے علاوہ کسی سے کوئی دوستی نہیں تھی دوسرے رات کے گیارہ بجے اتنی سردی میں مجھ سے ملنے کون آسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی میں دستک کی آواز کا انتظار کرتا رہا۔ دو تین منٹ گزر گئے۔ کسی نے دروازے پر دستک نہ دی تو میں نے اسے بھی اپنا وہم سمجھا اور ایک بار پھر ناول کا مطالعہ کرنے لگا۔

اس کے بعد مجھے پڑھتے پڑھتے نیند آنے لگی۔ میں نے ناول ایک طرف رکھا۔ دیوار والے بلب کے تار کا سوئچ میں نے اپنے سرہانے کے پاس لگوا رکھا تھا۔ میں نے سوئچ دبا کر بتی بجھائی اور لحاف اوپر کر کے لیٹ گیا۔ نیند سے میری آنکھیں اپنے آپ بند ہونے لگیں۔ میں ابھی پوری طرح سویا نہیں تھا، نیند اور عالم بیداری کی درمیانی حالت میں ہی تھا کہ اچانک مجھے کسی کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی کمرے میں داخل ہوا ہو اور میرے پلنگ کے پاس آکر ٹھہر گیا ہو۔

میری نیند ایک دم جیسے غائب ہو گئی اور بدن میں خوف کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ لحاف سے میں نے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ لحاف منہ سے ہٹا کر بتی جلا کر دیکھوں کہ کمرے میں کون ہے۔ پھر مجھے کمرے میں وہی پراسرار خوشبو محسوس ہوئی جو روہت گڑھ کے قلعے والی پرانی حویلی میں پہلی بار محسوس ہوئی تھی۔ مجھے ایک دم سے پرانے قلعے والی حسین بدروح کا خیال آگیا۔ میں



نے جلدی سے لحاف منہ سے ہٹا دیا۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر کسی کے سرد آہ بھرنے کی آواز آئی۔ میں نے ہاتھ پیچھے کر کے کمرے کی بتی کا سوئچ آن کر دیا۔

کمرے میں روشنی ہو گئی۔ مگر کمرہ بالکل خالی تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یا خدا یہ کیا معاملہ ہے۔ کہیں وہی منحوس ڈرامہ پھر سے تو شروع نہیں ہو گیا۔ میں نے پانچ مرتبہ کلمہ شریف پڑھ کر اپنے جسم پر پھونک ماری اور دعا مانگ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے بتی نہیں بجھائی تھی۔ کمرے میں روشنی ہی رہنے دی تھی اور لحاف میں نے منہ کے اوپر نہیں کیا تھا۔ بس کبھی آنکھیں بند کر لیتا اور کبھی ڈر کے مارے آنکھیں کھول دیتا۔ اچانک مجھے اپنے سر کے نیچے کچھ گرمی سی محسوس ہوئی۔ اس زمانے میں ابھی فوم کے گدوں اور سرہانوں کا رواج نہیں چلا تھا۔ لوگ روئی دار گدے اور سرہانے استعمال کرتے تھے۔ میں نے یہی خیال کیا کہ یہ روئی دار سرہانے کی اپنی گرمائش ہے جو میرے جسم کی حرارت سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ سرہانے کی گرمی میں اضافہ ہو رہا ہے جیسے سرہانے کے اندر کسی نے گرم پانی کی بوتل رکھ دی ہو۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ لحاف پرے کر کے میں میں سرہانے کو غور سے دیکھا۔ عام قسم کا معمولی سرہانہ تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ رکھا تو میرا ہاتھ بھی گرم ہو گیا۔ میں نے جلدی سے ہاتھ ہٹا دیا پھر میں نے سرہانے کو بھی ہٹا دیا۔ یہ دیکھ کر خوف کے مارے میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی کہ سرہانے کے نیچے کالی مندر والا سونے کا بت پڑا تھا۔

میں اچھل کر پلنگ سے اتر گیا اور غور سے سنہری بت کو تکنے لگا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ بات ہی ایسی ہوئی تھی۔ میں حیران تھا کہ کالی مندر کا بت یہاں میرے سرہانے کے نیچے کہاں سے آگیا ہے۔ یہاں اسے کس نے رکھ دیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں ہمت کر کے آگے بڑھا اور سونے کے بت کو ہاتھ سے

چھوا۔ بت سخت گرم تھا جیسے ابھی ابھی کسی نے اسے آگ میں سے نکالا ہو۔

یا اللہ! یہ کیا مصیبت شروع ہو گئی ہے۔

میں پلنگ سے دو قدم پیچھے ہٹ کر حیران پریشان کھڑا تھا اور کالی مندر کے بت کو تک رہا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں یہ بت آج کل کے کوکا کولا کی بوتل کے سائز کا تھا۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کی جگہ دو گڑھے پڑے ہوئے تھے۔ منہ کی جگہ ایک چوکور گڑھا بنا ہوا تھا جس میں اوپر کی جانب دو نوکیلے دانت اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ اس بت کی شکل صورت کافی خوفناک تھی۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ بستر پر لیٹ نہیں سکتا تھا کمرے سے باہر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ سوچا یہی ہو سکتا ہے کہ اس منحوس بت کو کسی چیز سے پکڑ کر کمرے سے باہر پھینک آؤں۔ میں کمرے میں کوئی چیز دیکھنے لگا۔

اچانک مجھے ایسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز آئی جیسے کوئی مگر مچھ غصے میں پھنکار رہا ہو۔ میں نے پلٹ کر بت کو دیکھا۔ اس لمحے واقعی میرے پاؤں ایک ایک من بھاری ہو گئے۔ بھاگنا چاہتا تھا مگر زمین میرے پاؤں نہیں چھوڑ رہی تھی۔ ایک انچ بھی میرے پاؤں اپنی جگہ سے نہیں ہل رہے تھے۔ کالی مندر کا بت میرے سرہانے والی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ اب وہ آہستہ آہستہ سیدھا ہو رہا تھا۔ میرے جسم میں سے بھاگنے کی طاقت بھی ختم ہو گئی تھی۔ بت بالکل سیدھا ہو گیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ بلند ہونے لگا۔ بلند ہوتے ہوتے وہ کمرے کی چھت کے قریب پہنچ گیا۔ میں اسے دیکھ رہا تھا اور اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح کمرے سے بھاگ جاؤں مگر میرے پاؤں میری کوشش کے باوجود اپنی جگہ سے نہیں ہل رہے تھے۔ بت ایک جگہ پہنچ کر ایک لمحے کے لئے رک گیا۔ اس کے چہرے کا رُخ میری طرف تھا۔ اچانک بت کی آنکھوں کے گڑھوں میں سے سرخ روشنی نکلنے لگی۔ پھر ایسی آواز گونج اٹھی جیسے اچانک تیز آندھی چلنے لگی ہو۔ بت بڑی تیزی سے



میری طرف آیا جیسے کسی نے اس کو ہاتھ میں تھام رکھا ہو اور پوری طاقت سے میرے سر کا نشانہ لے کر میری طرف پھینک دیا ہو۔ میں نے گھبرا کر اپنا سر نیچے کر لیا۔ بت ایک شوکر کی آواز کے ساتھ میرے سر کے اوپر سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ ایک بار پھر میری طرف آیا۔

میں اپنی جگہ سے حرکت تو نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے نیچے کو جھک کر اپنے سر کو بچا لیا۔ جب تیسری بار بت میرے سر کا نشانہ لے کر میری طرف آیا تو ایک چیخ کی آواز بلند ہوئی اور میرے دیکھتے دیکھتے کالی مندر کا بت فضا میں ہی غائب ہو گیا۔ جیسے ہی بت غائب ہوا میرے پاؤں ہلکے ہو گئے۔ زمین نے میرے پاؤں چھوڑ دیئے۔ میں نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کمرے کے باہر ایک تنگ راہ داری تھی جس کے آگے کٹڑی کا صحن آ جاتا تھا۔ صحن میں چاروں طرف کوٹھڑیاں اور کمرے بنے ہوئے تھے جہاں نوکر پیشہ اور محنت کش لوگ رہتے تھے۔ سرد رات میں صحن خالی پڑا تھا۔ میں دوڑتا ہوا صحن میں سے نکل کر باہر سڑک پر آ گیا۔ سڑک کے کنارے ایک چبوترہ تھا جہاں دن کے وقت ایک چھابڑی والا بیٹھا کرتا تھا۔ میں چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سخت سردی میں بھی میرا جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔

دیر تک وہیں چبوترے پر بیٹھا سوچتا رہا کہ کمرے میں واپس جاؤں یا نہ جاؤں۔ اب مجھے سردی بھی لگنے لگی تھی۔ جو کچھ میں نے کمرے میں دیکھا تھا اُس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب مجھ پر انور شاہ کی موت کا راز کھل گیا تھا۔ اسے کالی مندر کے بت نے ہی قتل کیا تھا اور اب وہ مجھے قتل کرنا چاہتا تھا کہ کسی غیبی طاقت نے مجھے بچا لیا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ سردیوں کی رات تھی۔ سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ میں سردی سے ٹھٹھرنے لگا تھا۔ کیونکہ میں بستر سے نکلا تھا اور میں نے صرف قمیض پاجامہ ہی پہنا ہوا تھا۔ جب سردی میرے لئے ناقابل برداشت ہو گئی تو میں چبوترے سے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چلا۔ کچھ میں نے بھی حوصلہ کیا اور دل کو سمجھایا کہ جس خدا

نے مجھے اس بت کے حملے سے بچایا ہے وہ اب بھی میری حفاظت کرے گا۔

میں اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ آیا تھا۔ کمرے میں بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی باہر راہ داری میں آ رہی تھی۔ میں نے کھلے دروازے میں سے جھانک کر دیکھا۔ کمرہ ویسے کا ویسا ہی تھا جیسے میں اسے چھوڑ گیا تھا۔ میں کلمہ پاک کا ورد کرتا کمرے میں داخل ہو گیا۔ دروازے کو بند کر کے کنڈی لگائی اور وہیں کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہاں کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ میری کتاب اسی طرح پلنگ کے پاس میز پر پڑی تھی۔ سرہانے کو ٹھیک کر کے اس پر سر رکھتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ٹیلی ویژن تو اس زمانے میں نہیں تھا ایک چھوٹا ریڈیو ٹرانسسٹر میرے سرہانے میز پر پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا، اس کو آن کیا اور سوئی گھمانے لگا۔ ایک جگہ کسی سٹیشن پر سے قرآن پاک کی تلاوت ہو رہی تھی۔ میں نے اسی جگہ سوئی رہنے دی اور قرآن پاک کی تلاوت سننے لگا۔

اللہ کے کلام نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ میرا سارا ڈر خوف دور ہو گیا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ میں نے سرہانے کو پلنگ کی پشت کے ساتھ سیدھا لگا دیا اور اس کے ساتھ ٹیک لگا کر پلنگ پر نیم دراز ہو گیا اور بڑے خصوع و خشوع سے کلام پاک کی تلاوت سننے لگا۔ کچھ دیر بعد تلاوت ختم ہو گئی۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا اور بتی بجھائی اور آنکھیں بند کئے بغیر ویسے ہی پلنگ پر نیم دراز ہو کر بیٹھا رہا۔ نیند کے غلبے سے میری آنکھیں بار بار اپنے آپ بند ہو رہی تھیں مگر میں آنکھیں کھلی رکھنے کی جدوجہد میں لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں کب اور کس وقت میری آنکھیں اپنے آپ بند ہو گئیں اور میں سو گیا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب کمرے کے روشندان میں سے دھوپ کمرے میں آ رہی تھی۔ بتی اسی طرح جل رہی تھی۔

میں نے میز پر رکھے ٹائم پیس پر نگاہ ڈالی۔ دن کے دس بج چکے تھے۔ جلدی سے



اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، کپڑے بدلے اور سائیکل پکڑ کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دفتر میں دو گھنٹے لیٹ پہنچا تھا۔ رات کے بھیانک واقعات میری آنکھوں کے سامنے ایک فلم کی طرح چل رہے تھے۔ کسی وقت لگتا میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ کسی وقت لگتا تھا کہ نہیں میں نے حقیقت میں ایسا ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بات طے شدہ تھی کہ میں اب اس کمرے میں نہیں رہ سکتا تھا۔ میرے پاس فوری طور پر رہائش کے لئے کوئی دوسری جگہ نہیں تھی۔ دفتر میں چھٹی کے بعد میں اپنی رہائش گاہ کی طرف جانے کی بجائے باغ جناح میں آ کر بیٹھ گیا۔ ابھی اس باغ کا نام لارنس باغ ہی تھا۔ کچھ دیر میں ایک درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا رہا پھر اٹھ کر باغ کے اوپن ایئر کیفے میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنا پرانا لمبا گرم کوٹ پہن رکھا تھا جس کی وجہ سے میں باغ کی کھلی فضا کی سردی سے کافی محفوظ تھا۔ میں اوپن ایئر کیفے کے برآمدے کی چھت کے نیچے ایک میز کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوائی اور چائے پینے لگا۔

یہی سوچ رہا تھا کہ اگر اپنے کمرے میں نہ گیا تو رات کہاں بسر کروں گا۔ کسی دوسری جگہ کا انتظام دوسرے روز ہی کر سکتا تھا۔ میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ کسی ہوٹل میں کمرہ لے کر رات بسر کر سکتا۔ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد آخر یہی فیصلہ کیا کہ ریلوے سٹیشن پر جا کر رات ویٹنگ روم میں گزارنی چاہئے۔ شام کا اندھیرا باغ میں گہرا ہو رہا تھا۔ میں خاموشی سے اٹھا اور باغ میں سے گزرتا ہوا مال روڈ پر آ گیا۔ وہاں سے ایک بس پکڑی اور ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ ریلوے سٹیشن پر کافی رونق تھی۔ میں نے پلیٹ فارم کا ٹکٹ لیا اور نمبر 4 پلیٹ فارم پر آ گیا۔ اس پلیٹ فارم پر سیکنڈ کلاس کا ویٹنگ روم تھا۔ میں نے ویٹنگ روم میں جھانک کر دیکھا وہ پہلے ہی مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔ اندر جانے کی بجائے پلیٹ فارم پر ہی ایک جگہ بیٹھ گیا۔ رات ہو گئی تھی مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ وہیں چائے کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر تھوڑا بہت کھایا، چائے پی اور ایک بار پھر جا کر ویٹنگ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں

مسافروں نے رات بسر کرنے کے لئے اپنے اپنے بستر بچھا دیئے تھے۔ وہاں بیٹھنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔

مجھے خیال آ گیا کہ ریلوے یارڈ میں خالی بوگیاں بھی کھڑی ہوتی ہیں ان خالی بوگیوں کے کسی ڈبے میں رات بڑی آسانی سے بسر کی جا سکتی ہے۔ یہ سوچ کر میں اس پلیٹ فارم پر آ گیا جس کے آگے ریلوے یارڈ شروع ہو جاتا تھا۔ وہاں ایک طرف کچھ خالی ڈبے کھڑے تھے جن میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پلیٹ فارم بھی رات کی سردی میں دور تک خالی پڑا تھا۔ میں ایک ڈبے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پہلا احساس یہ ہوا کہ ڈبے کی فضا میں ہلکی ہلکی بڑی خوشگوار گرمائش تھی۔ میں نے دوسری طرف کی دو کھڑکیاں نیچے گرا دیں۔ یارڈ کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ یہ انٹر کلاس کا ڈبہ تھا اور سیٹوں پر گدے لگے ہوئے تھے۔ سٹیشن پر رات بسر کرنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مجھے اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ میں ٹانگیں سیدھی کر کے ایک سیٹ پر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔

ڈبے میں اندھیرا تھا۔ دو کھڑکیاں جو میں نے کھول دی تھیں ان میں سے یارڈ کے کھمبوں پر جلتی ہوئی بتیوں کی دھیمی دھیمی روشنی اندر آ رہی تھی۔ میں نے ایک کھڑکی بند کر دی کیونکہ سرد ہوا بھی ڈبے میں آنے لگی تھی۔ کچھ بند ڈبے میں جو فضا تھی وہ نیم گرم تھی یعنی جس کو ہم پنجابی میں نِگ کہتے ہیں فضا میں نِگ تھا۔ افسوس کہ مجھے پنجابی کے لفظ نِگ کا اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں مل سکا جو اس کے مفہوم کو پوری طرح ادا کر دے اس لئے میرے اس لفظ کو ہی قبول کر لیں۔ کچھ میں تھکا ہوا بھی تھا۔ پچھلی رات بھی جاگتا رہا تھا۔ جیسے ہی میں نے سر ڈبے کی دیوار سے لگا کر آنکھیں بند کیں تو مجھے نیند آ گئی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ میں کب تک سویا رہا۔ اچانک ایک دھچکا لگنے سے میری آنکھ کھل گئی۔

مجھے ایسے لگا جیسے ڈبہ چلتے چلتے رک گیا ہے۔ میں نے ڈبے کا جائزہ لیا۔ وہاں



میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ باہر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ پھر ڈبے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی لالٹین ہاتھ میں لئے ڈبے میں داخل ہوا۔ اس نے لالٹین کی روشنی میں مجھے دیکھا تو بولا۔ ''کون ہو بھائی تم؟''

میں اتنی دیر میں سنبھل گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ رات گزارنے کے لئے خالی ڈبے میں آ کر سو گیا ہوں۔

وہ بولا۔ ''مگر یہ بوگی تو راولپنڈی لے جائی جا رہی ہے۔''

میں چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس آدمی سے پوچھا۔ ''یہ کون سا سٹیشن ہے؟''

اس نے کہا۔ ''یہیں اتر جاؤ۔ یہ بادامی باغ کا سٹیشن ہے۔ ہم ڈبے کی چیکنگ کے لئے نہ آتے تو تم پنڈی پہنچ گئے ہوتے۔''

میں جلدی سے ڈبے میں سے اتر گیا۔

پلیٹ فارم پر جو مسافر ٹرین کھڑی تھی یہ بوگی اس کے آخر میں لگی ہوئی تھی۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری آنکھ کھل گئی تھی ورنہ میں خدا جانے کہاں پہنچ جاتا۔ بادامی باغ لاہور شہر کا ایک حصہ ہی تھا۔ میں سٹیشن سے نکل کر پیدل ہی چل پڑا۔ ابھی بادامی باغ کے ارد گرد اتنی آبادی نہیں ہوئی تھی جتنی اب ہو گئی ہے ارد گرد کا علاقہ ویران پڑا تھا۔ جھاڑیاں اور درخت ہی درخت تھے۔ میں اندھیرے میں چلا جا رہا تھا کہ مستی گیٹ کے پاس نکل آؤں گا اور وہاں سے پیدل ہی لاہور ریلوے سٹیشن پر آ جاؤں گا اور باقی کی رات وہیں چل پھر کر گزاروں گا اور صبح وہیں سے اپنے دفتر چلا جاؤں گا۔

اُس زمانے میں بادامی باغ کے سٹیشن کے قریب ہی ایک ویران سی جگہ پر ایک پرانا قبرستان ہوا کرتا تھا۔ معلوم نہیں اب یہ قبرستان ہے یا نہیں ہے۔ جو چھوٹا سا کچا راستہ درختوں اور جھاڑیوں سے ہو کر مستی دروازے والی سڑک کی طرف جاتا تھا یہ پرانا قبرستان وہیں دائیں جانب آتا تھا۔ میں قبرستان کے قریب سے گزر رہا تھا کہ

قبروں میں سے ایک عورت کو دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ میں واقعی ڈر گیا کہ یہ عورت کوئی بدروح ہی ہو سکتی ہے۔ وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی۔ میرے پاس آتے ہی اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ اگر میں اپنے ہوش و حواس کو قابو میں نہ رکھتا تو ضرور میری چیخ نکل جاتی۔

عورت کا سانس پھول رہا تھا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ گورے رنگ کی تھی۔ شلوار قمیض میں تھی۔ سویٹر پہن رکھا تھا۔ اچھی فیملی کی عورت لگتی تھی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کہنے لگی۔ ”بھائی! خدا کے لئے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ میں ڈر گئی ہوں۔“

میں نے پوچھا۔ ”بی بی! کیا بات ہے۔ تم اتنی رات گئے قبرستان میں کیا کر رہی ہو؟“

وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”خدا کے لئے مجھے یہاں سے سڑک پر لے چلو۔ میں سب کچھ بتاتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ اگر تم کوئی بدروح نہیں ہو تو میں تمہیں اپنے ساتھ سڑک پر لئے چلتا ہوں۔“

وہ میرے بائیں جانب آ گئی، یعنی اس جانب جس طرف قبرستان نہیں تھا۔ اس نے ابھی تک میرا بازو تھام رکھا تھا اور سہمی ہوئی میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے کھمبوں کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر سڑک پر آ گیا۔ کہنے لگی۔ ”بھائی! میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔“

میں نے کہا۔ ”بی بی! تمہارا گھر کہاں ہے؟“

عورت نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔ ”ماڈل ٹاؤن میں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ماڈل ٹاؤن تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اس وقت کوئی بس بھی



اُدھر نہیں جاتی اور کوئی تانگہ بھی نہیں ملے گا۔“

اس زمانے میں کوئی رکشہ ٹیکسی تو چلا نہیں کرتی تھی۔ ایک بس ہی تھی جو ماڈل ٹاؤن جایا کرتی تھی۔ کہنے لگی۔ ”وہ سامنے میری کار کھڑی ہے۔ پلیز مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔“

عورت کھاتے پیتے گھرانے کی لگتی تھی۔ گاڑی بھی اس کے پاس تھی۔ اسے ماڈل ٹاؤن اس کے گھر تک چھوڑنے میں کوئی حرج بھی نہیں لگتا تھا اور کوئی ایسی تشویش والی بات بھی نہیں تھی۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بی بی! میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ آتا ہوں۔“

اُس وقت میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس عورت کو ماڈل ٹاؤن چھوڑ کر رات کے تین بجے میں خود لاہور واپس کیسے آؤں گا۔

اسے میری حماقت سمجھ لیں یا یہ سمجھ لیں کہ مجھے اس بات کا خیال ہی نہیں آیا۔ سڑک کی دوسری طرف اس کی سیاہ رنگ کی چھوٹی سی گاڑی کھڑی تھی۔ اس زمانے میں گاڑی کسی کسی کے پاس ہی ہوتی تھی۔ گاڑی پرانے ماڈل کی تھی۔ پتہ نہیں اس کا ماڈل کیا تھا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ والی سیٹ پر بٹھا لیا اور پرس میں سے گاڑی کی چابیاں نکال کر گاڑی سٹارٹ کی اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔ کہنے لگی۔ ”بھائی صاحب! اس وقت اگر آپ میری مدد نہ کرتے اور مجھے دیکھ کر ڈر کر بھاگ جاتے تو میں وہیں بے ہوش ہو کر گرنے والی تھی۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”بی بی! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ رات کے ڈھائی تین بجے تم اس قبرستان میں کیا کر رہی تھیں؟“

گاڑی چلاتے چلاتے اس عورت نے پرس میں سے چھوٹا سا رومال نکال کر اپنی آنکھیں پونچھیں۔ معلوم ہوا کہ میرے اس سوال پر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کہنے لگی۔ ”بھائی جان! میں بڑی بدنصیب عورت ہوں۔ میرا خاوند فوت ہو چکا

ہے۔ میری ایک ہی جوان بیٹی تھی۔ پاکستان پہنچنے کے کچھ ہی دن بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس وقت ہم بادامی باغ سٹیشن کے پاس ایک مہاجر کیمپ میں تھے۔ میرے ساتھ کچھ رشتے دار بھی تھے۔ میں نے اپنی بیٹی کو وہیں بادامی باغ کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ مشرقی پنجاب میں ہم لوگ دو تین حویلیاں اور کچھ زمین چھوڑ کر آئے تھے۔ ان کے کلیم میں مجھے ماڈل ٹاؤن میں ایک چھوٹی سی کوٹھی الاٹ ہو گئی۔ میری خالہ اور اس کے بچے بھی میرے ساتھ ہی رہنے لگے۔ پھر ایسا ہوا کہ میرے خالو کو لندن میں ایک ملازمت مل گئی اور وہ میری خالہ اور بال بچوں کو لے کر پاکستان سے لندن چلے گئے۔ میں دو نوکروں کے ساتھ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں اکیلی رہنے لگی۔ جھنگ میں تھوڑی سی زمین بھی الاٹ ہو گئی تھی۔ وہاں سے ہر فصل پر کچھ پیسے اور گندم وغیرہ آ جاتی تھی اور میرا گزارہ ہو رہا تھا۔ شروع شروع میں میں ہر جمعرات کو اپنی بیٹی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے بادامی باغ والے قبرستان میں جایا کرتی تھی۔ قبر پر گلاب کے ہار ڈالتی، اگربتیاں سلگاتی اور بیٹھ کر فاتحہ پڑھتی اور اپنی بیٹی کی مغفرت کے لئے دعا مانگتی۔ لیکن پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا میرے اس معمول میں وقفہ آتا گیا۔ اب میں کبھی ایک جمعرات اور کبھی دو ہفتے چھوڑ کر بیٹی کی قبر پر جاتی۔ پھر اس میں بھی کافی وقفے آنا شروع ہو گئے اور میرا کبھی ایک مہینے اور کبھی دو مہینوں کے بعد بیٹی کی قبر پر جانا ہوتا۔ کل رات میں سو رہی تھی کہ خواب میں میری بیٹی آئی۔ کہنے لگی اماں! تم نے مجھے بھلا دیا مگر میں تمہیں یاد کرتی رہتی ہوں.....“

اتنا کہہ کر گاڑی چلاتے چلاتے عورت سسکیاں بھر کر رونے لگی۔ پھر جلدی ہی سنبھل کر اس نے رومال سے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگی۔ ”معاف کرنا بھائی جان! خدا کسی کو جوان بیٹی کا غم نہ دکھائے۔ اور میری بیٹی سکینہ تو مجھے بہت ہی پیاری تھی۔ ابھی تو اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔“

وہ گہری آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔ میں بھی اداس ہو گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں



کہ غیر شادی شدہ جوان بیٹی کی موت کا غم کیا ہوتا ہے۔ اسے ایک ماں کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا؟“

اس دوران ہم ماڈل ٹاؤن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اتنی جلدی ہم ماڈل ٹاؤن اس لئے بھی پہنچ گئے تھے کہ ایک تو رات کا وقت تھا دوسرے اس زمانے میں سڑکوں پر دن کے وقت ٹریفک بہت معمولی ہوتا تھا اور رات کو تو خاص طور پر ماڈل ٹاؤن جانے والی سڑک سنسان پڑی ہوتی تھی۔ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھیاں ابھی پرانے ٹائپ کی تھیں اور اُسی حالت میں تھیں جس حالت میں وہاں سے جانے والے انہیں چھوڑ گئے تھے۔ ہر کوٹھی کا وسیع و کشادہ لان تھا۔ ان میں جامن اور آم کے درخت اگے ہوئے تھے اور دن کے وقت بھی ان پرانی کوٹھیوں پر ایک پراسرار سی خاموشی چھائی رہتی تھی۔ رات کے وقت تو یہاں ایک سکوت سا طاری رہتا تھا۔ میرے سوال پر وہ عورت کہنے لگی۔ ”ہمارا مکان آ گیا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات میں آپ کو مکان میں جا کر سناؤں گی۔ آپ پلیز میرے ساتھ مکان میں چلیں گے نا؟ میں نے قبرستان میں ایسی خوفناک بات دیکھی ہے کہ میں ابھی تک خوف زدہ ہوں۔“

میں نے سوچا کہ اس وقت ویسے بھی مجھے واپس جانے کے لئے کوئی بس نہیں ملے گی۔ رات بھی تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اس عورت کے مکان میں باقی کا وقت گزار دیا جائے۔ دن نکلتے ہی بسیں چلنا شروع ہو جائیں گی تو یہاں سے سیدھا اپنے آفس چلا جاؤں گا۔

گاڑی رات کی تاریکی میں ایک اونچے درختوں والی پرانی سی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہو کر ایک بغیر دروازے کے گیراج میں جا کر رک گئی۔ عورت نے انجن بند کرتے ہوئے میری طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”پلیز! میرے ساتھ اندر آ جائیں۔ دونوں نوکر اس وقت سو رہے ہوں گے مجھے اکیلی کو بہت ڈر لگے گا۔ دن نکلتے ہی میں آپ کو خود گاڑی میں چھوڑ آؤں گی۔“

میں پہلے ہی اس کے ساتھ کوٹھی کے اندر تھوڑا سا وقت گزارنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے بی بی۔''

وہ مجھے کوٹھی کے اندر ایک کمرے میں لے آئی۔ پرانے زمانے کی کوٹھی کا ڈرائنگ روم تھا۔ چھت اونچی تھی، بھاری بھرکم بوسیدہ سے صوفے پڑے تھے۔ فرش پر میلا سا قالین بچھا ہوا تھا۔ درمیان میں پرانے فیشن کی چھوٹی گول میز رکھی ہوئی تھی جس پر نیلا غلاف پڑا تھا۔ میز کے درمیان ایک گلدان میں کاغذی پھول سجائے ہوئے تھے۔ دروازوں پر لکڑی کی بریکٹوں میں پروئے ہوئے لمبے پردے لٹک رہے تھے۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا صرف ایک بلب روشن تھا۔ کمرے کی فضا میں ہلکی ہلکی سیلن کی بو رچی ہوئی تھی۔ باہر بڑی سخت سرد رات تھی مگر ڈرائنگ روم کی فضا ہلکی ہلکی گرم تھی۔ میں صوفے پر اپنے لمبے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت بار بار میرا شکریہ ادا کر رہی تھی کہ میں اس کے مکان میں اس کی دلجوئی کی خاطر اس کے ساتھ آیا ہوں۔ اس نے پرس میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''بھائی جان! نوکر سو رہے ہیں۔ میں خود چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

اگرچہ مجھے اس وقت چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی مگر میں نے اسے روک دیا۔ ''نہیں بی بی! چائے کی ضرورت نہیں ہے۔''

وہ بولی۔ ''بھائی جان! ابھی صبح ہونے میں ایک گھنٹہ باقی ہے۔ میرے سونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ نے بھائی بن کر ایک بہن کی جس طرح دلجوئی کی ہے میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ مجھے اتنی اجازت ضرور دیں کہ میں آپ کے لئے خود چائے بنا کر پیش کر سکوں.....''

میں نے کہا۔ ''اگر آپ اصرار کرتی ہیں تو ٹھیک ہے۔''

''خدا آپ کو خوش رکھے۔'' یہ کہہ کر وہ عورت ایک دروازے کا پردہ ہٹا کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے سر صوفے کی پشت سے لگا دیا۔ نیند



مجھے بھی نہیں آ رہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح مجھے وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹہ گزارنا تھا اس کے بعد صبح ہو جانی تھی اور ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کی بسیں ماڈل ٹاؤن سے لاہور کی جانب چلنے لگنی تھیں۔ مجھے دوسرے کمرے سے برتن رکھنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں یہ بھی چاہتا تھا کہ یہ عورت جلدی سے آ جائے اور یہ بتائے کہ قبرستان میں اس کے بعد کیا ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ شاید اس کے ساتھ یہی ہوا ہو کہ اسے اپنی بیٹی کی قبر یا کسی دوسری قبر میں سے آتی کوئی ڈراؤنی آواز سنائی دی ہو اور وہ ڈر کر بھاگ گئی ہو۔ اتنے میں دروازے کا بھاری پردہ ہٹا اور وہ عورت نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا سٹیل کا ٹرے تھا جس میں دو پیالیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کہنے لگی۔ ''جلدی جلدی چائے بنا کر لے آئی ہوں۔ خدا کرے میرے بھائی کو پسند آ جائے۔''

وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی اور ایک پیالی میرے سامنے میز پر رکھ دی اور دوسری پیالی خود اٹھا لی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ وہ چائے کا ہلکا سا گھونٹ لینے کے بعد بولی۔ ''پیارے بھائی! اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یاد کر کے میری روح کانپ جاتی ہے..... ایسا ہوا کہ میں نے اپنی بیٹی کی قبر پر جا کر پھولوں کے ہار ڈالے، دو اگربتیاں سلگائیں اور دعا مانگنے لگی۔''

اچانک میرے دل میں ایک سوال اٹھا۔ میں نے اس سے پوچھ ہی لیا۔ میں نے پوچھا۔ ''لیکن آپ آدھی رات کے بعد قبر پر کیوں گئیں۔ آپ دن کے وقت بھی تو جا سکتی تھیں۔''

اس کے جواب میں وہ کہنے لگی۔ ''اب میں سوچتی ہوں کہ میری بیٹی نے خاص طور پر مجھے آدھی رات کے بعد اپنی قبر پر آنے کے لئے کیوں کہا تھا۔ در حقیقت وہ مجھے ایک ایسا سبق سکھانا چاہتی تھی جو ساری زندگی میرے لئے درسِ عبرت بنا رہے۔ جب میری بیٹی کل رات میرے خواب میں آئی تھی تو اس نے یہ بات خاص طور پر مجھے بڑی تاکید کر کے کہی تھی کہ میں اس کی قبر پر اب جب بھی آؤں آدھی رات

کے بعد آؤں۔ اس لئے میں آج آدھی رات کے بعد گئی تھی۔ ورنہ میں عام طور پر جمعرات کو دن کے وقت ہی جایا کرتی تھی۔“

میں بڑے غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ چائے کی پیالی میرے سامنے میز پر اسی طرح پڑی تھی اور میں اس عورت کی خوفناک کہانی سننے میں اس قدر محو تھا کہ مجھے چائے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بھائی جان چائے پیجئے نا۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

”اوہ..... شکریہ!“ میں نے چائے کی پیالی اٹھالی اور اس کا ہلکا سا گھونٹ بھرا۔ چائے کا ذائقہ بڑا خوشگوار تھا۔ اس میں سے الائچی کی ہلکی ہلکی خوشبو آ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”آپ نے ضرور محسوس کیا ہو گا کہ اس میں الائچی کی خوشبو ہے۔ دراصل میں چائے میں ہمیشہ ایک الائچی ڈال لیا کرتی ہوں۔ ہمارے مرشد نے جب میں ابھی دسویں جماعت میں پڑھتی تھی تو میری والدہ کو ہدایت کی تھی کہ اس لڑکی کو جب بھی چائے یا دودھ پلاؤ اس میں بسم اللہ پڑھ کر ایک الائچی ضرور ڈال دیا کرو۔ میری والدہ اس کے بعد ہمیشہ میری چائے یا گرم دودھ میں الائچی ڈال دیا کرتی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد جب میری شادی ہو گئی تو میں نے اس روایت کو اب تک قائم رکھا ہوا ہے۔ اگر آپ کو ذائقہ اچھا نہیں لگا تو میں دوسری چائے بنا کر لے آتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ الائچی سے تو چائے کا ذائقہ بڑا خوشگوار ہو گیا ہے۔ آپ یہ سنائیں کہ پھر کیا ہوا؟“

پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بے چاری غم زدہ ماں کا کچھ تو غم ہلکا ہوا۔ کہنے لگی۔ ”آپ ساتھ ساتھ چائے بھی پیتے جائیں۔ میں ہمیشہ گرم چائے پیتی ہوں۔ چائے ٹھنڈی ہو جائے تو شربت بن جاتی ہے۔“

میں نے بھی اس کے سامنے پہلی بار مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو آپ ٹھیک کہتی



ہیں۔“

اور میں چائے کا ایک اور گھونٹ بھر کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میں بیٹی کی قبر پر بیٹھی فاتحہ پڑھنے کے بعد اس کی مغفرت کے لئے دعا مانگنے لگی۔ قبرستان میں بڑی ڈراؤنی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات کے وقت میں کبھی قبرستان میں نہیں آئی تھی۔ مجھے بڑا ڈر لگ رہا تھا۔ لیکن یہ خیال کہ میں اپنی بیٹی کی قبر پر بیٹھی ہوں مجھے حوصلہ دے رہا تھا۔ اس کے باوجود قبرستان قبرستان ہی ہوتا ہے۔ کسی وقت لگتا کہ کوئی میرے پیچھے آ کر چپکے سے کھڑا ہو گیا ہے۔ میں دُعا مانگتے مانگتے نہ چاہتے ہوئے بھی پیچھے دیکھ لیتی۔ پیچھے سوائے درختوں، جھاڑیوں اور رات کے اندھیرے میں دھندلی قبروں کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ کسی وقت ایسے محسوس ہوتا جیسے کوئی روح میرے قریب سے ہو کر گزر گئی ہو۔ دہشت کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ پھر ایسا ہوا کہ.....“

وہ رُک گئی اور چائے پیتے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کا دیکھنا کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔ میں نے بھی چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بڑے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔ ”ایسا کیا ہوا؟“

اس نے کہا۔ ”پھر ایسا ہوا کہ مجھے اپنی بیٹی سکینہ کی آواز سنائی دی۔“

مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ ”مگر آپ کی بیٹی تو فوت ہو چکی تھی۔ پھر اس کی آواز کہاں سے آ گئی؟“

وہ بڑے سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ”یہی سوچ کر میں حیران ہوئی تھی۔ پہلے تو خیال آیا کہ یہ میرا وہم ہے۔ مرے ہوؤں کی آوازیں نہیں آیا کرتیں۔ لیکن جب دوسری اور تیسری بار وہی آواز سنائی دی تو مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ میری بیٹی مجھے آواز دے رہی ہے۔“

میں اس کی پُراسرار کہانی میں محو ہو چکا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں

ہم نانی اماں سے چڑیلوں کی کہانیاں سنتے سنتے ان میں کھو جاتے تھے۔ میں نے پوچھا۔

”کیا وہ آپ کا نام لے کر آواز دے رہی تھی؟“

وہ کہنے لگی۔ ”میں آپ کو پورا فقرہ سناتی ہوں جو وہ بول رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ اماں! میرے پاس آ کر مجھے پیار کرو۔ تم تو مجھے بہت پیار کیا کرتی تھیں۔ اماں! میرے پاس آ کر مجھے پیار کرو۔ تم تو مجھے بہت پیار کیا کرتی تھیں.....“

مگر یہ آوازیں کہاں سے آ رہی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے کہا۔ پہلی بار میں نے یہ آواز سنی تو مجھے ایسے لگا تھا کہ جیسے یہ آواز میری دائیں جانب سے آ رہی ہو۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دائیں جانب دیکھا۔ اس طرف کچھ نہیں تھا۔ پھر میں نے بائیں جانب دیکھا۔ اس طرف بھی کچھ نہیں تھا۔ جب تیسری بار آواز آئی تو میری بیٹی نے کہا۔ اماں! میں قبر کے اندر سے بول رہی ہوں۔ مجھے قبر کے اندر آ کر پیار کرو..... خوف کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ جب ایک بار پھر میری بیٹی نے کہا کہ اماں! میں قبر کے اندر سے بول رہی ہوں مجھے قبر کے اندر آ کر پیار کرو تو مجھے ایسے لگا جیسے میرا سارا جسم پتھر کی طرح ساکت ہو گیا ہے۔ میری بیٹی کی آواز ایک بار پھر آئی۔ اس نے کہا۔ اماں! ڈرو نہیں۔ میں قبر میں پھولوں کے بستر پر لیٹی ہوئی ہوں۔ اماں! بے شک مجھے دیکھ لو۔ میں تمہیں اپنا پلنگ دکھاتی ہوں..... میری آنکھیں خود بخود بیٹی کی قبر کی طرف اٹھ گئیں اچانک قبر شق ہو گئی۔ پھٹ کر الگ ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ قبر کے گڑھے کے اندر میری بیٹی گھٹنوں کے بل دوہری ہو کر اس طرح بیٹھی ہے کہ اس کے سر کے لمبے بال کھینچ کر پیچھے اس کے ٹخنوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں اور اس کے سارے جسم کے ساتھ سانپ چمٹے ہوئے ہیں جو اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں..... میرے خدا۔“

اس عورت نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور کانوں کو ہاتھ لگا کر اس نے ایک سسکی بھری اور بولی۔ ”اپنی بچی کی یہ حالت دیکھ کر میں ڈر بھی گئی اور مجھے بڑا شدید



صدمہ بھی ہوا۔ بس اس کے بعد نہیں معلوم کہ مجھے کیا ہو گیا۔ ایک چیخ میرے حلق سے نکلی اور میں نے اٹھ کر بے اختیار دوڑنا شروع کر دیا۔“

وہ خاموش ہو گئی۔ اس نے ذرا آگے کو ہو کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔

”پیارے بھائی جان! کیا آپ نے کبھی ایسا ڈراؤنا منظر دیکھا ہے؟“

میں نے ساری چائے اس دوران پی لی تھی۔ خالی پیالی ابھی تک میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں اس عورت کی کہانی سننے میں اس قدر کھو چکا تھا کہ مجھے خالی پیالی میز پر رکھنی بھی یاد نہیں رہی تھی۔ میں بھی اس عورت کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ دیکھتے دیکھتے مجھے اس عورت کے دو چہرے نظر آنے لگے۔ مگر یہ دو چہرے نہیں تھے ایک ہی چہرہ تھا جو دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ کسی وقت دونوں چہرے آپس میں مل جاتے اور دوسرے ہی لمحے پھر الگ الگ ہو جاتے تھے۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اپنے آپ ہی دل میں خیال آ گیا کہ یہ کل کی اور آج کی رات کا رتجگا ہے جس کی وجہ سے میرا ذہن نیند نہ لینے کی وجہ سے تھکن سے چور ہو کر مجھے ایک ایک کی دو دو شکلیں دکھانے لگا ہے۔

وہ عورت میری طرف مزید جھک گئی۔ اس نے پھر وہی بات پوچھی۔ ”کیا آپ نے کبھی ایسا ڈراؤنا منظر دیکھا ہے؟“

مجھے آج بھی اچھی طرح سے یاد ہے کہ میں نے کچھ بولنے، کوئی جواب دینے کی کوشش کی تھی مگر میرے ہونٹوں نے اپنی جگہ سے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے اپنے ہونٹ بڑے بھاری محسوس ہونے لگے تھے۔ وہ عورت میرے سامنے بیٹھی میری طرف جھک کر مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ ”بھائی جان! میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے۔ کیا آپ نے کبھی زندگی میں ایسا ڈراؤنا منظر دیکھا ہے؟“

اس وقت میں نے اپنے حلق سے ہونٹوں کو ہلائے بغیر غوں غاں ایسی آواز نکلتی سنی اور اس کے بعد میرا سر بھاری ہونے لگا۔ بھاری ہوتے ہوتے وہ اتنا بھاری ہو گیا

کہ میں اسے سنبھال نہ سکا اور وہ کبھی دائیں اور کبھی بائیں اس طرح اپنے آپ گرنے لگا جیسے آدمی کو اونگھ آجائے تو اس کا سر اپنے آپ ایک طرف کو گر جاتا ہے۔ اس کے بعد مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میرے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی خالی پیالی گر پڑی تھی۔ پھر مجھے کوئی ہوش نہ رہا۔

O



ہوش اس وقت آیا جب میں نے دیکھا کہ میں ایک سٹریچر پر پڑا ہوں۔ میرے دونوں ہاتھ پاؤں رسیوں سے سٹریچر کے ساتھ اس قدر سختی سے بندھے ہوئے ہیں کہ میں انہیں ذرا سا بھی نہیں ہلا سکتا۔ چمڑے کی ایک بیلٹ میرے سینے پر بھی بندھی ہوئی تھی۔ چمڑے کی ایک بیلٹ میرے سر پر اس طرح باندھی گئی تھی کہ میں اپنا سر دائیں، بائیں بالکل نہیں ہلا سکتا تھا۔ میں پوری طرح سے اپنے ہوش و حواس میں واپس آ چکا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جہاں مجھے سٹریچر پر باندھ کر رکھا گیا ہے وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود ہیں۔ مجھے ان کی دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ اوپر چھت پر بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ میں سب کچھ دیکھ رہا تھا مگر میرے ہونٹ اسی طرح پتھر کی طرح سخت اور بھاری تھے اور میں انہیں الگ نہیں کر سکتا تھا۔

مجھے انسانی قدموں کی مدھم چاپ سنائی دی۔ پھر میں نے دیکھا کہ دو عورتیں میرے دائیں اور بائیں آ کر کھڑی ہو گئی ہیں۔ دونوں گورے رنگ کی دراز قد اور بڑی خوبصورت عورتیں تھیں۔ انہوں نے سیاہ لمبے کرتے پہنے ہوئے تھے جن کے گریبان کھلے تھے۔ سر کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ چہروں پر بڑا گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ ان کی سیاہ آنکھوں میں بلی کی آنکھوں کی سی چمک تھی۔ وہ ساکت چہروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں جھک گئیں۔ ان کے لباس سے عجیب سی طلسمی خوشبو آ رہی تھی۔ انہوں نے جھک کر میرے سٹریچر کو سرہانے کے

جانب سے اتنا اوپر اٹھا دیا کہ مجھے سامنے کا منظر نظر آنے لگا۔ میرا سٹریچر سرہانے کی جانب سے ذرا سا اوپر اٹھا کر وہ چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ یہ کسی پرانے ویران محل کا ایک ویران سا کمرہ ہے۔ دیواروں پر کہیں سرخ اور کہیں نیلا روغن پھرا ہوا ہے۔ دیواروں پر ایک دو مزید بجلی کے بلب روشن ہیں۔ دیواروں کے سرخ اور نیلے روغن کی وجہ سے کمرے کی فضا نیم روشن، دھندلی دھندلی اور آسیب زدہ ماحول والی معلوم ہو رہی تھی۔

میرے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر میری ہی طرح کا ایک اور سٹریچر دیوار کے ساتھ پڑا تھا۔ وہ بھی سرہانے کی جانب سے تھوڑا سا اوپر کو اٹھا ہوا ہے۔ بجلی کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ اس سٹریچر پر میری ہی طرح ایک نوجوان لڑکی رسیوں اور چمڑے کی بیلٹوں سے جکڑی ہوئی ہے۔ بلب کی روشنی میں مجھے اس کی کھلی ہوئی آنکھیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وہ بدقسمت لڑکی بھی ہوش میں تھی اور میری طرح وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کمرے کے کونوں میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ کمرے میں سیاہ لبادوں اور کھلے بالوں والی چار پانچ عورتیں اِدھر اُدھر بڑے پراسرار طریقے سے چل پھر رہی تھیں۔

میرے لئے یہ سب کچھ ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ مجھے یہاں کس لئے لایا گیا ہے اور وہ عورت کون تھی جو مجھے بادامی باغ کے قبرستان کے باہر ملی تھی اور اپنی دردناک اور ڈراؤنی کہانی سنا کر مجھے اپنے گھر ماڈل ٹاؤن لے گئی تھی اور پھر اس نے چائے پلا کر مجھے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ عورت مجھے ان عورتوں میں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ عورتیں میرے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھیں۔ آخر مجھے اس طرح سٹریچر پر کیوں جکڑا گیا ہے۔ میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہونٹ ابھی تک بند تھے۔ میں کوشش کے باوجود انہیں ہلانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ شاید یہ اس بے ہوشی کی دوا کا اثر تھا جو چائے میں ملا



کر مجھے اس عیار عورت نے پلا دی تھی۔ میں سامنے چند قدموں کے فاصلے پر ذرا سے اوپر کو اٹھتے ہوئے سٹریچر پر جکڑی ہوئی لڑکی کو دیکھ رہا تھا کہ یہ بھی میری طرح کی کوئی بدقسمت لڑکی ہے جو اس عورت کے پھندے میں آ کر یہاں پہنچا دی گئی ہے۔ مگر یہ سیاہ پوش عورتیں کون تھیں؟ یہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والی تھیں۔ ہمیں یہاں کس لئے لایا گیا تھا۔ وہاں چار پانچ سیاہ پوش عورتیں تھیں۔ وہ سب کی سب جوان تھیں۔ سب کی سب حسین اور خوبصورت تھیں۔ سب نے بڑے گہرے میک اپ کئے ہوئے تھے۔ سب نے بڑے اعلیٰ قسم کے طلسمی خوشبوؤں والے پرفیوم لگا رکھے تھے۔ ان کی خوشبو ساری فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ پانچوں کی پانچوں سیاہ پوش عورتیں کمرے سے چلی گئیں۔

کمرے میں، میں اور لڑکی سٹریچروں پر جکڑے ہوئے اکیلے رہ گئے۔ میں بول نہیں سکتا تھا۔ شاید لڑکی بھی میری طرح نہیں بول سکتی تھی۔ شاید اس کے ہونٹ بھی میرے ہونٹوں کی طرح پتھر بن چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے ضرور پوچھتی کہ یہ لوگ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟ ہمیں سٹریچروں پر کیوں جکڑا گیا ہے؟ ہمیں یہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ مگر میری طرح اس کے ہونٹوں پر بھی سکوت کی مہر ثبت تھی۔ میری طرح وہ بھی صرف دیکھ سکتی تھی بول نہیں سکتی تھی۔ میں نے سوچا کہ میں بول نہیں سکتا لیکن اپنے حلق سے غوں غاں کی آوازیں نکال کر ہی اسے اپنے زندہ ہونے کا یقین دلاؤں۔ میں نے حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی تو سوائے خرخراہٹ کی آواز کے میرے حلق سے اور کوئی آواز نہ نکلی۔ شاید لڑکی کی بھی ایسی ہی حالت تھی۔ چند قدموں کے فاصلے پر میرے سامنے وہ بھی سٹریچر پر جکڑی ہوئی میری طرف بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے مگر بول نہیں سکتی۔

اتنے میں کمرے کے کونے میں جہاں اندھیرا سا تھا چاروں سیاہ فام

عورتیں برآمد ہوئیں۔ انہوں نے ہاتھوں میں شمع دان تھام رکھے تھے۔ ہر شمع دان کے اوپر تین تین موم بتیاں روشن تھیں۔ وہ سیاہ پوش روحوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اسی طرف آ رہی تھیں جہاں میں اور لڑکی سٹریچروں پر جکڑے ہوئے تھے۔ وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ ان کے الفاظ میری سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ قریب آنے کے بعد وہ سیاہ پوش عورتیں لڑکی کے سٹریچر کی طرف چلی گئیں اور اس کے ارد گرد چکر لگانے لگیں۔ دو سیاہ پوش عورتیں میرے سٹریچر کے گرد چکر لگانے لگیں۔ وہ قدم قدم چل کر منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ایسے چکر لگا رہی تھیں جیسے کوئی طلسمی عمل کر رہی ہوں۔ مجھے ان کی سرگوشیوں ایسی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کیا پڑھ رہی تھیں یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے گرد چھ سات چکر لگانے کے بعد وہ ایک قطار میں ہو گئیں اور کمرے کے دوسرے کونے کی طرف چلی گئیں۔ میں گردن تو نہیں گھما سکتا تھا صرف آنکھیں گھما کر جس قدر دیکھ سکتا تھا انہیں دیکھ رہا تھا اور دل میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہا تھا کہ خدا جانے یہ میرے ساتھ کیا کرنے والی ہیں۔

کمرے کے دوسرے نیم روشن کمرے میں جا کر انہوں نے شمع دان دیوار کے ساتھ بنے ہوئے مینٹل پیس پر رکھ دیئے اور شمع دانوں میں جلتی موم بتیوں کے آگے سر جھکا کر کچھ دیر تک ساکت کھڑی رہیں۔ پھر واپس پلٹ کر ہماری طرف بڑھنے لگیں۔ جب وہ ذرا قریب آئیں تو یہ دیکھ کر میری روح لرز اٹھی کہ ان میں سے ہر سیاہ پوش عورت کے ہاتھ میں چمکتی ہوئی دھار والا خنجر تھا۔ خنجر انہوں نے ایسے پکڑ رکھا تھا جیسے کسی کے پیٹ میں گھونپنے جا رہی ہوں۔ انہوں نے ایسے سر جھکا رکھے تھے جیسے وہ کوئی بڑی مقدس رسم ادا کر رہی ہوں۔ وہ سب سے پہلے لڑکی کے سٹریچر کی طرف گئیں۔ چاروں عورتیں لڑکی کے سٹریچر کی بائیں جانب بڑے ادب کے ساتھ کھڑی ہو گئیں۔ میں یہ منظر سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ان میں سے ایک سیاہ



پوش عورت سٹریچر کے پاس آ گئی۔ اس نے جھک کر لڑکی کے ماتھے پر بوسہ لیا اور خنجر سے لڑکی کے لباس کو کاٹنا شروع کر دیا۔ جب لڑکی کے اوپر کا دھڑ بے لباس ہو گیا تو سیاہ پوش عورت نے دونوں بازو پھیلا دیئے اور چہرہ اوپر اٹھا کر حلق سے ایسی چیخ کی آواز نکالی کہ میری روح تک کانپ گئی۔

آپ اندازہ نہیں کر سکتے ہیں کہ سٹریچر پر جکڑی ہوئی لڑکی کا کیا حال ہو رہا تھا جو بد قسمت بول بھی نہیں سکتی تھی، آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔ چیخ مارنے کے بعد عورت نے خنجر کی نوک لڑکی کے بے لباس پیٹ کے اوپر رکھ کر ایک چیرا دیا۔ لڑکی کے پیٹ میں سے سرخ سرخ خون کی دھار نکل کر بہنے لگی۔ چھت پر لگے بجلی کے بلب کی روشنی میں مجھے سب کچھ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے ہی خون کی سرخ دھار نکلی سیاہ پوش عورت نے اس پر اپنا منہ رکھ دیا اور اس طرح گھونٹ بھرنے لگی جیسے خون پی رہی ہو۔ لڑکی کے حلق سے نکلنے والی تکلیف دہ خرخراہٹ کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ سیاہ پوش عورت نے خون کے تین چار گھونٹ پینے کے بعد منہ اوپر اٹھایا تو اس کے ہونٹ خون سے سرخ ہو رہے تھے۔

سیاہ پوش عورت پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے فوراً بعد تینوں سیاہ پوش عورتیں آگے بڑھیں اور باری باری بد نصیب لڑکی کے خون سے اپنی پیاس بجھانے لگیں۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ان خون آشام عورتوں کا تعلق خون پینے والی ویمپائر عورتوں کے بد کردار قبیلے سے ہے۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ تھوڑی دیر میں میرا بھی یہی حشر ہونے والا تھا۔ میں نے دل میں گڑگڑا کر خدا سے اپنی زندگی کی دعائیں مانگنی شروع کر دیں کہ یا اللہ پاک مجھے ان منحوس چڑیلوں سے اپنی پناہ میں رکھنا۔ میں خدا کے حضور گڑگڑا کر دعا مانگنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اپنا خوفناک خونیں انجام صاف نظر آ رہا تھا۔ میں اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب میں بادامی باغ کے قبرستان سے اس منحوس عورت کے ساتھ ماڈل ٹاؤن کی طرف چل پڑا تھا۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

صرف خدا کی ذات ہی مجھے ان خونخوار بلاؤں سے نجات دلا سکتی تھی۔

جب تین سیاہ پوش چڑیلیں بھی لڑکی کے پیٹ کے زخم سے بہنے والے خون سے اپنے ہونٹ اور منہ لال کر چکیں تو وہ پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئیں اور اپنے سر اس طرح ہلانے لگیں جیسے نشے میں جھوم رہی ہوں۔ اب وہ سیاہ پوش چڑیل آگے بڑھی جس نے سب سے پہلے لڑکی کے جسم میں خنجر کی نوک گھونپی تھی۔ وہ لڑکی کے سرہانے کی جانب آ گئی۔ چمکتا ہوا خنجر اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں اس نے لڑکی کے گلے پر رکھیں اور انہیں آہستہ آہستہ لڑکی کے گلے پر پھیرنے لگی۔ پھر ایک جگہ اس نے دو انگلیوں سے لڑکی کے گلے کو ذرا سا دبایا اور دوسرے ہاتھ سے خنجر کی نوک وہاں رکھی اور میرے دیکھتے دیکھتے بدقسمت لڑکی کا آدھا گلا کاٹ ڈالا۔ وہاں سے خون کا فوارہ اچھل کر سیاہ پوش چڑیل کے جسم پر پڑا۔ اس کا سارا جسم خون آلودہ ہو گیا۔ اس پر ایک وحشت سوار ہو گئی۔ اس نے اپنا منہ لڑکی کی گردن کی کٹی ہوئی رگ پر رکھ دیا اور خون پینے لگی۔

پھر وہ پیچھے ہٹ گئی اور دوسری سیاہ پوش چڑیلیں دیوانہ وار آگے بڑھیں اور انہوں نے خنجر مار مار کر لڑکی کی گردن کو آدھی سے زیادہ کاٹ ڈالا اور لپک لپک کر انسانی خون سے اپنی پیاس بجھانے لگیں۔ اس دوران پہلی سیاہ پوش چڑیل نے لڑکی کے جسم پر خنجر گھونپنے شروع کر دیئے۔ لڑکی کا جسم خون میں نہا گیا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ سیاہ پوش چڑیلوں کے ہاتھ، منہ اور چہرے خون میں لتھڑ گئے تھے۔ یہ ہیبت ناک منظر دیکھ کر دہشت کے مارے میرا خون خشک ہو گیا تھا۔ دل ایسے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا جیسے ابھی سینہ چیر کر باہر آ جائے گا۔ اذیت ناک موت کی ہیبت میرے سارے جسم پر طاری ہو چکی تھی۔ میرے ساتھ بھی یہی آدم خور درندوں کا سلوک ہونے والا تھا۔

میرے ہونٹ پہلے ہی پتھر ہو چکے تھے۔ اب میرا جسم بھی مارے دہشت کے



جیسے بے حس ہو گیا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں جیسے مفلوج ہو چکی تھیں۔ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ اگر کچھ یاد تھا تو یہی کہ دو چار منٹ کے بعد میرے جکڑے ہوئے بدن پر بھی آدم خور وحشیوں کی طرح خنجر چلنے والے تھے۔ سیاہ پوش چڑیلیں وحشیوں کی طرح گردنیں ہلا ہلا کر رقص کر رہی تھیں۔ وہ رقص کرتی ہوئی میرے سٹریچر کے پاس آ گئیں۔ انہوں نے وہی کچھ کیا جو انہوں نے بدقسمت لڑکی کو ہلاک کرنے کے بعد اس کا خون پیتے وقت کیا تھا۔ تین سیاہ پوش چڑیلیں میرے سٹریچر سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ پہلے والی سیاہ پوش چڑیل خنجر ہاتھ میں لئے میری طرف بڑھی۔ اس کا خون آلود وحشی چہرہ آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ خنجر والا ہاتھ اوپر کئے میرے بالکل قریب آ گئی۔ اس نے سب سے پہلے میرے لباس کو خنجر سے کاٹ کر میرے جسم کو برہنہ کرنا تھا تاکہ وہ آسانی سے میرا پیٹ چاک کر سکے۔

اُس چڑیل نے خوفناک انداز میں میری طرف جھک کر دیکھا۔ میرے سینے سے اٹھی ہوئی چیخ حلق میں آ کر پھنس گئی تھی۔ سیاہ پوش چڑیل نے خنجر کی نوک میری قمیض کے گریبان کے اندر ڈال دی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ کہانی ختم ہونے والی تھی۔ بلکہ ختم ہو گئی تھی۔ موت نے اپنا بے رحم ہاتھ میرے سینے پر رکھ دیا تھا۔ اب خنجر نے میرا گریبان چاک کر کے میرا پیٹ ننگا کرنا تھا اور پھر تیز دھار والے خنجر نے میرے پیٹ میں اتر کر مجھے میرے خون میں ہی نہلا دینا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میری بند آنکھوں کے اندر جیسے بجلی سی چمک گئی اور میرے دل نے کلمہ پاک کا ورد شروع کر دیا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور میرا دل کلمہ پاک پڑھ رہا تھا۔ اس سے پہلے مجھے گریبان کے اندر خنجر کی نوک کی ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی تھی کیونکہ سیاہ پوش چڑیل نے میرا گریبان چاک کرنے کے لئے خنجر میرے گریبان میں ڈالا تھا لیکن کلمہ پاک کے ورد کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کسی نے جیسے میرے سینے پر سے خنجر ہٹا لیا ہے۔ خنجر کی نوک کا احساس غائب ہو گیا تھا۔

میں یہی سمجھا کہ موت کے خوف کی وجہ سے میرا جسم سن ہو گیا ہے اسی لئے خنجر کی نوک کا احساس نہیں ہو رہا۔ لیکن یہ اللہ کے پاک کلام کا دل کی گہرائیوں سے ورد کرنے کا اثر تھا کہ میرے سینے پر خنجر کی نوک کی چبھن ختم ہو گئی تھی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھولنے کے بعد میں نے جو کچھ دیکھا اور مجھے جو کچھ نظر آیا اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں نے اسے خواب یا موت کے بعد کا منظر سمجھا۔ شاید دہشت کی وجہ سے میری روح پرواز کر گئی تھی اور میں جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ مرنے کے بعد کا منظر تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اس گھڑی کا انتظار کرنے لگا جب فرشتے آ کر میری روح کو جہاں بھی لے جانا ہو گا لے جائیں گے۔ جسم کا مادی احساس بالکل ختم ہو چکا تھا۔ میں اپنے آپ کو ایک روح ہی سمجھ رہا تھا کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ایک لمحے کے بعد سیاہ پوش چڑیلوں کی قتل گاہ سے نکل کر دریا کنارے سنگ مرمر کی کسی بارہ دری میں لیٹا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کئے کئے میں نے آہستہ سے اپنے دونوں ہاتھوں اور پاؤں کو حرکت دی۔ میرے دونوں پاؤں اور ہاتھ اب رسیوں میں جکڑے ہوئے نہیں تھے۔ میں نے اپنا ایک ہاتھ اٹھایا اور اسے اپنے سینے پر رکھ کر ذرا سا اندر کو دبایا۔

مجھ پر یہ حیرت انگیز حقیقت واضح ہو گئی کہ میری روح جسم سے الگ نہیں ہوئی تھی اور میں اپنے مادی جسم کے ساتھ زندہ سلامت تھا۔ میں اپنے ہونٹ بھی ہلا سکتا تھا۔ میں نے ہونٹوں کے زندہ ہو جانے کے بعد سب سے پہلا فقرہ جو ادا کیا وہ یہ تھا۔

"یا اللہ پاک! تیرا شکر ہے۔"

میں آہستہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ارد گرد نگاہ ڈالی۔ میں نے دیکھا کہ دریا کا کنارہ ہے۔ رات کا وقت ہے۔ آسمان پر مشرق کی جانب زرد چاند نکلا ہوا ہے جس کا عکس دریا کی لہروں میں نظر آ رہا ہے۔ ہر طرف دھندلی زرد چاندنی پھیلی ہوئی ہے اور میں سنگ مرمر کی ایک پرانی بارہ دری میں ہوں۔ میں نے دریا کو اور بارہ دری کو فوراً



پہچان لیا۔ یہ لاہور کا راوی دریا تھا اور بارہ دری کامران کی بارہ دری تھی جو اس زمانے میں دریا کے اندر آ گئی ہوئی تھی اور لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر بارہ دری میں جایا کرتے تھے۔

میرے ساتھ ایک معجزہ ہی ہوا تھا۔ اللہ کے فضل اور اللہ کے حکم سے کسی غیبی طاقت نے مجھے سیاہ پوش چڑیلوں کی قتل گاہ سے نکال کر کامران کی بارہ دری میں ڈال دیا تھا۔ میں کوئی صوفی اور پرہیز گار آدمی نہیں تھا۔ دنیا کی آلائشوں میں پھنسا ہوا گناہ گار انسان تھا۔ لیکن دو باتیں میرے اندر نوجوانی کے زمانے ہی سے موجود تھیں اور میں نے ان پر ہمیشہ اور ہر قسم کے حالات میں عمل کیا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ میں نے کبھی کسی عورت پر بری نگاہ نہیں ڈالی تھی اور بدکاری سے میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو بچایا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر میرا ایمان سیسہ پلائی چٹان سے بھی زیادہ مضبوط اور راسخ تھا۔ میں آپ کو اپنی کہانی سنا رہا ہوں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی جو رسیوں اور چمڑے کی بیلٹ میں جکڑا ہوا ہو وہ ایک دم سے اپنے آپ آزاد ہو کر کہیں کا کہیں پہنچ جائے۔ آپ کو ایسا سوچنے کا پورا حق حاصل ہے۔ میں آپ سے ہرگز بحث نہیں کروں گا۔ یہ معاملات بحث مباحثے کی دنیا سے بہت آگے کے معاملات ہیں۔ میں آپ سے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ دنیا میں کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے اور میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تھا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیسے ہوتا ہے؟ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ ہو اور وہ وجہ انسانی عقل و دانش کی سمجھ سے باہر ہو۔

O

میں کامران کی بارہ دری میں اٹھ کر بیٹھا ہوا تھا۔

میرا ذہن بالکل تازہ دم تھا۔ مجھے بادامی باغ کے قبرستان سے لے کر پراسرار عورت کی گاڑی میں بیٹھ کر ماڈل ٹاؤن جانے اور پھر چائے پینے کے بعد بے ہوش ہو جانے اور ہوش میں آنے کے بعد سیاہ پوش چڑیلوں کی قتل گاہ میں پہنچ جانے کے تمام واقعات یاد تھے۔ میں نے دھندلی چاندنی میں اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

رات کا ڈیڑھ بج چکا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ایک بات طے شدہ تھی کہ میں دریا کے وسط میں واقع بارہ دری میں بیٹھا تھا اور صبح ہونے سے پہلے وہاں کوئی کشتی نہیں آتی تھی اور مجھے باقی کی رات بارہ دری میں ہی گزارنی تھی۔ رات ٹھٹھر رہی تھی۔ پہلے تو مجھے سردی کا زیادہ احساس نہیں ہوا لیکن اب مجھے بھی سردی لگ رہی تھی۔ میرا لمبا گرم کوٹ جو میں نے رات کے وقت پراسرار عورت کے ساتھ ماڈل ٹاؤن جاتے ہوئے پہن رکھا تھا خدا جانے کہاں مجھ سے الگ ہو گیا تھا۔ میں اس وقت بند گلے والے سویٹر میں تھا جس نے بہت حد تک مجھے سردی سے بچا رکھا تھا۔

دریا کے درمیان ویسے بھی سردی زیادہ ہوتی ہے۔ میں بے خیالی میں دریا کے قلعے والے کنارے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ مجھے زرد چاندنی میں دریا پر کوئی سیاہ چیز دکھائی دی جو آہستہ آہستہ بارہ دری کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں اسے مسلسل دیکھ رہا



تھا۔ جب وہ سیاہ چیز بارہ دری کے ذرا قریب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک کشتی ہے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ کسی ملاح کو رات کے وقت کوئی کام پڑ گیا ہے اور وہ دریا کے دوسرے کنارے پر جا رہا ہے وہ بارہ دری کے قریب سے ہو کر ضرور گزرے گا۔ اس وقت میں اسے آواز دے کر اپنی طرف بلا لوں گا اور اس کی کشتی میں بیٹھ کر دریا کے دوسرے کنارے یعنی شاہدرہ پہنچ جاؤں گا۔ کشتی چھوٹی تھی اور زرد چاندنی کے غبار میں سے نکل کر آہستہ آہستہ واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔

اچانک مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ کشتی خالی تھی۔ اسے کوئی ملاح نہیں چلا رہا تھا بلکہ اپنے آپ چل رہی تھی۔ زیادہ حیرانی مجھے اس بات کی ہو رہی تھی کہ اگر کشتی کو کوئی ملاح چلا نہیں رہا تو وہ سیدھی بارہ دری کی طرف کیوں چلی آ رہی ہے۔ اس کی سمت کس نے برقرار رکھی ہوئی ہے۔ لیکن بہت جلد یہ معمہ حل ہو گیا۔

میں کشتی کو دیکھتا جا رہا تھا۔ اس پر برابر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ خالی کشتی بارہ دری کی سیڑھیوں کے پاس آ کر رک گئی۔ پھر ایسے لگا جیسے کسی نے اسے سیڑھیوں کے ساتھ کسی چیز سے باندھ دیا ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک سناٹا چھایا رہا۔

میرے دل میں اچانک خیال آیا کہ ایک کشتی خدا نے میری مدد کے لئے بھیج دی ہے مجھے اس پر بیٹھ کر دریا پار کر جانا چاہئے آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا کم از کم یہاں سے تو نکلوں گا۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے اپنی دائیں جانب جس طرف بارہ دری کے چبوترے کا زینہ تھا کسی کے لباس کی سرسراہٹ سی سنائی دی۔ ساتھ ہی وہی طلسمی خوشبو محسوس ہوئی جس سے میں کافی حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کون ہے۔ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ کون ہو سکتی تھی۔ جی ہاں وہ پرانی قلعے کی ویران حویلی کی پراسرار حسین و جمیل بدروح روہنی عرف سلطانہ ہی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کر ظاہر ہو گئی۔ اس نے وہی گلابی بلکہ زعفرانی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گلے میں سفید موتیوں کی مالا تھی اور سر پر ہیرے جواہرات والا چھوٹا سا

تاج تھا۔

میں اسے اب روہنی نہیں کہوں گا، سلطانہ ہی کہوں گا کیونکہ اس عورت نے مغل صوبیدار شہزادے سے شادی کرلی تھی اور اس کے بعد اس نے اسلام قبول کرلیا تھا اور اپنا نام روہنی سے بدل کر سلطانہ رکھ لیا تھا۔ لیکن میں اسے روح نہیں کہوں گا بدروح ہی کہوں گا۔ کیونکہ میرے عقیدے اور میرے نظریئے کے مطابق پاکیزہ اور نیک روحیں اتنے بلند مقامات پر ہوتی ہیں کہ دنیا کے مادی ماحول میں آنے سے گریز کرتی ہیں صرف ایسی روحیں ہی زمین پر کبھی کبھی آجاتی ہیں جو اپنے خراب اعمال کی وجہ سے بوجھل ہوتی ہیں، بھاری ہوتی ہیں۔ مادی احساسات و ملال اور پچھتاووں میں مبتلا ہوتی ہیں اور اس وقت تک ارض و سما کے درمیان بھٹکتی رہتی ہیں جب تک ان کے گناہوں کی بخشش نہیں ہو جاتی۔ یہ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں سچائی کم اور مبالغہ زیادہ ہو لیکن میں اپنے عقیدے کے مطابق سلطانہ کو بدروح ہی کہوں گا۔

سلطانہ اپنی زعفرانی ساڑھی کو بڑی نزاکت کے ساتھ سمیٹ کر میرے سامنے بارہ دری کے فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے لباس میں سے اس کی خاص طلسمی خوشبو کی لہریں میری طرف آرہی تھیں۔ مجھے اس بدروح پر جو میری ہمدرد بنتی تھی سخت غصہ آرہا تھا۔ میں نے اس سے گلہ کرنے کے انداز میں کہا۔ ”اب تمہارے آنے کا کیا فائدہ ہے۔ تم اس وقت کہاں تھیں جب سیاہ پوش چڑیلیں میرے جسم کے ٹکڑے کرنے والی تھیں۔ اگر خدا میری مدد نہ کرتا تو اس وقت تک سیاہ پوش چڑیلیں میرا خون پینے کے بعد میری لاش کے ٹکڑے بھی ہڑپ کرچکی ہوتیں۔“

بدروح سلطانہ میری طرف گہری اور مسلسل نگاہوں سے تک رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو اس نے اپنی مخصوص سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں اگر خدا کی مدد تمہارے شامل حال نہ ہوتی تو اس وقت تم اس دنیا میں نہ



ہوتے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خدا نے جس وسیلے سے تمہاری مدد کی وہ وسیلہ میں ہی تھی۔“

میں نے فوراً کہا۔ ”مگر میں نے تو تمہیں وہاں کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو تم نے اس وقت آکر مجھے کیوں نہیں روکا جب وہ چڑیل عورت مجھے بادامی باغ کے قبرستان سے اپنے ساتھ ماڈل ٹاؤن لے جارہی تھی۔ تم نے اس وقت آکر میرے ہاتھ سے چائے کی پیالی کیوں نہ غائب کردی جس میں وہ عورت بے ہوشی کی دوا ملا کر مجھے پلارہی تھی؟ اگر تم اس وقت آکر میری مدد کرتیں تو میں کم از کم اس ہولناک اذیت سے تو بچ جاتا جو میں نے سیاہ پوش چڑیلوں کی قید میں سٹریچر پر جکڑے ہوئے برداشت کی تھی۔“

سلطانہ کی بدروح بڑی توجہ سے میری بات سُن رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”تمہاری روح ابھی مادی جسم میں قید ہے۔ بہت سی باتیں، بہت سی حقیقتیں ایسی ہیں جن کا احساس تم اس مادی جسم میں رہتے ہوئے نہیں کرسکتے۔ یہ حقیقتیں تمہارے شعور سے ابھی پوشیدہ ہیں اور جب تک تم اپنے مادی جسم میں قید ہو تم سے پوشیدہ ہی رہیں گی۔ مجھے یہ حقائق تم پر ظاہر کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں تمہیں صرف اتنا ہی بتا سکتی ہوں کہ جو اذیتیں تم نے سیاہ چڑیلوں کے درمیان رہ کر اٹھائی ہیں وہ تمہارے مقدر کا حصہ تھیں اور یہ حصہ تمہیں مل کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد میں قدرت خداوندی کے حکم سے تمہاری مدد کا وسیلہ بن کر تمہارے پاس پہنچ گئی اور تمہیں وہاں سے اٹھا کر اس بارہ دری میں لے آئی.....“

میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”خدا کے لئے تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر جو مصیبت آتی ہے اور میرے ساتھ یہ جو کچھ ہو رہا ہے صرف تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے۔ اگر میں تمہیں پرانے قلعے کی حویلی میں مرتبان سے نکال کر آزاد نہ کرتا تو کبھی اس مصیبت میں نہ پھنستا۔“

سلطانہ کی بدروح نے کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ ایسا ہونا تھا اور ہو کر رہا۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "خدا کے لئے مجھے یہ بتاؤ کہ اب اس بک بک سے میرا پیچھا کیسے چھوٹے گا۔ مجھے ان بدروحوں سے کیسے نجات ملے گی؟"

سلطانہ بدروح کہنے لگی۔ "میں تمہیں اصل حقیقت نہیں بتا سکتی۔ دنیا میں بعض اوقات انسان سے نادانی میں یا اس کے بعض اعمال کے نتیجے میں ایسی حرکت ہو جاتی ہے جس کے نتائج بہت دور تک پہنچ جاتے ہیں یہاں تک کہ خود وہ انسان بھی ان نتائج سے بے خبر ہوتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ تم نے مجھے دشمن پجاری رگھو کی قید سے آزاد کر کے میرے ساتھ بھلائی کی یا اپنے ساتھ دشمنی کی یا ایسا تم نے صرف اپنے جذبہ تجسس کی تسکین کے لئے کیا۔ لیکن میں تمہیں یہ ضرور بتا دینا چاہتی ہوں کہ تم ایک خوفناک چکر میں پھنس چکے ہو اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اس دنیا میں اگر تمہیں کوئی اس چکر سے نکال سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں۔"

مجھے اس بدروح کی باتوں پر کچھ یقین آ بھی رہا تھا اور نہیں بھی آ رہا تھا۔ البتہ مجھے اس بدروح روہنی عرف سلطانہ پر غصہ ضرور آ رہا تھا کہ میں نے اس بدروح کو اس کے دشمن رگھو کی قید سے کیوں آزاد کرایا۔ مجھے مرتبان کا ڈھکن نہیں کھولنا چاہئے تھا لیکن ہر کام کا سراغ لگانے اور اپنے ذوقِ تجسس کو تسکین دینے کی جو اچھی یا بری عادت مجھ میں تھی اس کا نتیجہ میں بھگت رہا تھا۔ میں نے اس سے یہی سبق حاصل کیا تھا کہ انسان کو ایسی چیزوں میں کبھی دخل نہیں دینا چاہئے جن کا اس کے ساتھ کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔ میرے سبق حاصل کرنے سے اب مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا کیونکہ میں نادانی میں یا ناسمجھی میں ایسی حرکت کر بیٹھا تھا جو مجھے نہیں کرنی چاہئے تھی۔

جن، بھوتوں، بدروحوں اور چڑیلوں کی اپنی ایک الگ دنیا ہوتی ہے جس کا انسانوں کی دنیا سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن اگر کبھی بالواسطہ طور پر یا اتفاق سے انسان کا اس مخلوق سے آمنا سامنا ہو جائے تو آدمی کو چاہئے کہ وہ خاموشی سے آگے



نکل جائے اور ان لوگوں کے معاملات میں ہرگز دخل اندازی نہ کرے۔

بدروح سلطانہ کی گفتگو سننے کے بعد میں اب غصہ کھانے یا جھنجلانے کی بجائے بڑی سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ مجھے بدروح سلطانہ کی باتوں پر غور کرنا چاہئے اور جس مصیبت میں میں پھنس چکا ہوں اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے سلطانہ سے مدد حاصل کرنی چاہئے کیونکہ سلطانہ کی بدروح کو مرتبان سے آزاد کرنے کے بعد پجاری رگھو میری جان کا دشمن بن چکا تھا اور وہ تین چار مرتبہ مجھے موت کے گھاٹ اتارنے کی کوشش بھی کر چکا تھا مگر عین وقت پر سلطانہ کی بدروح نے مجھے بچا لیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں اپنی زندگی کی خاطر سلطانہ کے آگے اپنی ہار تسلیم کر لی تھی۔

میں نے سلطانہ کی بدروح سے کہا۔ "سلطانہ! تم نے جو کچھ کہا ہے میں اُسے تسلیم کرتا ہوں۔ آج سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم جو کہو گی میں وہی کروں گا۔"

سلطانہ کی بدروح نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ میں نے اس کے حسین چہرے پر مسرت کی ایک لہر سی نمودار ہوتے دیکھی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہنے لگی۔ "تم نے یہ بات کہہ کر میرے سینے پر پڑے ہوئے ایک ایسے پتھر کو ہٹا دیا ہے جسے میں اکیلی کبھی نہیں ہٹا سکتی تھی۔ تم نے اپنی اور میری ہم دونوں کی مشکل آسان بنا دی ہے۔ مجھے مرتبان کی قید سے آزاد کرنے اور میرے آزاد ہو جانے کے بعد ہم دونوں تقدیر کے جس چکر میں پھنس گئے تھے اب ہم دونوں مل کر اس کا مقابلہ کر کے اس میں سے نکل سکیں گے۔"

میں نے سلطانہ کی بدروح سے کہا۔ "تمہارا تعلق روحوں کی دنیا سے ہے۔ میں زندہ انسانوں کی دنیا میں رہتا ہوں۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کیسے چل سکیں گے؟"

اس کے جواب میں بدروح سلطانہ نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "ہو سکتا

ہے تمہیں بھی میرے ساتھ میری دنیا میں جانا پڑ جائے۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟"

میں نے سوچا کہ روز روز کی مصیبت سے یہی بہتر ہے کہ ایک ہی بار اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ کم از کم ان بدروحوں سے ہمیشہ کے لئے نجات تو مل جائے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں تھا۔ اگر اس وقت مجھے علم ہو جاتا کہ میں کس جہنم میں کودنے والا ہوں اور میرے ساتھ کیا گزرنے والی ہے تو میں بدروح سے تعاون کرنے کی کبھی حامی نہ بھرتا اور ملک چھوڑ کر ہی بھاگ جاتا لیکن میرے ساتھ جو کچھ ہونے والا تھا اسے تو ہو کر ہی رہنا تھا۔ میں نے سلطانہ کی بدروح سے کہہ دیا۔ "جب میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ تم جو کہو گی میں وہی کروں گا تو مجھے تمہارے ساتھ تمہاری بدروحوں کی دنیا میں جانے پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

بدروح سلطانہ یہ سن کر بڑی خوش ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ چوم لیا۔ اس کے ہونٹ برف کی طرح ٹھنڈے تھے۔ میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگی۔ "کیا تم ابھی میرے ساتھ چل سکتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کالی مندر والے سونے کے بت کا راز کیا ہے۔ کیا اسی بت نے میرے دوست انور کا خون کیا تھا؟"

بدروح سلطانہ نے کہا۔ "جب میں نے اس سے پہلے تمہیں پجاری رگھو کے بھیجے ہوئے دشمنوں سے بچایا تھا تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ جب سے تم نے مجھے مرتبان سے باہر نکال کر اس کی قید سے آزاد کیا ہے پجاری رگھو کی بری آتما یعنی بدروح تمہاری اور میری جان کی دشمن بن گئی ہے۔ پجاری رگھو ایک تو مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے، دوسرے وہ تمہیں بھی قتل کرنا چاہتا ہے۔ میں اس کے قابو اس لئے نہیں آ رہی کہ مجھے اس کی سازش کا پہلے سے علم ہو جاتا ہے اور میں اپنا بچاؤ کر لیتی ہوں۔ تمہاری جان کو وہ اس لئے کوئی نقصان پہنچانے میں کامیاب نہیں ہوتا کہ عین



وقت پر میں تمہاری مدد کو پہنچ جاتی ہوں۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ چوہے بلی کا یہ کھیل زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ میں پجاری رگھو کے قابو آؤں چاہے نہ آؤں لیکن ایک نہ ایک دن وہ تمہیں قتل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گا اور ایسا میں کبھی نہیں چاہتی کہ ہو، اس لئے کہ مجھے رگھو کی قید سے آزاد کر کے تم نے مجھ پر وہ احسان کیا ہے جس کا تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے اور تمہاری جان کی حفاظت کرنا میرا فرض بن گیا ہے۔ میں چاہتی تھی کہ کسی طرح تمہیں اپنے ساتھ چلنے پر راضی کر کے اس خونی کھیل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں مگر میں جانتی تھی کہ انسانوں کی دنیا میں رہنے والا کوئی بھی انسان بدروحوں اور چڑیلوں کی دنیا میں جانے پر راضی نہیں ہو گا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ تمہیں اٹھا کر لے جاؤں میں ایسا بڑی آسانی سے کر سکتی تھی لیکن میں چاہتی تھی کہ تم اپنی مرضی سے میرے ساتھ چلو۔ تمہارا اپنی مرضی سے میرے ساتھ بدروحوں کی دنیا میں جانا بڑا ضروری تھا بلکہ بدروحوں کی دنیا میں جانے کے لئے یہ ایک لازمی شرط تھی...... اب جبکہ تم نے اس کی حامی بھر لی ہے اور میرے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گئے ہو تو میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ اب تمہیں بتانے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تمہارے دوست انور کو کالی مندر کے سونے کی مورتی نے ہی قتل کیا تھا اور وہ تمہیں قتل کرنے والی تھی کہ میں نے عین وقت پر پہنچ کر تمہیں بچا لیا۔ وہ کالی مندر کی مورتی اصل میں ہمارے دشمن پجاری رگھو کی بھیجی ہوئی ایک انتہائی خطرناک قاتل کی بدروح تھی جو ہزاروں انسانوں کو قتل کر چکا تھا اور مرنے کے بعد اس کی بھٹکتی ہوئی گناہگار روح کو پجاری رگھو نے اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔

میں بدروح سلطانہ سے ایک اور سوال کرنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے ٹوک دیا اور بولی۔ "تم اپنے دل میں مجھے بدروح سلطانہ نہ کہا کرو۔ میں نے زندگی میں اسلام قبول کر لیا تھا اور یاد رکھو ایک مسلمان کی روح گناہ گار ہو سکتی ہے مگر بدروح نہیں ہو سکتی

اس لئے تم آئندہ سے مجھے یا تو سلطانہ کہہ کر مخاطب کیا کرو اور اگر مجھے بدروح کہنا ہو تو روہنی کی بدروح کہہ دیا کرو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ صوبیدار شہزادہ شیروان سے شادی کرنے کے بعد میں مسلمان ہو گئی تھی اور اپنا ہندو نام روہنی ترک کر کے سلطانہ رکھ لیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے میں آئندہ ایسا ہی کروں گا۔ اب یہ بتاؤ کہ وہ پراسرار عورت کون تھی جو مجھے بادامی باغ قبرستان کے پاس ملی تھی اور جس نے مجھے اپنی اکلوتی بیٹی کی موت کی جھوٹی کہانی سنا کر بے ہوش کر کے خون پینے والی اور مردوں کو کھانے والی سیاہ پوش چڑیلوں کے حوالے کر دیا تھا۔"

میں اپنی داستان سناتے ہوئے سلطانہ کو بدروح روہنی ہی کہوں گا لیکن اس کو مخاطب کرتے ہوئے اگر کبھی مجھے اس کا نام لینا پڑ جاتا تھا تو میں اسے سلطانہ کے نام سے بلاتا تھا۔ چنانچہ میرے سوال کے جواب میں بدروح روہنی نے کہا۔ "وہ عورت بھی ہمارے دشمن رگھو کی بھیجی ہوئی ایک بدروح تھی جو ایک عورت کا روپ لے کر تمہیں سیاہ پوش چڑیلوں کے جال میں پھنسانے کے لئے بھیجی گئی تھی اور وہ سیاہ پوش چڑیلیں بھی پاتال کی اپسراؤں کی بدروحیں تھیں جو بھوپال اور جھانسی کے جنگلوں میں رات کے وقت بھولے بھٹکے مسافروں کو اٹھا کر لے جاتی ہیں اور ان کا خون چوس لیتی ہیں اور گوشت کھا جاتی ہیں۔ میں تمہیں بدروحوں کی جس دنیا میں لے کر جا رہی ہوں وہ تمام کی تمام بتوں کی پوجا کرنے والے مردوں اور عورتوں کی بدروحیں ہیں۔ ان میں دو قسم کی بدروحیں ہیں۔ ایک گناہ گار بدروحیں اور دوسری سراپ یعنی بددعا پائی ہوئی روحیں یعنی ایسے مردوں اور عورتوں کی بدروحیں جنہیں کسی کی بددعا لگ گئی اور مرنے کے بعد اس کی روح بدروح بن کر زمین پر بھٹکتی پھرتی ہے۔ ان میں ایسے بت پرستوں کی روحیں آسیب اور چڑیلیں بن جاتی ہیں جنہوں نے دنیا میں بہت بڑے گناہ کئے ہوتے ہیں۔ ایسے گھناؤنے گناہ کرنے والے مردوں کی روحیں بھوت



بن جاتی ہیں اور لوگوں کو چمٹ جاتی ہیں اور اکثر انہیں موت کی گود میں پہنچا دیتی ہیں مگر میری ایک بات یاد رکھو کوئی بدروح، کوئی آسیب، کوئی جن بھوت اور چڑیل کبھی ایسے شخص کا کچھ بگاڑنا تو کیا اس کے قریب بھی نہیں جاتی جس کو اپنے خدا پر مکمل یقین ہو اور جس کا سینہ ایمان کی شمع سے روشن ہو۔ اللہ کے نور کی روشنی میں چلنے والے انسان کو دور ہی سے دیکھ کر بدروحیں اس کا راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں۔ یہ چڑیلیں اور بھوت عام طور پر بت پرستوں یعنی کافروں کو چمٹتے ہیں یا پھر کسی ایسے مسلمان کو بھی چمٹ جاتے ہیں جس کا خدا اور اس کے رسول صلعم پر ایمان پختہ نہ ہو۔ بہر حال یہ ساری باتیں تمہیں آہستہ آہستہ اپنے آپ معلوم ہو جائیں گے۔"

میں نے بدروح روہنی سے ایک سوال کیا جس کی اسے شاید مجھ سے امید نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "سلطانہ! تم تو اسلام قبول کر کے مسلمان ہو گئی تھیں۔ پھر تمہاری روح بدروح بن کر کیوں بھٹک رہی ہے۔"

میرے اس سوال پر بدروح روہنی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے مجھے کچھ دیر تک بڑے غور سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔ "میں جب ہندو تھی تو مندروں میں جا کر اور گھر میں بھی مختلف دیوی دیوتاؤں کے بتوں کی پوجا کرتی تھی انہیں خدا مانتی تھی۔ یاد رکھو شرک خدا کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ خدا اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔ ہم جب مورتیوں کی پوجا کرتے ہیں تو انہیں بھگوان مان کر نعوذ باللہ انہیں خدا کا شریک بنا دیتے ہیں جو گناہ کبیرہ ہے۔ میں نے بھی مورتیوں کی پوجا کر کے بہت بڑا گناہ کیا تھا اور جوان ہونے تک یہ گناہ کرتی رہی تھی۔ چنانچہ میرے مرنے کے بعد میں اس بڑے گناہ کی سزا اس طرح بھگت رہی ہوں کہ بدروح بن کر زمین پر بھٹکتی پھر رہی ہوں۔ شادی کے بعد اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے میری اتنی بخشش ضرور ہو گئی ہے کہ میں کوئی چڑیل نہیں بنی اور دوسری بدروحیں سوائے ان بدروحوں کے بڑے پجاریوں اور منتری کی بدروح کے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتیں۔ ... اب جو

باتیں میں تمہیں بتانے چلی ہوں ان کو بڑے غور سے سننا۔ بدروحوں کی دنیا میں لے جانے سے پہلے میں تمہیں کچھ ہدایات دینا چاہوں گی جن پر تمہیں سختی سے عمل کرنا ہوگا ورنہ تمہیں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوگا۔ کیا تم سن رہے ہو؟"

میں بدروح روہنی یعنی سلطانہ کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میں سن رہا ہوں سلطانہ!"

سلطانہ نے بے اختیار سی ہو کر میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ "جب تم میرا نام لے کر مجھے بلاتے ہو یا مخاطب کرتے ہو تو مجھے بہت سی باتیں یاد آجاتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تمہارا میرا ساتھ تو بہت ہی تھوڑا ہے بلکہ تم مجھے تین چار مرتبہ ہی ملی ہو پھر تمہیں میری باتیں کہاں سے یاد آنے لگی ہیں؟"

بدروح روہنی نے آہ بھر کر کہا۔ "میں تمہیں یہی بتانا چاہتی ہوں کہ تمہاری کون سی باتیں مجھے یاد آتی ہیں اور کیوں یاد آتی ہیں اور تمہارے میرے درمیان کیا رشتہ تھا؟"

میں نے تعجب کے ساتھ پوچھا۔ "کیا تمہارے اور میرے درمیان کوئی رشتہ بھی تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

بدروح روہنی نے اپنے لمبے بالوں کو آہستہ سے پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے میں اسی راز پر سے پردہ اٹھاؤں گی کہ تمہارا میرا رشتہ کیا تھا۔ اب میں تمہیں وہ دو ایک باتیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں جن کا تمہیں بدروحوں کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد خیال رکھنا ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم میرے ساتھ غیبی حالت میں ہو گے۔ یعنی تم سب کو دیکھ سکو گے تمہیں سوائے بڑے پجاریوں اور بڑے منتریوں کی بدروحوں کے دوسرا کوئی نہیں دیکھ سکے گا لیکن میں تمہیں بڑے پجاریوں اور بڑے منتریوں کی بدروحوں سے دور رکھوں گی کیونکہ اگر ان کی تم پر نظر پڑ گئی تو وہ تمہیں اپنے قبضے میں کر کے تمہیں مار ڈالیں گے اور تمہیں بھی ایک بدروح بنا کر اپنے ناپاک



گروہ میں شامل کر لیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میری اجازت کے بغیر تمہیں کوئی لفظ زبان سے نہیں بولنا ہوگا۔"

میں نے بدروح روہنی سے سوال کیا۔ "یہ بدروحوں کی دنیا کس جگہ پر ہے؟ کیا زمین کے اندر ہے یا زمین کے اوپر کسی ویران جگہ پر ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "اس سوال کا پورا جواب دینے کی مجھے اجازت نہیں ہے۔ تم یوں سمجھ لو کہ جہاں میں تمہیں لے جا رہی ہوں وہ جگہ نہ زمین کے اندر ہے نہ زمین کے اوپر ہے، نہ دنیا کے کسی جنگل میں ہے نہ ہی دنیا کے کسی ویرانے میں ہے۔ وہ ایک ایسا جنگل ہے، ایسا ویرانہ ہے، زندہ انسانوں کی نگاہوں سے چھپا ہوا ہے جہاں نہ کبھی کوئی زندہ انسان گیا ہے اور نہ کوئی زندہ انسان کبھی جا سکتا ہے۔ وہاں صرف بدروحیں رہتی ہیں لیکن سب سے پہلے میں تمہیں جھانسی اور بھوپال کے درمیان واقع جنگل کے اس پرانے قلعے کی ویران حویلی میں لے جا رہی ہوں جہاں تم نے مجھے میرے پجاری رگھو کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا اور پھر تم نے میری روح کو مرتبان میں سے آزاد کر دیا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "جھانسی بھوپال تو یہاں سے بہت دور ہے اور اب تو دونوں ملکوں بھارت اور پاکستان میں ویزے پاسپورٹ کے بغیر کوئی بھی سفر نہیں کر سکتا۔"

حسین و جمیل روہنی کی بدروح نے کہا۔ "تم یہ کیوں بھول گئے ہو کہ میں تمہاری طرح زندہ انسان نہیں ہوں۔ میرے لئے وقت اور فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ آؤ اپنے نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں۔"

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمیں باتیں کرتے کرتے کافی وقت گزر گیا تھا اور رات ڈھلنا شروع ہو گئی تھی۔ روہنی بدروح نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگی۔ "مجھے معلوم ہے کہ تم گھبراؤ گے نہیں کیونکہ ایک بار پہلے بھی میں تمہیں اپنے ساتھ ہوا میں اٹھا کر لے جا چکی ہوں۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے ہوا میں پرواز کرتے ہوئے لاہور سے جھانسی کے پرانے قلعے میں لے جائے گی۔ میں نے کہا۔ ”میرا گرم کوٹ میرے پاس نہیں ہے صرف سویٹر میں نے پہن رکھا ہے۔ ہوا میں اڑتے ہوئے مجھے سردی لگے گی۔“

روہنی بدروح نے کہا۔ ”جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے گا تمہیں سردی نہیں لگے گی۔ تیار ہو جاؤ۔“

روہنی بدروح نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا مجھے ایک ہلکا سا جھٹکا لگا اور میرے پاؤں اپنے آپ کامران کی بارہ دری کے فرش سے دو تین فٹ اونچے اٹھ گئے۔ روہنی بھی اتنا ہی بلند ہو گئی تھی۔ پھر کسی غیبی طاقت نے ہمیں آگے دھکیل دیا۔

O



اب ہم غروب ہوتے چاند کی پھیکی روشنی میں دریائے راوی کی سطح پر سات آٹھ فٹ کی بلندی پر اڑنے لگے تھے۔ ہمارا رخ لاہور ریلوے سٹیشن کی طرف تھا۔ دریائے راوی کے اوپر سے گزر جانے کے بعد ہم آہستہ آہستہ اور بلند ہوتے چلے گئے یہاں تک کہ ہم سامنے سے آنے والے درختوں سے بھی دس بارہ فٹ کی بلندی پر آ گئے۔ ہماری رفتار ابھی اتنی زیادہ نہیں تھی۔ ہم ریلوے لائن کے اوپر پرواز کر رہے تھے۔ ہمارے دائیں بائیں لاہور شہر کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔

میں بغیر کسی حرکت اور کوشش کے اپنے آپ روہنی بدروح کے ساتھ پرواز کر رہا تھا۔ ہم لاہور ریلوے سٹیشن کے اوپر سے نکل گئے۔ جب سٹیشن کی روشنیاں کافی پیچھے رہ گئیں تو میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”اگر ہم اسی رفتار سے اڑتے رہے تو دو دن میں جھانسی بھوپال کے جنگل میں پہنچیں گے۔“

روہنی نے کہا۔ ”ہم سورج نکلنے سے پہلے پہلے اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔“

اس کے فوراً بعد مجھے ایک ہلکا سا دھچکا لگا اور فضا میں ایک دم سے ہماری رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ لاہور شہر کی روشنیاں دیکھتے دیکھتے ہمارے نیچے سے گزر گئیں۔ ہماری بلندی میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ اب ہمیں نیچے اگر کوئی روشنی دکھائی دیتی تو وہ ایک نقطے کی طرح جھلملاتی نظر آتی اور کچھ ہی دیر بعد پیچھے رہ جاتی۔

تیز ہوا میں روہنی کے لمبے سیاہ بال اڑ رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا میرے سارے جسم سے ٹکرا رہی تھی مگر مجھے ایک لمحے کے لئے بھی سردی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

روہنی بدروح نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ پھر مجھے نہیں معلوم کہ کب پاکستان اور انڈیا کے بارڈر آئے اور کب گزر گئے اور کب ہم ہندوستان کے ملک میں داخل ہو گئے۔ اب ہم اتنی بلندی پر فضا میں پرواز کر رہے تھے کہ مجھے نیچے رات کے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اپنے پاؤں کے نیچے اندھیرے کا ایک خلا ہی نظر آ رہا تھا۔

پھر کسی شہر کی روشنیاں جو ایک چھوٹی سی روشنی کی ڈھیری کی طرح تھی بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف نکل گئیں۔ اس کے کچھ دیر بعد کچھ اور جھلملاتی روشنیوں کے نقطے نیچے سے گزر گئے۔ اب آسمان پر سحر کا نور جھلکنا شروع ہو گیا تھا اور ستاروں کے فانوس آہستہ آہستہ بجھنے لگے تھے۔ ہم ایک دوسرے سے کوئی بات کئے بغیر بڑی تیز رفتاری سے فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ ایک بار ہمارے نیچے جھلملاتی روشنیوں کے کئی چھوٹے چھوٹے ڈھیر ادھر اُدھر بکھرے ہوئے دکھائی دیئے تو روہنی بدروح نے پرواز کے دوران پہلی بار زبان کھولی اور کہا۔ ”ہم بھارت کی راجدھانی دلی اور نئی دلی کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔“

میں نے اونچی آواز میں روہنی سے پوچھا۔ ”سلطانہ! ہم بھارت کی فضائی حدود میں پرواز کر رہے ہیں اور ابھی تک انڈین ایئر فورس کے کسی جیٹ فائٹر طیارے نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ کیا ہم انہیں کسی راڈار پر نظر نہیں آ رہے؟“

مجھے روہنی بدروح کی آواز سنائی دی۔ اُس نے کہا۔ ”دنیا کے کسی راڈار میں اتنی شکتی اور طاقت نہیں کہ وہ ہمیں دیکھ سکے۔“

ہم چونکہ سطح زمین سے کافی بلندی پر پرواز کر رہے تھے اس لئے ہمیں مشرقی آسمان کے افقی کناروں پر سب سے پہلے طلوع ہوتے سورج کی گلابی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ آسمان پر سحر کا اجالا نمودار ہو چکا تھا۔ مجھے ایک بار پھر روہنی کی آواز سنائی دی۔ ”ہم جھانسی کے اوپر سے گزر چکے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم قلعہ روہت گڑھ



کے اوپر اترنے والے ہیں۔“

میں نے نیچے زمین کی طرف دیکھا۔ دن کے ہلکے ہلکے اجالے میں مجھے سوائے اونچی نیچی پہاڑیوں اور درختوں کے سیاہ دھبوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اچانک میرا جسم ہلکا ہو کر نیچے کی طرف جیسے گرتا ہی چلا گیا۔ روہنی نے کہا۔ ”گھبرانا مت۔ جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہے تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ ہم روہت گڑھ کے قلعے کی چھت پر اتر رہے ہیں۔“

پھر ہماری رفتار اپنے آپ مدھم ہو گئی۔ اب نیچے جنگل کے درخت صاف نظر آ رہے تھے۔ ہم نیچے جا رہے تھے اور درخت اوپر ہماری طرف آ رہے تھے۔ پھر ان درختوں کے جھنڈوں کے درمیان ایک شکستہ پرانے قلعے کی چھت نمودار ہو گئی۔ یہ روہت گڑھ کا قلعہ ہی ہو سکتا تھا۔ ہم قلعے کی چھت پر اتر گئے۔ چھت کی تین منڈیریں مسمار ہو چکی تھیں صرف ایک منڈیر کا آدھا حصہ باقی رہ گیا تھا۔ یہ وہی منحوس قلعہ تھا جس کی ایک ویران حویلی کا آسیب مجھ پر سوار ہو گیا تھا۔

اس قلعے میں واپس آنے پر میرا دل خوف سے ایک لمحے کے لئے بوجھل ضرور ہو گیا تھا مگر یہ سوچ کر میں نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا کہ ایک بار جو کچھ ہونا ہے ہو جائے اس کے بعد تو مجھے ہمیشہ کے لئے اس مصیبت سے نجات مل جائے گی۔

روہنی کی بدروح مجھے قلعے کی تاریک سیڑھیوں میں سے لے کر نیچے ایک ایسے کمرے میں لے آئی جس پر ویرانی برس رہی تھی۔ دیواروں کا پلستر اکھڑ چکا تھا۔ اس کمرے میں سے ایک تاریک راستہ دوسرے کمرے میں جاتا تھا۔ روہنی کی بدروح میرے آگے چل رہی تھی۔ تاریک راہداری میں آ کر وہ رک گئی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اس وقت قلعے میں ہم دونوں اکیلے ہیں۔ پجاری رگھو کی بدروحیں اور راکھشس ہمارے آس پاس کہیں نہیں ہیں۔ پھر بھی تمہیں بڑی احتیاط کرنی ہو گی۔ میرے ساتھ ہی رہنا اور کسی چیز کو ہاتھ نہ لگانا۔“

ہم تاریک راہ داری میں سے گزر گئے۔ دوسری طرف ایک اور کمرہ تھا جو نہ چھوٹا تھا نہ زیادہ بڑا تھا۔ اس کی دیواروں کا پلستر بھی اکھڑ چکا تھا۔ کمرے کے درمیان میں ایک چبوترہ تھا جس میں سے ایک زینہ نیچے کسی تہہ خانے میں اترتا تھا۔ روہنی کی بدروح تہہ خانے کا زینہ اترنے لگی۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ دس بارہ سیڑھیاں اترنے کے بعد ہی مجھے نیچے سے ایک خوشبو سی آنا شروع ہو گئی۔ یہ خوشبو بڑی پراسرار تھی مگر اس میں ایک عجیب قسم کی اداسی کا احساس تھا۔ ہم ایک تہہ خانے میں آ گئے۔

تہہ خانے کی ایک لمبی محرابی کھڑکی کی جالیوں میں سے گلابی رنگ کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں میں نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا کہ تہہ خانے کے وسط میں ایک تخت بچھا ہوا تھا جس کے اوپر ایک چھتری بنی ہوئی تھی۔ اس چھتری پر ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے جو کھڑکی سے آتی گلابی روشنی میں چمک رہے تھے۔ تخت پر سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور سبز رنگ کے گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ کمرے کے کونے میں بھی ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جس کی تین سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں۔ اس چبوترے کے اوپر ایک تابوت پڑا تھا جس کے اوپر بھی ایک ہیرے جواہرات سے جڑی ہوئی چھتری نے سایہ کر رکھا تھا۔ اس چبوترے کے عقب میں دیوار پر سرخ رنگ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ اس پراسرار کمرے کی فضا اداس کر دینے والی خوشبو سے بوجھل ہو رہی تھی۔

روہنی کی بدروح آہستہ آہستہ چل کر تابوت والے چبوترے کے پیچھے دیوار پر گرے ہوئے سرخ پردے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ میں چبوترے کے پاس ہی کھڑا رہا۔ روہنی کی بدروح نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ میں اس کے پاس چلا گیا اس آسیبی قسم کے تہہ خانے کی فضا میں میرے اعصاب پر ایک عجیب سا دباؤ محسوس ہونے لگا تھا۔ روہنی کی بدروح نے سرگوشی ایسی آواز میں کہا۔ ''اب میں تمہیں ایسی



شے دکھانے والی ہوں جسے دیکھ کر تمہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آئے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے دیوار پر گرے ہوئے پردے کو ہاتھ سے ایک طرف ہٹا دیا۔ کھڑکی کی جالیوں میں سے آتی روشنی سیدھی دیوار پر آ کر پڑی۔ میں نے اس کی روشنی میں دیوار پر سنہری فریم والی روغنی رنگوں سے بنائی ہوئی ایک تصویر لگی دیکھی جس پر پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ یہ تصویر مغل زمانے کے کسی شہزادے کی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے سر پر کلغی دار سنہری پگڑی تھی۔ پگڑی کی ایک پٹی جواہرات اور ہیروں سے مرصع تھی۔ شہزادے کے ایک ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا جس طرح کہ عام طور پر مغل بادشاہوں کی تصویروں میں ہوا کرتا ہے۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی مجھے جو پہلا احساس ہوا وہ یہ تھا کہ جس شخص کی یہ تصویر ہے میں نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

روہنی بدروح بھی میرے بائیں جانب کھڑی تصویر کو بڑی محویت کے عالم میں دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ ''یہ میرے خاوند مغل صوبیدار شہزادہ شیروان کی تصویر ہے۔ آج سے تین سو برس پہلے اس قلعے میں ہماری بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی تھی۔ کیا تم اس تصویر کو دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں دیکھ رہا ہوں۔''

روہنی نے کہا۔ ''اسے اور قریب ہو کر غور سے دیکھو۔''

میں تصویر کے اور قریب ہو گیا اور تصویر کو غور سے دیکھنے لگا۔ جیسے جیسے میں تصویر کو دیکھ رہا تھا ایک عجیب سا احساس میری رگ و پے پر مسلط ہو رہا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس تصویر نے مجھے کس قدر حیرت زدہ کر دیا تھا۔ روہنی نے شکستہ سی آواز میں کہا۔ ''کیا تم نے ابھی تک اپنی تصویر کو نہیں پہچانا؟ میں نے تو پہلی نظر میں ہی تمہیں پہچان لیا تھا کہ یہی میرا شہزادہ شیروان ہے۔''

وہ تصویر ہو بہو میری شکل تھی۔ میری ہی آنکھیں، میری ہی ناک اور میرے ہی

ہونٹ اور میری ہی پیشانی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ میں نے مغل بادشاہوں کے زمانے کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں بت بنا اپنی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی بھی گنجائش نہیں تھی کہ میں روہنی سے کہتا کہ یہ میری تصویر نہیں ہے۔ روہنی کی بدروح نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بولی۔ ”اس طرف آؤ۔ میں تمہیں ایک اور تصویر دکھاتی ہوں۔“

وہ چند قدم چلا کر ساتھ والی دیوار کے پاس لے گئی۔ اس دیوار کے پاس سنگ مرمر کی میز پر ایک شمع دان پڑا تھا۔ روہنی کی بدروح نے اس شمع کو ایک انگلی سے چھوا۔ انگلی کے چھوتے ہی شمع دان ایک دم سے روشن ہو گیا۔ میں نے بائیں ہاتھ میں شمع دان اٹھا لیا اور آگے بڑھ کر دائیں ہاتھ سے دیوار پر گرے ہوئے سرخ مخمل کے پردے کو ایک طرف ہٹا دیا۔ پردے کے پیچھے دیوار پر فرش سے اوپر تک گئی ہوئی ایک قد آدم تصویر لگی تھی۔ یہ بھی روغنی رنگوں سے بنی ہوئی تصویر یعنی آئل پینٹنگ تھی۔ اس تصویر میں ایک خوبصورت عورت شاہانہ لباس میں مرصع کرسی پر بیٹھی تھی اور ایک شاہانہ لباس والا نوجوان اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کے قریب کھڑا تھا۔ اس نوجوان کے بھی سر پر ہیرے موتی جڑے ہوئے تھے۔

روہنی کی آواز آئی۔ ”اس تصویر کو دیکھ رہے ہو شیروان! یہ تمہاری اور میری..... ہم دونوں کی اکٹھی تصویر ہے۔“

میں چونک اٹھا۔ روہنی کی بدروح نے پہلی بار مجھے اپنے مردہ خاوند شیروان کے نام سے بلایا تھا۔ اس میں کوئی شک شبے کی گنجائش نہیں تھی کی اس تصویر میں جو عورت کرسی پر بیٹھی تھی وہ روہنی ہی تھی اور جو نوجوان اس کے پہلو میں شاہانہ لباس میں کھڑا تھا وہ میں تھا۔

لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ آج سے تین سو سال پہلے بھی میں اس دنیا میں ایک مغل شہزادے کے روپ میں موجود تھا اور اس عورت کا خاوند



رہ چکا تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے میری شکل اس آدمی سے جو تمہارا خاوند تھا ملتی جلتی ہو۔ یہ میں نہیں ہوں میری شکل وصورت کا آدمی ہے.....“

روہنی کی بدروح نے ایک آہ بھری اور کہنے لگی۔ ”ایسا تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم نے ایک مسلمان گھرانے میں جنم لیا تھا۔ تمہارے مذہب میں انسان کا کوئی دوسرا جنم نہیں ہوتا بلکہ مرنے کے بعد وہ صرف حشر کے دن ہی اللہ کے حکم سے اٹھایا جائے گا۔ میں نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر میری پیدائش ایک ہندو گھرانے میں ہوئی تھی اور یہ عقیدہ میرے خون میں رچ بس چکا تھا کہ ایک ہندو عورت یا مرد مرنے کے بعد اپنے کرموں کے مطابق دوسرا جنم لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمہیں اپنی شکل دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا کہ یہ حقیقت میں تم ہی ہو..... لیکن اب میں تمہیں ایک اور چیز دکھاتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اسے دیکھ کر تمہیں یقین آ جائے کہ تم آج سے تین سو سال پہلے میرے خاوند تھے۔“

اب وہ مجھے اُس تابوت کے پاس لے گئی جو کمرے کے وسط میں چبوترے پر رکھا ہوا تھا اور جس پر ایک زرنگار چھتری نے سایہ ڈالا ہوا تھا۔ اس نے مجھے تابوت کے پاس اپنے ساتھ کھڑا کر لیا اور تابوت کے ڈھکن کو دونوں ہاتھوں سے ایک طرف سرکا دیا۔ ایک عجیب ڈراؤنی آواز کے ساتھ ڈھکن ایک طرف کو ہٹ گیا۔ روہنی کی بدروح نے شمع دان اٹھا کر آگے کر دیا۔ شمع کی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ تابوت کے اندر کسی شہزادے کی لاش پڑی تھی۔ یہ شہزادہ میں ہی تھا۔ یہ میری ہی لاش تھی۔ میری ہی شکل تھی۔ میری شکل کے ہی نقش و نگار تھے۔ کوئی بھی دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ یہ میری ہی لاش ہے۔ مجھ پر دہشت طاری ہو گئی۔ کبھی کسی انسان نے اپنی لاش سامنے پڑی ہوئی نہیں دیکھی ہو گی۔ میں پہلا انسان تھا کہ تابوت میں پڑی ہوئی اپنی ہی لاش کو دیکھ رہا تھا پھر بھی مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ یہ بات میرے عقیدے اور عقل کے خلاف تھی۔ بالکل خلاف تھی۔

روہنی کہنے لگی۔ ''شیروان! کیا تم اپنی لاش کو بھی پہچاننے سے انکار کرو گے؟''

خوف کے مارے میرا گلا خشک ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ ایک اتفاق کی بات ہو گئی ہے کہ اس آدمی کی شکل میری شکل سے ملتی جلتی ہے۔''

روہنی نے آہ بھر کر کہا۔ ''میں تمہیں ایک ایسی نشانی دکھاتی ہوں جسے دیکھ کر تمہیں یقین آ جائے گا کہ یہ تمہاری ہی لاش ہے۔''

اس نے شمع دان تابوت کے کنارے پر رکھ دیا اور جھک کر شہزادے کی لاش کی گردن کے گرد لپٹا ہوا کفن ایک طرف ہٹا دیا اور کہا۔ ''یہ دیکھو۔''

میرے داہنے کان کی لو کے نیچے گردن پر سورج گرہن کا ایک سیاہ نشان تھا۔ انسانی انگوٹھے کے نشان کے برابر سورج گرہن کا یہ نشان پیدائشی تھا۔ روہنی نے مغل شہزادے کی لاش کا کفن ایک طرف ہٹا کر مجھے اس کی گردن پر کان کے نیچے دیکھنے کے لئے کہا تو یہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کہ میرے ہم شکل شہزادے کی لاش کے کان کے نیچے بھی سورج گرہن کا وہی نشان موجود تھا۔ روہنی نے کہا۔ ''اسے ہاتھ لگا کر اپنی تسلی کر لو۔ یہ تمہارا ہی نشان ہے اور اصلی ہے۔ اسے کسی نے اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا۔ ایسا ہی نشان تمہارے کان کی لو کے نیچے بھی گردن پر موجود ہے جو تم نے ضرور آئینے میں کئی بار دیکھا ہو گا۔ کیا اب بھی تم یقین نہیں کرو گے کہ تم ہی میرے خاوند شہزادہ شیروان ہو.....؟''

میں نے کہا۔ ''میں اسے نہیں مانتا۔ یہ سب کچھ طلسم، جادوگری اور نظر کا فریب ہے۔ ورنہ یہ لاش اب تک گل سڑ چکی ہوتی۔ کوئی انسانی لاش تین سو سال تک صحیح حالت میں نہیں رہ سکتی۔''

روہنی کی بدروح نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ کوئی انسانی لاش اتنے برس صحیح حالت میں نہیں رہ سکتی۔ یہ بھی اب تک گل سڑ چکی ہوتی لیکن میں نے اسے اپنی طلسمی



طاقت سے صحیح حالت میں رکھا ہوا ہے صرف اس لئے کہ اگر کبھی کسی جنم میں تم مجھے مل گئے اور تمہیں میری باتوں کا یقین نہ آیا تو میں تمہیں تمہاری لاش دکھا کر یقین دلانے کی کوشش کروں گی کہ تم ہی میرے خاوند مغل شہزادہ شیروان ہو جس نے میری خاطر تین سو برس بعد ایک بار پھر شہزادے شیروان کے روپ میں جنم لیا ہے۔''

''یہ سب بکواس ہے۔'' میں نے غصے میں آ کر کہا۔ ''میں ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ میں حیران ہوں کہ تم جو مسلمان ہو چکی ہو کس طرح ان خرافات پر یقین کرتی ہو؟''

روہنی نے ایک گہرا سانس لیا اور بولی۔ ''میں کیسے یقین نہ کروں جبکہ میں یہ سب کچھ حقیقت کے روپ میں اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں اور اس حقیقت کو تم بھی دیکھ رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ طلسم ہے۔ کالا جادو ہے۔ نظر کا فریب ہے۔ تم نے مجھے نظر کے فریب میں مبتلا کر دیا ہوا ہے۔''

روہنی نے کہا۔ ''تمہارے لئے ہو سکتا ہے کہ یہ نظر کا فریب ہو مگر میرے لئے یہ میری گزری ہوئی زندگی اور آنے والے جنموں کی بہت بڑی حقیقت ہے اور اب جبکہ تم کو اس بات کا خود تجربہ ہو چکا ہے کہ تم اس جال میں پھنس چکے ہو اور تمہاری جان کو ہر لمحے خطرہ ہے اس وجہ سے بھی تم اس کو محض نظر کا فریب کہہ کر اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔''

روہنی نے بالکل صحیح کہا تھا۔ اگر وہ سب کچھ خرافات اور توہمات کا کھیل ہی تھا تب بھی میں اس کھیل کا ایک اہم کردار بن چکا تھا اور روہنی کی مدد کے بغیر میں اس دلدل سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ''اگر تم یہی چاہتی ہو کہ میں یہی سمجھوں کہ تمہارے پچھلے جنم میں میں تمہارا خاوند رہ چکا ہوں اور میرا نام شیروان تھا

تو ٹھیک ہے میں اسے مان لیتا ہوں۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟‘‘

روہنی نے تابوت میں پڑی ہوئی اپنے خاوند مغل شہزادے شیروان کی لاش کو ایک نظر دیکھا اور تابوت کے اوپر ڈھکن ڈال دیا۔ شمع دان اس نے پہلے ہی اٹھا کر تابوت کے سرہانے کی جانب چبوترے پر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ ’’میں تمہیں یہاں صرف یہ یقین دلانے کے لئے لائی تھی کہ تم میرے خاوند کی آتما ہو جو تمہارا روپ دھار کر اس زندہ انسانوں کی دنیا میں صرف میری تلاش میں واپس آگئی ہے۔ اب میں تمہیں یہ بتاؤں گی کہ ہم اور تم..... ہم دونوں اپنے دشمن پجاری رگھو کی بدروح کے انتقام سے کیسے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ میرے ساتھ اوپر آجاؤ۔‘‘

ہم تابوت والے تہہ خانے سے نکل کر قلعے کی دوسری منزل پر آگئے۔ روہنی کہنے لگی۔ ’’یہ کبھی ہمارا عالیشان محل ہوا کرتا تھا۔ تمہیں یاد نہیں رہا۔ مجھے سب یاد ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے کتنا پیار تھا۔ ہم صبح شام محل کے باغ میں ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ٹہلا کرتے تھے۔ اب وہ باغ بھی اجڑ چکا ہے، یہ محل بھی کھنڈر بن چکا ہے۔ آؤ اس بالکنی میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ وہاں بیٹھ کر میں تمہیں بتاؤں گی کہ وہ کون سا راستہ ہے جس پر چل کر ہم دونوں اپنے قاتل دشمن پجاری رگھو کی دشمنی سے نجات حاصل کر کے ہمیشہ کے لئے پھر سے ایک ہو سکتے ہیں۔‘‘

یہ ہمیشہ کے لئے ایک ہو جانے والی بات پر میرا یقین بھی نہیں تھا اور میں چاہتا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہو۔ مجھے تو صرف اس غیبی دشمن سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کرنا تھا جو مجھ پر تین چار مرتبہ قاتلانہ حملہ کر چکا تھا۔

اس کھنڈر محل کی بالکونی کبھی سنگ مرمر کی ہوا کرتی تھی اب اس کا رنگ کالا پڑ چکا تھا اور جنگلی بیلوں نے اسے آدھے سے زیادہ ڈھانپا ہوا تھا۔ یہ بالکونی قلعے یا اس کھنڈر محل کی دوسری منزل پر جنگل کے رخ پر تھی اور قلعے کی پرانی دیوار سے باہر کو نکلی



ہوئی تھی۔ بالکونی کی پتھر کی دو جالیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ صرف سامنے کے رخ کی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ فرش سلامت تھا۔ وہاں بیٹھنے کے لئے سوائے فرش کے اور کوئی جگہ نہیں تھی۔

جب ہم بالکونی میں آئے تو میں نے دیکھا کہ اس دوران آسمان بادلوں میں چھپ چکا تھا اور بارش شروع ہو گئی تھی۔ جنگل کی طرف سے بارش میں بھیگی ہوئی بڑی خوشگوار ہوا آرہی تھی۔ ہم بالکونی کے فرش پر ہی بیٹھ گئے۔ ابھی روہنی بدروح نے اپنی داستان شروع نہیں کی تھی کہ بارش تیز ہو گئی اور اس کی بوچھاڑ بالکونی میں ہم پر آنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ بارش کی بوچھاڑ روہنی بدروح پر پڑ رہی تھی مگر نہ اس کا چہرہ گیلا ہو رہا تھا، نہ اس کی زعفرانی ساڑھی ہی بھیگ رہی تھی۔ اس کے برعکس میرے کپڑے بارش کی بوچھاڑوں میں بھیگنے لگے تھے۔

روہنی نے یہ دیکھ کر کہا۔ ’’شیروان! تم بارش میں بھیگ جاؤ گے۔ مجھ پر تو بارش کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ چلو ہم کسی اور جگہ چل کر بیٹھتے ہیں۔‘‘

ہم بالکونی سے اٹھ گئے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ’’روہنی.....‘‘

اس نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ’’تم مجھے روہنی مت کہا کرو۔ مجھے سلطانہ کہہ کر بلایا کرو۔ یاد نہیں یہ نام تم نے خود رکھا تھا اور تمہیں بے حد پسند تھا۔‘‘

میں نے اپنے دل میں کہا جانے میری بلا میں نے تمہارا یہ نام کب رکھا تھا۔ اوپر سے کہا۔ ’’ٹھیک ہے۔ میں تمہیں سلطانہ کہہ کر ہی بلایا کروں گا۔‘‘

’’اب کہو تم کیا کہنے والے تھے؟‘‘ روہنی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ’’یہاں اس قلعے میں تو بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔‘‘

روہنی نے پوچھا۔ ’’تم کہاں بیٹھنا پسند کرو گے۔ مجھے بتاؤ میں تمہیں وہیں لئے چلتی ہوں۔‘‘

مجھے یاد آگیا کہ روہنی تو ایک بدروح ہے وہ تو جہاں چاہے مجھے لے جا سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ ”کسی ایسی جگہ چلتے ہیں جہاں ہم سکون کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر سکیں اور میں کچھ ناشتہ وغیرہ بھی کرلوں۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔“

روہنی ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! جب میں زندہ تھی تم میرے خاوند اور میں تمہاری پتنی ہوا کرتی تھی تب بھی تمہیں صبح کے وقت بڑی بھوک لگا کرتی تھی اور میں نے شاہی بارچی کو حکم دے رکھا تھا کہ تمہارا ناشتہ دن کے پہلے وقت میں تیار کروا کر محل میں بھجوایا کرے..... کاش! تمہیں وہ سب کچھ یاد ہوتا لیکن مجھے یقین ہے کہ آہستہ آہستہ تمہیں وہ سب کچھ یاد آجائے گا اور تم مجھے پہچان لوگے۔ میں مایوس نہیں ہوں۔“

روہنی نے پھر وہی باتیں شروع کردی تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے اسے کہا۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ ہم کہاں جائیں؟“

روہنی نے کہا۔ ”ہم جھانسی چلتے ہیں۔ وہ بڑا شہر ہے اور وہاں ایسے کئی ہوٹل ہیں جہاں تمہیں کھانے کو بھی بہت کچھ مل جائے گا اور تم بیٹھنا بھی وہاں پسند کروگے۔“

میں نے اسے کہا کہ ہمارے پاس تو انڈین کرنسی کا ایک روپیہ بھی نہیں ہے ہم ناشتے وغیرہ کا بل کہاں سے ادا کریں گے۔ اس پر روہنی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بل میں ادا کردوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو..... آؤ میرے ساتھ۔“

”تم تو واپس بالکونی میں جارہی ہو۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”ہم بالکونی کے راستے ہی باہر جائیں گے۔“

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ہم بالکونی میں آگئے۔ بارش موسلادھار ہو رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑیں ہم دونوں پر پڑ رہی تھیں مگر میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ میں بارش میں بالکل نہیں بھیگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں بارش میں کیوں نہیں بھیگ رہا سلطانہ؟“

وہ کہنے لگی۔ ”جب تک تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہے گا تم بارش میں نہیں



بھیگو گے۔ تیار ہو جاؤ۔ ہم جھانسی جارہے ہیں۔“

یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھ کو ذرا سا کھینچا اور ہم بالکونی سے پرواز کر گئے۔ ہم موسلادھار بارش میں جنگل کے درختوں کے اوپر سے ہو کر اڑ رہے تھے۔ یہ میری زندگی کا ایک ایسا تجربہ تھا کہ جسے میں مرتے دم تک فراموش نہ کر سکوں گا۔ میں نے پرندوں کو بارش میں اڑتے دیکھا تھا۔ میں نے ہوائی جہازوں کو بارش میں پرواز کرتے دیکھا تھا لیکن کبھی کسی انسان کو بارش میں پرواز کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اور یہاں میں خود بارش میں زمین سے نہ جانے کتنے فٹ کی بلندی پر درختوں کے اوپر پرواز کر رہا تھا اور دوسری حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بارش کی بوچھاڑیں مجھ پر پڑ رہی تھیں مگر میں بالکل نہیں بھیگ رہا تھا۔ خدا جانے ہماری رفتار کتنی تھی۔ ہم بہت جلد جنگل کے اوپر سے گزر کر کھیتوں پر آگئے۔

میں نے نیچے دیکھا۔ نیچے مجھے ایک ریلوے لائن نظر آئی جو بارش میں بھیگ رہی تھی۔ اس وقت ہم زمین سے زیادہ سے زیادہ پچاس فٹ کی بلندی پر اُڑ رہے تھے۔ روہنی نے کہا۔ ”یہ بمبے بروڑہ ریلوے لائن ہے اور بھوپال سے جھانسی کی طرف جا رہی ہے۔“

ہماری رفتار کافی تیز ہوگئی تھی۔ کیونکہ ہمارے نیچے سے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ کھڑے درخت اور ریلوے لائن کے سگنل بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ اتنی تیز رفتار کے ساتھ پرواز کرنے کی وجہ سے ہوا کے طوفانی تھپیڑے ہمیں لگنے چاہئیں تھے مگر ہمیں صرف اتنی ہی ہوا لگ رہی تھی کہ روہنی کے لمبے بال پیچھے کی جانب اُڑ رہے تھے اور ہوا صرف مجھے چھو کر گزر رہی تھی۔

ہم جھانسی شہر کی فضائی حدود میں داخل ہوگئے۔ جھانسی شہر ابھی اپنی اصلی وضع قطع میں ہی تھا اور شہر کے باہر ماڈرن کالونیاں آباد نہیں ہوئی تھیں، آبادی بھی نہیں بڑھی تھی۔ شہر کے اردگرد ایک خوبصورت باغ تھا۔ وہاں انگریزوں کے زمانے کا

ایک ہوٹل تھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ اس ہوٹل میں امیر لوگ آکر ٹھہرا کرتے تھے یا پھر یورپ سے آئے ہوئے انگریز لوگ آکر ٹھہرتے تھے۔ بارش کی وجہ سے سڑکوں پر رش بالکل نہیں تھا۔ باغ تو خالی پڑا تھا۔ ہم باغ کے ایک کونے میں اتر گئے۔ میں نے سلطانہ سے کہا۔ ”تم میرے ساتھ انسانوں کے درمیان جارہی ہو جو میری طرح زندہ ہیں۔ کیا تم انہیں نظر آؤ گی یا ان کی نظروں سے غائب ہو گی؟“

روہنی کہنے لگی۔ ”میں انہیں اسی طرح نظر آؤں گی جس طرح تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ مجھے ان کے سامنے غائب ہونے کی کیا ضرورت ہے اور پھر ناشتہ کرنے کے بعد ہم وہاں سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ جنگل میں چلے جائیں گے۔“

انگریزوں کے زمانے کا بنا ہوا عالی شان ہوٹل وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر تھا اور اس کی لابی پر پڑا ہوا رنگ برنگا سائبان دور سے نظر آرہا تھا۔ روہنی کہنے لگی۔ ”ہم اس ہوٹل میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ تم یہاں ناشتہ بھی کر لینا۔“

ہم بارش میں ہی ہوٹل کی جانب چل پڑے۔ روہنی نے ابھی تک میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا جس کی وجہ سے میں بارش میں بھیگ نہیں رہا تھا۔ میں نے قمیض پتلون پہن رکھی تھی مگر روہنی بڑے خوبصورت لباس میں تھی۔ اپنے گلے کا قیمتی ہار اور سر پر رکھا ہوا جواہرات کا تاج اس نے قلعے میں غائب کر دیا تھا اس لئے کہ اسے اس شاہانہ تاج میں دیکھ کر خواہ مخواہ وہ لوگوں کی نظروں میں آسکتی تھی جو وہ نہیں چاہتی تھی۔

پرانی طرز کا ہوٹل تھا۔ کھلے کمرے میں جگہ جگہ گول میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر پھولوں والا گلدان پڑا تھا۔ کچھ خوش لباس لوگ بڑی خاموشی سے کہیں کہیں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

ہم بھی ایک میز کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ سرخ وردی والا بیرا آیا تو میں نے اسے ناشتہ لانے کو کہا۔ وہ چلا گیا تو میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”کیا تمہیں کبھی بھوک نہیں لگتی؟“



روہنی مسکرانے لگی۔ ”نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے تین سو سال سے کچھ نہیں کھایا؟“

وہ بولی۔ ”نہیں ایسی بات بھی نہیں ہے۔ اگر کہیں کچھ کھانا پڑ جائے تو کھا بھی لیتی ہوں لیکن میں کھانے پینے کی محتاج نہیں ہوں۔ میں صرف تمہارے لئے انسانی جسم میں ظاہر ہوئی ہوں ورنہ میں ایک روح ہوں، آتما ہوں جو اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرتے ہوئے زمین اور آسمان کے درمیان بھٹک رہی ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ ایک ہندو گھرانے میں پیدا ہوئی۔ عورت کا دوسرا جنم اسی انسانی روپ میں ہوا ہے اور مجھے اس جنم میں اپنا خاوند شیروان مل گیا ہے۔“

میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے تو تم بھول جاؤ۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب بچاری رگھو کی بدروح میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی تو میں فوراً تم سے الگ ہو جاؤں گا۔

بیرا خاموش قدموں سے ناشتے کا ٹرے لے کر آگیا۔ میں ناشتہ کرنے لگا۔ روہنی نے اپنے لئے کافی کی ایک پیالی خود ہی بنالی اور خاموشی سے پینے لگی۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! تمہارے کپڑے بہت پرانے ہو چکے ہیں میں چاہتی ہوں تم یہاں کسی دکان سے نئے ریڈی میڈ کپڑے خرید لو۔“

میں نے کہا۔ ”اس کے لئے پیسے کہاں سے آئیں گے؟“

وہ بولی۔ ”اس کی تم فکر کیوں کرتے ہو۔ میرے پاس بہت پیسے ہیں۔“

میں زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے لئے کافی بنانے لگا۔

O

ہم جس میز پر بیٹھے تھے وہ ہال کمرے کے کونے میں تھی۔ ہمارے ارد گرد کی میزیں خالی تھیں۔ میں نے کافی پیتے ہوئے اس سے پوچھا۔ ”سلطانہ! تمہاری زندگی کی تقریباً ساری کہانی تمہاری زبانی مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارے دشمن پجاری رگھو نے تمہیں قتل کیوں کیا تھا؟“

اس نے بڑی خاموشی سے میری بات سنی۔ پھر کافی کی پیالی آہستہ سے میز پر رکھ دی اور ایک ہاتھ سے اپنی زعفرانی ساڑھی کا پلو سینے پر درست کرتے ہوئے بولی۔

”پجاری رگھو ہماری چھوٹی سی ریاست کا شاہی پجاری تھا۔ میری ماتا جی مجھے گیتا اور ویدوں کی تعلیم دلانے کے لئے پجاری رگھو کے پاس شاہی مندر میں بھیج دیا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں میری عمر دس بارہ سال کی تھی اور میں بڑی خوبصورت ہوا کرتی تھی۔ پجاری رگھو مجھ سے محبت کرنے لگا تھا۔ پھر جب میں جوان ہوئی تو مجھے صوبیدار اور ریاست کے حکمران کے بیٹے شہزادے شیروان سے محبت ہو گئی۔ ہم دونوں چھپ چھپ کر ملا کرتے تھے۔ پجاری رگھو کو یہ بات سخت ناگوار تھی مگر وہ شہزادہ شیروان کے باپ کا ملازم تھا۔ میرے خلاف سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے ماتا جی سے میری شکایت کر دی کہ میں ایک ہندو برہمن لڑکی ہوں اور مسلمان شہزادے سے چھپ چھپ کر ملاقاتیں کرتی ہوں۔ ماتا جی نے مجھے منع کیا مگر میں شہزادے شیروان کی محبت میں سب کچھ بھلا چکی تھی۔ میرے پتا جی سورگباش ہو چکے تھے جو مغل صوبیدار کے وزیر تھے۔ میں شہزادے شیروان سے چھپ چھپ کر



ملتی رہی۔ پھر ایسا ہوا کہ شیروان کے والد کا انتقال ہو گیا اور شیروان ریاست کا حکمران ہو گیا۔ صوبیدار بنتے ہی اس نے مجھ سے شادی کر لی۔ میں شادی کے بعد مسلمان ہو گئی۔ ایک تو میں نے شیروان سے شادی کر لی تھی دوسرے میں نے ہندو دھرم چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا تھا۔ پجاری رگھو میرا جانی دشمن بن گیا اور در پردہ مجھے قتل کرنے کی سازشیں کرنے لگا۔ مگر شہزادہ شیروان کے ہوتے ہوئے وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر مقدر میں جو لکھا ہوتا ہے اسے کون ٹال سکتا ہے۔ میرا خاوند اور میرا محبوب شہزادہ شیروان کچھ روز بیمار رہنے کے بعد چل بسا۔ میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ ماتا جی پہلے ہی سورگباش ہو چکی تھیں۔ اگرچہ میں نے ریاست کا تخت سنبھال لیا تھا مگر میں آخر ایک کمزور عورت تھی اور اپنے دشمن پجاری رگھو کی سازشوں کا اکیلی مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک رات میں اپنی خواب گاہ میں سو رہی تھی کہ چار حبشی غلام خواب گاہ میں داخل ہوئے اور مجھے زبردستی اٹھا کر قلعے کے اس تہہ خانے میں لے گئے جہاں تم نے مجھے قتل ہوتے دیکھا تھا۔ وہاں مجھے چبوترے پر باندھ کر لٹا دیا گیا اور پجاری رگھو کے حکم سے مجھے قتل کر دیا گیا۔ مجھے قتل کرنے کے بعد اس نے اپنی طلسمی طاقت سے میری آتما کو ایک مرتبان میں بند کر کے مرتبان چبوترے کے شگاف میں دفن کر دیا تاکہ میں مرنے کے بعد کسی جنم میں بھی دنیا میں واپس نہ آ سکوں اور یوں میری آتما کو کبھی نروان نصیب نہ ہو۔ میرے قتل کے منظر کو تم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔“

میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔ ”اس منظر کی حقیقت کیا تھی؟“

روہنی بدروح نے کہا۔ ”میرے قتل کے پندرہ بیس سال بعد پجاری رگھو بھی مر گیا۔ مرنے کے بعد اس کی روح نے ایک بدروح کی شکل اختیار کر لی کیونکہ اس نے ایک زندہ انسان کو قتل کیا تھا جو بہت بڑا پاپ ہے۔ اب ایسا ہوتا ہے کہ ہر سال ٹھیک اسی دن اور اسی وقت آدھی رات کو جب مجھے رگھو کے حبشی غلاموں نے قتل کیا تھا رگھو

کی بدروح ان غلاموں کی بدروح کے ساتھ قلعے کے محل میں ظاہر ہوتی۔ پجاری رگھو کی بدروح اپنے زبردست جادو کے اثر سے میری آتما کو واپس لا کر میرے جسم میں داخل کرتا اور میرے قتل کا بھیانک منظر ایک بار پھر دہرایا جاتا۔ یہ یا تو پجاری رگھو کے ضمیر کو اس کے گناہ کی سزا مل رہی تھی یا پجاری رگھو کی بدروح مجھے ایک بار پھر قتل کر کے تسکین حاصل کرتی تھی۔ بہر حال یہ منظر ویران قلعے کے اندر ہر سال ایک خاص رات کو دہرایا جاتا تھا۔ مجھے اسی طرح حبشی غلام قتل کرتے اور پھر پجاری رگھو کی بدروح میری آتما کو مرتبان میں بند کر کے چبوترے کے شگاف میں دفن کر دیتی۔ اس کے طلسمی منتروں کے اثر سے میری آتما کا آواگون کا چکر رک گیا تھا۔ اگر آواگون کا چکر چلتا رہتا اور میں اپنے ہندو عقیدے کے مطابق اپنے اچھے برے کرموں کے مطابق ایک جنم سے دوسرا جنم لیتی رہتی تو میں امید کر سکتی تھی کہ کبھی نہ کبھی میرے برے اعمال کی سزا ختم ہو جائے گی اور مجھے جنم جنم کے چکر سے نجات مل جائے گی۔ لیکن میرے دشمن اور میرے قاتل پجاری رگھو نے میری آتما کو مرتبان میں بند کر کے میری آتما کی ترقی کا راستہ بند کر دیا تھا اور میری آتما مرتبان میں ہمیشہ کے لئے قید ہو کر رہ گئی تھی۔۔۔۔۔ لیکن آخر میرے محبوب شہزادے کی روح کو مجھ پر رحم آ گیا اور اس نے میری نجات کے لئے تمہیں اپنے روپ میں بدل کر قلعے میں بھیج دیا۔ یہ وہی منحوس رات تھی جس رات کو آج سے تین سو برس پہلے مجھے قتل کیا گیا تھا۔ تم نے قلعے کی گیلری میں چھپ کر مجھے قتل ہوتے اور پھر قاتل رگھو کو مرتبان میں میری آتما کو بند کر کے چبوترے کے اندر دفن کرتے دیکھا۔ چونکہ میرے محبوب شہزادے شیروان کی روح نے تمہیں میری نجات کے لئے بھیجا تھا اس لئے تمہارے دل میں خیال آیا کہ دیکھا جائے قاتل پجاری رگھو نے مرتبان میں کیا چیز بند کر کے مرتبان کو دفن کیا ہے۔ جب مجھے قتل کرنے کا خونیں منظر ختم ہو گیا اور پجاری رگھو اور حبشی غلاموں کی بدروحیں غائب ہو گئیں تو تم گیلری سے اتر کر چبوترے کے



پاس آئے۔ تم نے چبوترے کی اینٹیں اکھاڑ کر مرتبان باہر نکالا۔ میری آتما مرتبان کے اندر قید اپنی محبت کی طاقت کے زیر اثر یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھر تم نے مرتبان کھول دیا۔ مرتبان کے کھلتے ہی میری آتما قاتل پجاری رگھو کے منحوس طلسم کی قید سے آزاد ہو گئی۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے تم بھی جانتے ہو اور میں بھی جانتی ہوں۔ میں نے تمہیں دیکھتے ہی تمہارے روپ میں اپنے محبوب شہزادے شیروان کو پہچان لیا تھا لیکن تم نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ اس کے بعد میرے سامنے جو سب سے بڑا مسئلہ تھا وہ یہ نہیں تھا کہ تم مجھے پہچانو کہ میں کون ہوں۔ یہ سب کچھ بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت میرے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ قاتل پجاری رگھو سے تمہاری جان کیسے بچائی جائے۔ تم نے میری آتما کو آزاد کر دیا تھا اور پجاری رگھو میرے ساتھ اب تمہارا بھی دشمن ہو گیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے تو اتنی آسانی سے دوبارہ اپنے طلسم کے چکر میں قید نہیں کر سکے گا لیکن تمہیں بڑی آسانی سے ہلاک کر دے گا۔ پس اس کے بعد میرے فرض اور میری محبت کا تقاضا یہی تھا کہ تمہیں پجاری رگھو کے ہر قاتلانہ حملے سے بچایا جائے۔ چنانچہ جب بھی پجاری قاتل نے تمہاری جان لینے کی کوشش کی میں نے عین وقت پر پہنچ کر اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا اور یہ سلسلہ اس وقت سے لے کر جب تم نے میری آتما کو رگھو کی قید سے آزاد کیا تھا اس وقت تک جاری ہے۔۔۔۔۔"

میں نے پوچھا۔ "اور یہ منحوس سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟"

روہنی نے کہا۔ "میں تمہیں یہی بتانے کے لئے اپنے ساتھ لائی ہوں کہ تمہیں کیسے اس خونی چکر سے نکالا جا سکتا ہے۔"

میں نے بے چینی سے کہا۔ "میں نے تمہاری رام کہانی سن لی ہے۔ اب خدا کے لئے جلدی سے یہ بتاؤ کہ میں اس منحوس چکر سے کیسے آزاد ہو سکتا ہوں؟"

روہنی کافی بنا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "یہاں سے میں تمہیں اپنے ساتھ بدروحوں

کی دنیا میں لے جا رہی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم ایک بدروح ہی نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ بدروحوں کی دنیا میں جا کر خدا جانے میرا کیا حال ہو گا۔"

روہنی نے ٹھنڈی آہ بھری اور بولی۔ "میں بری آتما نہیں ہوں۔ یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ تم میرے محبوب شہزادے کے روپ میں ضرور ہو مگر چونکہ میرا محبوب شیروان مسلمان تھا اس لئے یہ اس کا دوسرا جنم نہیں ہے۔ مسلمانوں میں کوئی آواگون نہیں ہوتا۔ اگر میں نے کسی مسلمان گھرانے میں جنم لیا ہوتا تو میں بھی آواگون کے چکر سے آزاد ہوتی۔ لیکن یہ میری بد قسمتی ہی ہے۔ اگرچہ میں مسلمان ہو گئی تھی لیکن میرا جنم ہندو ماتا پتا کے ملاپ سے ہوا تھا اور آواگون میرے ساتھ ہی میری روح میں داخل ہو گیا تھا۔ لیکن شہزادہ شیروان کا جنم ایک مسلمان ماتا پتا سے ہوا تھا اس کا کوئی دوسرا جنم نہیں تھا۔ لیکن وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور موت کے بعد بھی اسے میرا احساس تھا چنانچہ اس نے تمہیں اپنا روپ دے کر میری مدد کے لئے بھیج دیا۔ وہ میرے لئے یہی کر سکتا تھا اور اس کا اتنا کرنا ہی میرے لئے بہت تھا۔ اب میں تمہارے سامنے اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ حقیقت میں تم میرے محبوب شہزادے شیروان نہیں ہو اور یہ شیروان کا دوسرا جنم نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جس طرح میں نے تمہیں پہچانا تھا تم بھی مجھے دیکھتے ہی پہچان لیتے۔ تم نے ٹھیک کہا تھا کہ تمہاری شکل شہزادے شیروان سے ملتی جلتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تمہارے دل میں مرتبان کھول کر میری آتما کو آزاد کرنے کا خیال میرے محبوب شیروان کی روح نے ہی تمہارے دل میں ڈالا تھا۔"

میں روہنی کی کافی داستان سن چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "سلطانہ! تم مختصر لفظوں میں مجھے یہ بتاؤ کہ تم مجھے اپنے ساتھ بدروحوں کی دنیا میں لے جا رہی ہو۔ کیا بدروحوں کی دنیا سے میں زندہ واپس آ جاؤں گا؟"



روہنی نے اس کے جواب میں کہا۔ "تم وہاں میرے ساتھ جاؤ گے۔ کسی بدروح کو یہ ہمت نہیں ہو گی کہ وہ تمہیں ہاتھ بھی لگا سکے۔"

میں نے اس سے ایک بڑا اہم سوال پوچھا۔ میں نے کہا۔ "لیکن قاتل پجاری رگھو کی بدروح بھی تو وہیں ہو گی اور وہ میری دشمن بدروح ہے۔ کیا وہ مجھے بدروحوں کی دنیا سے زندہ واپس جانے دے گی؟"

روہنی نے کہا۔ "بدروحوں کی جس دنیا میں، میں تمہیں لے کر جا رہی ہوں پجاری رگھو کا اس دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی بدروحوں کی دنیا دوسری ہے۔ وہ کسی اور بدروحوں کی دنیا کا سردار ہے۔ اور پھر میں تمہیں غائب کر کے اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔"

اتنے میں ہوٹل کا باوردی بیرا قریب سے گزرا تو روہنی نے اسے بلا کر کہا۔

"ناشتے کا بل لے آؤ۔"

میں روہنی کا منہ تکنے لگا کہ یہ بل کہاں سے ادا کرے گی۔ جب بیرا چلا گیا تو روہنی میرے دل کی بات سمجھتے ہوئے بولی۔ "اس وقت جھانسی شہر کے اوپر اور زمین کے اندر دولت کے جتنے خزانے ہیں ان سب کو میں دیکھ رہی ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں حاصل کرنے کے لئے ہم بدروحوں کو بھی ایک اخلاقی ضابطے کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔"

روہنی نے زعفرانی ساڑھی کے نیچے اسی رنگ کا بلاؤز پہن رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی پرس وغیرہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ اپنے بلاؤز کے اندر سے کچھ روپے نکالے گی۔ لیکن اس نے ایک لمحے کے لئے اپنے ہاتھ کے اوپر اپنی ساڑھی کا پلو ڈال دیا۔ دوسرے لمحے اس نے پلو ہٹا کر اپنا ہاتھ کھولا تو اس کے ہاتھ میں انڈین کرنسی کے سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے زیادہ مدت نہیں ہوئی تھی اور ابھی سو روپے کے نوٹ کی بڑی قیمت ہوا کرتی تھی۔

بیرا بل لے کر آ گیا۔ بڑا مہنگا ہوٹل تھا مگر ناشتے کا بل ساٹھ روپے ہی بنا تھا۔ روہنی نے اس کی پلیٹ میں سو روپے کا نوٹ رکھ دیا۔ بیرا چلا گیا تو وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ ”یہاں سے چل کر تمہیں اپنے لئے نئے کپڑے خریدنے ہوں گے۔ یہ کپڑے بڑے گندے ہو چکے ہیں۔“

اس کے پاس بہت روپے تھے میں جو چاہے خرید سکتا تھا۔ بیرا باقی پیسے لے کر آیا تو روہنی نے کہا۔ ”یہ تمہارا انعام ہے۔ تم رکھ لو۔“

بیرے نے خوش ہو کر سلام کیا اور چلا گیا۔ ہم اٹھنے ہی والے تھے کہ میں نے دیکھا ایک آدمی تین پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ ہماری طرف آ رہا ہے۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ وہ کسی دوسری خالی میز کی طرف جا رہا ہے۔ لیکن جب وہ ہمارے پاس آ کر رک گیا تو میں نے اور روہنی نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ گہرے سانولے رنگ کا وہ آدمی قمیص پتلون میں تھا۔ چہرے پر کرختگی تھی۔ تینوں سپاہی رائفلیں لئے ہوئے تھے۔ سپاہی ہمارے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے تھے جیسے انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا ہو۔ میں نے اس آدمی سے پوچھا۔ ”کیوں جناب کیا بات ہے؟“

اس آدمی نے میری اور روہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم دونوں پاکستانی جاسوس ہو اور غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوئے ہو۔ میں تمہیں گرفتار کرتا ہوں۔“

پھر اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”انہیں ہتھکڑیاں لگا کر تھانے لے چلو۔“

میں نے کہا۔ ”ہم پاکستانی جاسوس نہیں ہیں بھائی۔“

”تو پھر کون ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہم ہندوستان کے ہی رہنے والے ہیں اور عزت دار لوگ ہیں۔ آپ کو ہمارے ساتھ اس طرح بات نہیں کرنی چاہئے۔“

وہ آدمی بولا۔ ”مجھے کس طرح بات کرنی چاہئے میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہتر



یہی ہے کہ تم دونوں خاموشی سے میرے ساتھ تھانے چلے چلو ورنہ مجھے دوسری طرح لے جانا بھی آتا ہے۔

میں کچھ کہنے لگا تو روہنی نے مجھے روک دیا اور اس پولیس کے آدمی سے کہا۔

”ٹھیک ہے بھائی صاحب! ہمیں گرفتار کر لیجئے۔“

میں نے روہنی سے کہا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے سلطانہ!“

پولیس کے آدمی نے کہا۔ ”میں جانتا تھا کہ تم مسلمان ہو اور پاکستان سے یہاں جاسوسی کرنے آئے ہو اور تمہارے پاس کوئی ویزا پاسپورٹ نہیں ہے۔“

اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ”گرفتار کر لو انہیں اور تھانے لے چلو۔“

اور سپاہیوں نے ہمیں یعنی مجھے اور روہنی کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ میں حیران تھا کہ روہنی نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی تھی۔ ہال میں بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ ہمیں حیرانی اور تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ ہم سپاہیوں کے ساتھ چل پڑے۔ ایک سپاہی نے ہماری ہتھکڑیوں کی لوہے کی زنجیر تھام رکھی تھی اور دوسرے دونوں سپاہی ہمیں گھیرے میں لے کر ساتھ چل رہے تھے۔ رائفلیں انہوں نے اس طرح پکڑ رکھی تھیں کہ جیسے ہمیں ابھی شوٹ کر دیں گے۔

مجھے روہنی بدروح پر غصہ آ رہا تھا کہ ہمیں سب لوگوں کے سامنے ہتھکڑیاں لگ گئی ہیں اور وہ اپنی غیبی طاقت کے باوجود یہ سب کچھ برداشت کر رہی ہے۔ لیکن بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ جس بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہم اپنی مہم پر روانہ ہونے والے تھے اس کی خاطر ہمیں اپنی عزت کی تھوڑی سی قربانی دینی ضروری تھی۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو پہلے قدم پر ہی ہم ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے۔ اس کی یہ بات بعد میں بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بہرحال وہ ایک خاص وقت کے گزر جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ وقت گزر گیا تو روہنی بدروح کی غیبی طاقت حرکت میں آ گئی۔

اس وقت ہم پولیس کی گاڑی میں بیٹھے پولیس سٹیشن جا رہے تھے۔ ہمیں ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں اور مسلح سپاہی ہماری نگرانی کر رہے تھے۔ سویلین کپڑوں والا سانولے رنگ کا پولیس افسر اگلی سیٹ پر بیٹھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد گردن موڑ کر ہمیں دیکھ لیتا تھا۔ اتنے میں روہنی نے پولیس افسر سے کہا۔ ”گاڑی روک دو۔“

پولیس افسر نے گردن موڑ کر ایسے روہنی کی طرف دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ روہنی نے دوبارہ کہا۔ ”اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے تو جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔ گاڑی روک دو۔“

پولیس افسر نے اپنی جیب سے پستول نکال کر اس کا رخ روہنی کی طرف کر دیا اور بولا۔ ”خاموشی سے بیٹھی رہو۔ میں جانتا ہوں تم کون ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ”یہی تو مصیبت ہے کہ تم نہیں جانتے میں کون ہوں۔ اگر جانتے ہوتے تو کبھی ہمارے پاس نہ آتے۔ اب بھی میں تمہیں مہلت دیتی ہوں گاڑی روک دو۔ ہم تمہیں کچھ کہے بغیر یہاں سے اتر جائیں گے۔“

گاڑی جھانسی کی کسی سڑک پر دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ سپاہی ایک دم چوکس ہو گئے تھے اور انہوں نے رائفلوں کا رخ ہماری طرف کر دیا تھا۔ پولیس آفیسر نے سپاہیوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ اس عورت کا منہ نوچ لو۔“

روہنی نے پہلا کام یہ کیا کہ فوراً میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے بعد جیسے ہی ایک سپاہی نے روہنی کو مُکا مارنے کے لئے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اس کا ہاتھ وہیں رہ گیا اور سپاہی پتھر کے بت کی طرح اسی حالت میں ساکت ہو گیا۔ پولیس آفیسر نے چلا کر دوسرے سپاہیوں سے کہا۔ ”مار مار کر اس عورت کی چمڑی ادھیڑ دو۔“

دوسرے سپاہیوں نے روہنی کو پیٹنے کے لئے ہاتھ اٹھائے تو وہ بھی اپنی اپنی جگہوں پر پتھر کے بت بن گئے اور گاڑی کے دھچکوں کے ساتھ آگے کو گر گئے۔ پولیس آفیسر نے یہ حماقت کی کہ پستول سے روہنی پر فائر کر دیا۔ روہنی کو تو کچھ نہیں



ہونا تھا لیکن پولیس آفیسر کے کپڑوں میں اسی وقت آگ بھڑک اٹھی۔ اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔ ڈرائیور نے فوراً گاڑی کھڑی کر دی۔

اس کے ساتھ ہی میں بھی روہنی کے ساتھ ہی غائب ہو گیا۔ غائب ہونے کے بعد ہم گاڑی سے سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر دوبارہ انسانی جسم میں ظاہر ہو گئے۔ ہماری ہتھکڑیاں غائب ہو چکی تھیں۔ ہم پولیس کی گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے جس میں ہمارے دیکھتے دیکھتے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گاڑی کی جگہ شعلے ہی شعلے نظر آ رہے تھے۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آنے لگا۔ اگر انہیں ہم پر کسی قسم کا کوئی شک ہو گیا تھا تو اس میں ان کا اتنا قصور نہیں تھا کہ انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ میں نے روہنی سے گلہ آمیز لہجے میں کہا۔ ”سلطانہ! تمہیں انہیں ہلاک نہیں کرنا چاہئے تھا۔“

روہنی بدروح نے پہلی بار میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”تم ان باتوں میں آئندہ دخل مت دینا۔“ اور وہ پولیس گاڑی کے شعلوں کو دیکھنے لگی۔ وہاں کچھ لوگ جمع ہو گئے تھے جو سڑک کی مٹی اٹھا اٹھا کر شعلوں پر ڈال کر انہیں بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ کہنے لگی۔ ”چلو ایک دکان پر چل کر تمہارے لئے کپڑے خریدتے ہیں۔“ روہنی آج سے تین سو سال پہلے جھانسی کے صوبے کی ملکہ کی حیثیت سے رہا کرتی تھی۔ مگر وہ آج کے جھانسی شہر سے بھی اچھی طرح واقف تھی۔ اسے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں سے مل سکتی ہے۔ وہ مجھے شہر کے گنجان علاقے کی ایک بہت بڑی دکان میں لے گئی جہاں عورتوں، مردوں اور بچوں کے ریڈی میڈ کپڑے فروخت ہوتے تھے۔ میں نے اپنے لئے ایک ہلکے رنگ کی نئی پتلون اور جیکٹ خرید کر وہیں پہن لی۔ میرے پرانے کپڑے واقعی اب اس قابل نہیں رہے تھے کہ میں انہیں پہنتا۔

بارش بہت دیر پہلے کی رک چکی تھی۔ جھانسی شہر کا موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ ہم شہر کے گنجان بازاروں سے نکل کر ایک کھلی سڑک پر آ

گئے۔ روہنی میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی چال میں مہارانیوں والا وقار تھا۔ اس کے گلے کا ہار اور سر کا چھوٹا تاج ابھی تک غائب تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”میں سب سے پہلے اپنے محل میں جاؤں گی۔ وہاں میں تمہیں ایک نئی چیز دکھانا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد ہم وہیں سے بدروحوں کی دنیا کی طرف پرواز کر جائیں گے۔“

”ہم کتنی دیر میں بدروحوں کی دنیا میں پہنچیں گے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی ایک ایسی جگہ پر آ گئی جہاں آس پاس کوئی انسان نظر نہیں آتا تھا۔ کہنے لگی۔ ”تم ہماری دنیا کے فاصلوں کا انسانوں کے بنائے ہوئے پیمانوں سے اندازہ نہیں لگا سکتے۔ تم یوں سمجھ لو کہ اگر فضا میں پانچ ہزار میل فی گھنٹے کے حساب سے ایک ہزار سال تک سفر کرتے رہو تو تم بدروحوں کی دنیا میں پہنچو گے۔“

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ”اور ہم کتنی مدت میں پہنچیں گے؟“

”میرے ساتھ پرواز کرتے ہوئے جب تم بدروحوں کی دنیا میں پہنچو گے تو تمہیں ایسا محسوس ہو گا جیسے تم نے ابھی سفر شروع کیا تھا اور ابھی پہنچ گئے ہو۔“

روہنی بدروح کی یہ باتیں میری سمجھ سے باہر تھیں لیکن اپنی نجات کے لئے مجھے اس کے ساتھ جانا ہی پڑ رہا تھا۔ اندر سے میں یہ سوچ کر ضرور ڈر گیا تھا کہ اگر یہ حسین و جمیل بدروح واقعی مجھے اتنی دور لے جا رہی ہے تو کیا میں وہاں سے واپس آ سکوں گا؟ اگر کسی وجہ سے میں وہیں رہ گیا تو میرا کیا حشر ہو گا؟ یہ سوچ کر ہی میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ اگر مجھے منحوس پجاری رگھو کی بدروح کے اپنے اوپر پے در پے قاتلانہ حملوں کا تلخ تجربہ نہ ہو چکا ہوتا تو میں روہنی بدروح کے ساتھ ایک قدم بھی نہ چلتا۔ لیکن یہ میری مجبوری تھی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم فضا میں بلند ہو گئے۔

O



روہنی کا ویران قلعے والا محل وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم بڑی جلدی قلعے کی چھت پر اتر گئے۔ وہ مجھے نیچے قلعے کے اس آسیب زدہ کمرے میں لے آئی جہاں اس کے مرحوم خاوند اور میرے ہم شکل مغل شہزادے شیروان کی لاش تابوت میں بند پڑی تھی۔ شمع دان کی موم بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ روہنی نے بجھی ہوئی موم بتیوں کو باری باری اپنی انگلی سے چھوا اور وہ روشن ہو گئیں۔ اس نے شمع دان اٹھا کر تابوت کے سرہانے ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے بعد اس نے تابوت کے ڈھکنے کو ایک طرف سرکا دیا۔

موم بتیوں کی روشنی تابوت میں پڑی تو میں نے دیکھا کہ جہاں رات کے وقت میں نے روہنی کے مرحوم خاوند شیروان کی لاش دیکھی تھی وہاں اب چند ایک انسانی ہڈیوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”شہزادے شیروان کی لاش تو رات کو بالکل صحیح حالت میں تھی۔ پھر یہ اتنی جلدی ہڈیوں کا ڈھانچہ کیسے بن گئی؟“

روہنی کی بدروح نے اداس آواز میں کہا۔ ”رات جب تم نے میرے محبوب شہزادے شیروان کی لاش دیکھی تھی تو اس وقت میں تمہیں تین سو سال پیچھے لے گئی تھی۔ جب تم لاش کو دیکھ رہے تھے تو اسے تابوت میں بند کئے صرف دو دن ہی گزرے تھے۔ یہ میں نے اس لئے کیا تھا کہ میں تمہیں تمہارے ہم شکل شہزادے شیروان کا چہرہ اور اس کی گردن کا سورج گرہن کا نشان دکھانا چاہتی تھی تاکہ تمہیں

میری اس بات کا یقین آ جائے کہ میرے مرحوم شہزادے نے تمہیں اپنا روپ دے کر میری مدد کے لئے قلعے میں بھیجا تھا ورنہ میری اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں مردہ ہڈیوں میں جان ڈال کر اسے پھر سے انسانی شکل دے سکوں۔"

پھر وہ تابوت پر جھک گئی۔ اس نے شہزادے شیروان کی کھوپڑی کو اٹھا لیا۔ اس وقت روہنی یعنی سلطانہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کھوپڑی کے ماتھے کو چوم لیا۔ اس کے بعد اس نے کھوپڑی کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی جس پر سیاہ نگ جڑا ہوا تھا۔ روہنی نے بڑے ادب واحترام کے ساتھ شہزادے کی کھوپڑی کو اسی جگہ تابوت کے اندر رکھ دیا جہاں سے اسے اٹھایا تھا۔ پھر تابوت کو بند کر کے شمع دان کے قریب ہو کر اس نے انگوٹھی پر ایک نظر ڈالی اور پھر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "اپنا ہاتھ آگے کرو۔"

میں نے اپنا بایاں ہاتھ آگے کر دیا۔ اس نے سیاہ نگینے والی انگوٹھی میری انگلی میں ڈال دی اور کہنے لگی۔ "یہ انگوٹھی تمہیں بدروحوں کی دنیا میں وہاں کے آسیب سے محفوظ رکھے گی اور انسانوں کی دنیا میں تم پر دشمن پجاری رگھو کے بڑے سے بڑے طلسمی منتر کا کوئی اثر نہیں ہو گا۔ اس انگوٹھی کو اس وقت تک اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا جب تک کہ ہم اپنے دشمن پجاری رگھو سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل نہیں کر لیتے اور میری بدروح کو دنیا میں دربدر بھٹکتے رہنے سے نجات نہیں مل جاتی۔"

میں نے کہا۔ "میں تو اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ یہ انگوٹھی میرے پاس ہی رہے لیکن اگر کسی وجہ سے یہ مجھ سے گم ہو گئی یا پجاری رگھو اپنی جادو کی طاقت کے زور سے یہ مجھ سے چھین کر لے گیا تو پھر کیا ہو گا؟"

روہنی نے کہا۔ "پھر تم بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتے ہو کیونکہ میں انسانوں کی دنیا میں کسی وقت تمہاری مدد کو نہیں بھی پہنچ سکتی۔ جب دشمن پجاری رگھو سے انسانوں کی دنیا میں ہماری کھلی جنگ شروع ہو جائے گی تو وہ اپنے طلسمی منتروں کا وار



مجھ پر بھی کرے گا۔ اس کی بدی کی طاقت کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ اگر میں ذرا سی دیر بلکہ پلک جھپکنے کے وقفے جتنی دیر کے لئے بھی غائب ہو جاؤں تو پجاری رگھو اپنے طلسم کی طاقت سے فوراً مجھے اپنے قبضے میں کر سکتا ہے۔ اس لئے تمہیں کوشش کرنی ہو گی بلکہ ہر حالت میں اس انگوٹھی کو اپنی انگلی میں یا کسی جیب میں ہر وقت اپنے پاس رکھنا ہو گا۔ بس تم پر میری طرف سے یہی سب سے بڑی شرط اور سب سے بڑی پابندی ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہو گا ہم اکٹھے مل کر دشمن پجاری کا اس وقت تک مقابلہ کریں گے جب تک کہ میں اسے اس کے آسیبی منتروں کے ساتھ جہنم کی آگ میں بھسم نہیں کر دیتی....."

حالات نے مجھے ایک بہت بڑی آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس آزمائش میں ضرور کامیاب کرے گا اور میں اپنی ایمان کی طاقت کے ساتھ بت پرست پجاری رگھو کی بدروح کو جہنم کی آگ کے سپرد کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا تاکہ اس کے بعد اس کی بدروح بنی نوع انسان کو کبھی کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

روہنی کہنے لگی۔ "بدروحوں کی دنیا میں، میں تمہیں بدروحوں کے جس قبیلے میں لے جا رہی ہوں اس پر کالی بدروح کی حکومت ہے۔ کالی بدروح بڑی خونخوار بدروح ہے اور انسانوں کی دشمن ہے۔ اس کے گلے میں انسانی ہڈیوں کی مالائیں ہر وقت پڑی رہتی ہیں۔ ان ہڈیوں میں اتنی شکتی ہے کہ اگر ان میں سے مجھے ایک چھوٹی سی ہڈی بھی مل جائے تو مجھے میرے دشمن پجاری رگھو جتنی طاقت حاصل ہو سکتی ہے۔ میں اس لئے بدروحوں کی دنیا میں جا رہی ہوں کہ کال بدروح کی مالا میں پروئی ہوئی انسانی ہڈیوں کا کوئی مہرہ حاصل کر سکوں۔ تمہیں اپنے ساتھ اس لئے لے جا رہی ہوں کہ تمہیں اپنی سہیلی مالینی کی بدروح سے ملوا دوں تاکہ اگر زندگی کے کسی لمحے کسی حادثے کی وجہ سے میں ہمیشہ کے لئے تم سے بچھڑ جاؤں تو مالینی کی بدروح تمہیں پجاری رگھو

کے قاتلانہ حملے اور اس کے خطرناک جادو سے بچا سکے گی۔"

میں نے اس سے مالینی کے بارے میں سوال کیا۔ "مالینی بدروح کیوں بن گئی ہے؟"

روہنی کہنے لگی۔ "مالینی سے ایک بہت بڑا گناہ، ایک بہت بڑا پاپ ہو گیا تھا جس کی وہ سزا بھگت رہی ہے۔ جب تک اس کی سزا کی مدت پوری نہیں ہو جاتی وہ بدروح ہی رہے گی۔ وہ میری بڑی پیاری سہیلی تھی۔ جب ہم دونوں زندہ تھیں تو وہ میرے محل میں میرے ساتھ ہی رہا کرتی تھی۔"

ہم محل کی چھت پر کھڑے تھے۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش رکی ہوئی تھی۔ روہنی نے کہا۔ "اپنا ہاتھ مجھے دے دو۔ ہم بدروحوں کی دنیا میں جا رہے ہیں۔ گھبرانا بالکل نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں نے تمہارے ہاتھ میں تابوت کی انگوٹھی ڈال دی ہے جو تمہیں بدروحوں کے برے اثرات سے محفوظ رکھے گی۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگ رہا؟"

"بالکل نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ لیکن دل میں ڈر ضرور رہا تھا۔ بدروحوں کی دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر میرا روہنی کے ساتھ جانا بہت ضروری تھا۔ یہ ایک طرح سے میری زندگی اور موت کا معاملہ تھا۔ روہنی ہوا میں پرواز کرنے کے لئے بالکل تیار تھی۔ میرا ہاتھ اس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ کی ٹھنڈی گرفت میرے دل میں مزید خوف پیدا کر رہی تھی۔

اس کے بعد مجھے ایک ہلکا سا دھچکا لگا اور جیسے کسی نے مجھے اوپر اٹھا دیا۔ میرے پاؤں ویران قلعے کی چھت سے دس پندرہ فٹ بلند ہو گئے تھے اور پھر میں روہنی کے ساتھ اوپر ہی اوپر اٹھتا چلا گیا یہاں تک کہ ہم سیاہ بادلوں میں داخل ہو گئے۔ سیاہ بادلوں میں مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف یہ احساس تھا کہ روہنی میرے ساتھ ہے اور میرا ہاتھ اس نے پکڑ رکھا ہے۔ میں دل میں دعا مانگنے لگا کہ یا اللہ پاک مجھے



خیریت سے واپس لے آنا۔ میں کبھی ان خرافات میں نہ پڑتا مگر تو جانتا ہے کہ میں مجبور کر دیا گیا ہوں اور محض میری حماقت نے مجھے اس انجام تک پہنچا دیا ہے۔ نہ میں قلعے کا مرتبان کھول کر روہنی کی بدروح کو آزاد کرتا اور نہ اس مصیبت میں پھنستا۔ مگر جو ہو چکا تھا اسے میں واپس نہیں موڑ سکتا تھا۔ مجھے اب اس کا توڑ کرنا تھا تاکہ میری جان محفوظ رہے اور میں ناحق نہ مارا جاؤں۔

ہم سیاہ کالی گھٹاؤں میں سے نکل کر سفید دھند کے بادلوں میں داخل ہو چکے تھے۔

مجھے رفتار کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ کبھی محسوس ہوتا کہ میں ہوا میں ایک جگہ پر معلق ہو گیا ہوں اور کبھی لگتا کہ میں اس قدر تیز سپیڈ کے ساتھ فضا میں پرواز کر رہا ہوں کہ جیسے بجلی کی چمک سفر کر رہی ہو۔ پہلے بھی میں روہنی کے ساتھ فضا میں اڑتا رہا تھا۔ اس اڑان میں مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا مگر اب میرے جسم کا وزن غائب ہو گیا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے میں ہوا سے بھی زیادہ ہلکا ہو گیا ہوں۔ کچھ پتہ نہیں یہ کیفیت کتنی دیر تک قائم رہی۔ پھر میرے جسم کا وزن واپس آنا شروع ہو گیا اور میں روہنی کے ساتھ بالکل سیدھ میں اڑنے کی بجائے نیچے آنے لگا۔

میں نے نیچے نظر ڈالی۔ میرے پاؤں کے نیچے مجھے جگہ جگہ سیاہ بادلوں کے پہاڑ سے نظر آ رہے تھے۔ یہ بادل حرکت کرنے کی بجائے اپنی جگہوں پر ساکت تھے۔ مجھے روہنی کی آواز سنائی دی۔ "ہم بدروحوں کی دنیا کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ میں تمہیں غائب کرنے لگی ہوں۔ مگر غائب ہونے کے بعد بھی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہی رہے گا جب تک کہ میں تمہیں لے کر اپنی سہیلی مالینی کے غار میں نہیں پہنچ جاتی۔"

اچانک مجھے ایک بہت خفیف سا جھٹکا لگا اور میرا جسم میری نگاہوں سے غائب ہو گیا۔ مجھے نہ تو اپنے بازو دکھائی دے رہے تھے اور نہ جسم کا کوئی دوسرا حصہ نظر آ رہا

تھا۔ میں غائب ہو چکا تھا لیکن مجھے روہنی کے ہاتھ کی گرفت باقاعدہ محسوس ہو رہی تھی۔ میرا جسم ضرور غائب ہو گیا تھا مگر جسم کا احساس زندہ تھا۔ یہ میرے لئے میری زندگی کا ایک انوکھا اور دہشت ناک تجربہ تھا۔ کیسی عجیب اور ڈرا دینے والی بات لگتی ہے کہ آپ سڑک پر چل رہے ہیں اور آپ کو سب کچھ دکھائی دے رہا ہے مگر اپنا جسم دکھائی نہیں دے رہا۔

جیسے جیسے ہم نیچے آ رہے تھے سیاہ بادلوں کے پہاڑ واضح ہوتے جا رہے تھے۔ یہ بادل نہیں تھے بلکہ کالے سیاہ پہاڑ تھے جن پر کسی جگہ بھی کوئی درخت نہیں تھا۔ ہم ایک پہاڑ کے پاس اتر گئے۔ روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ کہنے لگی۔ "ہم بدروحوں کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ اس ٹیلے میں میری سہیلی مالینی کا غار ہے۔"

روہنی ٹیلے کی ڈھلان کے ساتھ چل رہی تھی۔ اچانک مجھے ایسے لگا جیسے کوئی بہت بڑا پرندہ اپنے پر زور زور سے پھڑپھڑاتا میرے سر کے اوپر سے گزر گیا۔ میں ڈر کر ایک طرف ہو گیا۔

روہنی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے آسمان کی طرف دیکھ کر روہنی نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ یہاں بدروحیں اسی طرح دن رات اضطراب کے عالم میں فضا میں بھٹکتی رہتی ہیں۔ میرے شہزادے کے تابوت کی انگوٹھی کی وجہ سے بدروحوں کو تمہاری موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا اور وہ تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتیں۔ اگر تمہاری انگلی میں میری دی ہوئی تابوت کی انگوٹھی نہ ہوتی تو اب تک بدروحوں نے تمہاری تکا بوٹی کر دی ہوتی۔"

اس وقت میرے دل میں صرف ایک ہی خیال آیا کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں اور انسانوں کی دنیا سے نکل کر کہاں آ گیا ہوں۔ ٹیلے کی ڈھلان میں ساتھ ساتھ غاروں کے دہانے نظر آ رہے تھے۔ ہم ان غاروں کے قریب سے گزرنے لگے تو روہنی نے سرگوشی میں مجھے کہا۔ "کسی غار میں سے کوئی بھی آواز آئے تم ہرگز



ہرگز اس کا جواب مت دینا۔ بالکل خاموش رہنا۔"

میں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "میں نہیں بولوں گا۔"

ہم پہلے غار کے سامنے سے گزرے تو غار کے اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ وہ بین کر رہی تھی اور بڑی دردناک آواز میں کہہ رہی تھی۔ "مجھے آگ لگی ہوئی ہے۔ کوئی میری آگ بجھا دے۔ مجھے آگ لگی ہوئی ہے۔ کوئی میری آگ بجھا دے....."

ہم غار کے آگے سے گزر گئے۔ دوسرے غار کے پاس آئے تو اندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا اور کہے جا رہا تھا۔ "امی جان! یہ لوگ مجھے مار رہے ہیں۔ مجھے ان سے بچالو۔ میرے سر سے خون بہہ رہا ہے۔ امی جان! مجھے ان سے بچالو۔ امی جان! تم کہاں ہو.....؟"

ہم اس غار کے آگے سے بھی گزر گئے۔ تیسرے غار کے سامنے سے گزرے تو اندر سے کسی مرد کی بھیانک چیخ کی آواز آئی۔ یہ چیخ اتنی ڈراؤنی تھی کہ میرا دل لرز اٹھا۔ چیخوں کی مسلسل آوازیں آنے لگیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کوئی کسی کو دہکتے ہوئے انگاروں سے داغ رہا ہے۔ چوتھے غار میں سے صرف رونے کی دردانگیز آواز آ رہی تھی۔ کوئی انسان ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا اور کہے جا رہا تھا۔ "مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔"

پانچویں غار کے قریب پہنچتے ہی روہنی نے مجھے ہاتھ سے ایک طرف کھینچ لیا۔ ہم ٹیلے کے ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں ہو گئے۔ اس غار کے اندر سے کسی خونخوار درندے کی دھاڑ سنائی دی پھر خاموشی چھا گئی۔ اس کے فوراً بعد غار میں سے ایک بڑے ریچھ کے سائز کا ایک عجیب قسم کا ڈراؤنا درندہ باہر نکلا۔ اس کے منہ میں ایک آدمی کا دھڑ تھا جس کو اس نے اپنے نوکیلے دانتوں میں جکڑ رکھا تھا۔ یہ سیاہ رنگ کا خوفناک درندہ بدنصیب انسان کی آدھی خون آلود لاش کو اپنے دانتوں میں دبائے

چھلانگ لگا کر ٹیلے کی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

میری ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں روہنی سے پوچھوں کہ یہ کیا کچھ ہو رہا تھا اور یہ کون لوگ ہیں، کون سی بدروحیں ہیں جن پر خدا کا عذاب نازل ہو رہا ہے۔ روہنی بدروح بھی خاموش تھی۔ جب خوفناک درندہ جھاڑیوں کے عقب میں غائب ہو گیا تو روہنی مجھے لے کر آگے چل پڑی۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ آگے ٹیلے کی سیاہ دیوار آگئی اس کے بعد پھر تاریک غار آگیا۔ اس غار کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اندر ایک نگاہ ڈالی تو میری روح کانپ اٹھی۔ غار کے دہانے کے پاس ہی ایک عورت غار کی چھت کے ساتھ الٹی لٹکی ہوئی تھی اور اس کے جسم کے ساتھ سانپ لپٹے ہوئے تھے۔ روہنی میرا ہاتھ کھینچ کر جلدی سے آگے لے گئی۔

ایک غار میں سے سیاہ کالا دھواں نکل رہا تھا اور اندر سے ایک گھٹی ہوئی آواز آ رہی تھی۔ ”میرا دم گھٹ رہا ہے۔ مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

ہم وہاں سے بھی آگے نکل گئے۔ آگے ایک چھوٹا سا زینہ تھا۔ ہم اس پر سے ہو کر اوپر گئے تو وہاں بھی ایک غار تھا۔ اس غار میں سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ روہنی نے میرے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ”یہ میری سہیلی مالینی کا غار ہے۔ ڈرنا نہیں ہم اندر جا رہے ہیں۔“

غار میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے جیسے ہم غار میں آگے جا رہے تھے اندھیرا اپنے آپ کم ہوتا جا رہا تھا حالانکہ وہاں کوئی موم بتی تک روشن نہیں تھی۔ ہم غار کے وسط میں آگئے جہاں ایک چھوٹا سا دالان تھا۔ دالان میں تین سیاہ پتھر کے ستون تھے۔ ایک ستون کے پاس چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ چبوترے پر اینٹوں کے چار تھڑے تھے جیسے کسی کے بیٹھنے کے لئے بنائے گئے ہوں۔

غار خالی تھا۔ روہنی دھیمی آواز میں کہنے لگی۔ ”مالینی باہر گئی ہوئی ہے۔ ابھی آ



جائے گی۔ اس میں اتنی شکتی ہے کہ وہ تمہیں غیبی حالت میں بھی دیکھ لے گی۔ یاد رکھنا جب تک وہ تم سے کچھ نہ پوچھے تم ہرگز نہیں بولو گے۔“

ابھی ہم دالان میں ایک ستون کے پاس کھڑے ہی تھے کہ کسی پرندے کے پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز سنائی دی۔ روہنی نے کہا۔ ”مالینی! میری سہیلی آگئی ہے۔“

پروں کی پھڑپھڑاہٹ اور بلند ہو گئی۔ اتنے میں ایک بڑے سائز کی چمگادڑ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنے پر پھیلا رکھے تھے اور اس کے حلق سے سیٹی کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ چمگادڑ نے دالان میں ایک چکر لگایا اور پھر روہنی جہاں کھڑی تھی وہاں زمین پر اتر گئی۔ زمین پر اترتے ہی وہ ایک نوجوان عورت کے روپ میں ظاہر ہو گئی۔ روہنی کو سامنے دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوئی اور اسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ کہنے لگی۔ ”روہنی! بڑے دنوں بعد تم سے ملاقات ہوئی ہے۔ میں جانتی ہوں ہماری بدروحوں کی دنیا سے تمہارا زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ہم تو یہاں بدروحیں بن کر اپنے برے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔ لیکن تمہارے کرم دنیا میں اچھے تھے۔ تم اپنے دشمن پجاری رگھو کی وجہ سے ایک اچھی بدروح کی شکل میں بھٹک رہی ہو۔“

پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ میں غائب تھا مگر روہنی کی سہیلی مالینی مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے روہنی سے پوچھا۔ ”یہ انسان کون ہے۔ اسے تم اپنے ساتھ ہماری دنیا میں کیوں لائی ہو؟ یہ تو ابھی زندہ ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”مالینی! میں یہی سب کچھ بتانے کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

مالینی کی بدروح اینٹوں کے تھڑے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے والے تھڑوں پر میں اور روہنی بیٹھ گئے۔ اس کے بعد روہنی نے اپنی سہیلی مالینی کو شروع سے لے کر آخر تک وہ ساری کہانی بیان کر دی جو میں آپ کو بیان کر چکا ہوں۔ بدروح مالینی

بڑے غور سے روہنی کی باتیں سن رہی تھی۔ جب روہنی نے اپنی داستان ختم کی تو مالینی نے کہا۔ ”روہنی! اس انسان نے تمہیں راکھشش پجاری رگھو کی قید سے آزاد کر کے تمہارے ساتھ بھلائی کی ہے۔ ہم اسے کوئی نقصان نہیں پہنچنے دیں گی۔ میں ہر طرح سے تمہاری اور اس نیک دل انسان کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن تم بھی جانتی ہو کہ یہ کام بڑا خطرناک بھی ہے۔ پجاری رگھو کی بدروح اپنے بدروحوں کے قبیلے کی سردار ہے اور ہمارے قبیلے کی سردار کالی بدروح سے رگھو کے بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ان دونوں میں کسی کو بھی اگر یہ معلوم ہو گیا کہ تم لوگ انسانوں کی دنیا سے پجاری رگھو کو ہمیشہ کے لئے بھسم کرنے کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہو اور تمہیں اس کے طلسم کے توڑ کی تلاش ہے تو اس انسان کی جان خطرے میں ہو گی۔ ہم دونوں بدروحیں ہیں۔ ہم پہلے ہی سے مر چکی ہیں لیکن بدروحوں کی بھی موت ہوتی ہے اور یہ بڑی اذیت کی موت ہوتی ہے۔ انسان تو مر کر جسمانی تکلیف سے نجات پا جاتا ہے لیکن بدروحوں کی موت کے بعد ان کا ایسا اذیت ناک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا.....“

روہنی نے کہا۔ ”مالینی! مجھے ان ساری باتوں کا احساس ہے۔ میں بڑی احتیاط سے کام لے رہی ہوں اور ایک ایسے راستے سے اڑ کر آئی ہوں جہاں سوائے خلا کے اور کچھ نہیں تھا صرف اس لئے کہ کہیں پجاری رگھو یا تمہاری خونخوار سردارنی کالی کو ہمارے یہاں آنے کا پتہ نہ چل جائے۔“

بدروح مالینی کہنے لگی۔ ”قبیلے کی سردارنی کالی بدروح کی طاقت کا تمہیں علم نہیں ہے۔ دوسری دنیا اور خاص طور پر انسانوں کی دنیا کا ایک ذرہ بھی اڑ کر یہاں آ جائے تو اسے خبر ہو جاتی ہے۔ یہ تمہاری عقل مندی ہے کہ تم اپنے ساتھی کو جو تمہارے مرے ہوئے محبوب کا ہم شکل ہے آسمان کے ایسے راستوں سے لے کر آئی ہو کہ کالی بدروح کو ابھی تک تمہارے اور تمہارے ساتھی کے بدروحوں کی دنیا میں داخل



ہونے کی خبر نہیں ہوئی۔“

روہنی نے کہا۔ ”مالینی! تم میری سب سے پیاری بلکہ زندگی میں اور مرنے کے بعد بھی ایک ہی سہیلی ہو اور میری ہم راز ہو۔ میں نے یہ راز تمہیں کھول کر بتا دیا ہے کہ میری نجات اور میرے مردہ محبوب کی روح کی تسکین صرف اسی ایک بات میں ہے کہ کسی طرح میں اپنے دشمن پجاری رگھو سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لوں۔ وہ میری تلاش میں ہے اور مجھے ہر قیمت پر ایک بار پھر اپنے قبضے میں کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی مکتی اور اس کی نجات بھی اسی میں ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے اس کے قبضے میں چلی جاؤں تا کہ وہ مجھے ایک سو برس تک کسی مرتبان میں دفن رکھنے کے بعد میری آتما کو اپنے میں جذب کر کے پھر سے اس دنیا میں زندہ انسان کا جنم لے کر ظاہر ہو جائے۔ میری آتما کو اپنے اندر جذب کر لینے کے بعد اس میں اتنی شکتی، اتنی طاقت آ جائے گی کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طلسمی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ وہ جسے چاہے گا اپنی مرضی سے یا قتل کر سکے گا اور یا اسے اپنا غلام بنا سکے گا۔“

بدروح مالینی نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ انسانوں کی دنیا امن و راحت اور محبت و پیار کی دنیا ہے۔ یہ راکھشش پجاری رگھو اگر تمہاری آتما کو اپنے اندر جذب کر کے دوبارہ دنیا میں واپس آ گیا تو دنیا کے امن پسند بے گناہ لوگوں کی زندگیاں تباہ و برباد ہو جائیں گی۔“

روہنی نے کہا۔ ”اس لئے میں تمہاری مدد لینے تمہارے پاس آئی ہوں۔“

مالینی نے کہا۔ ”مجھے بتاؤ میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ میں تمہاری نجات اور انسانوں کی دنیا کی شانتی اور امن کے لئے سب کچھ کر سکتی ہوں۔“

تب روہنی نے مالینی سے کہا۔ ”اس کے لئے مجھے ایک ایسی شے کی ضرورت ہے جو مجھے صرف تمہاری بدروحوں کی دنیا اور خاص طور پر تمہارے قبیلے میں سے ہی مل سکتی ہے۔“

"مجھے بتاؤ وہ کون سی شے ہے؟" مالینی نے پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ "تمہیں معلوم ہی ہے کہ تمہارے قبیلے کی سردارنی بدروح کالی کے گلے میں انسانی ہڈیوں کے مہروں کی مالائیں ہوتی ہیں اور تم یہ بھی اچھی طرح سے جانتی ہو کہ اس مالا کی ہڈیوں کے مہروں میں کتنی طاقت چھپی ہوئی ہے۔ مالینی! اگر مجھے سردارنی کالی بدروح کی اس مالا میں سے کسی بھی انسانی ہڈی کا ایک مہرہ مل جائے تو میرے پاس اتنی طاقت آ جائے گی کہ میں نہ صرف یہ کہ انسانوں کا اور اپنے دشمن پجاری رگھو کا مقابلہ کر سکوں گی بلکہ اسے اگنی دیوی کی چتا کی آگ میں جلا کر ہمیشہ کے لئے بھسم کر سکوں گی۔"

مالینی یہ سن کر جیسے ایک بار سہم سی گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر پریشانی کے اثرات ظاہر ہو رہے تھے۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسے خاموش دیکھ کر روہنی نے کہا۔ "مجھے احساس ہے کہ میں تمہیں ایک ایسے کام کے لئے کہہ رہی ہوں جس میں تمہاری جان کو بھی خطرہ ہے اور یہ مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ مگر مالینی یہ انسانیت کی بھلائی کا کام بھی ہے۔ ہو سکتا ہے نیکی کے اس کام کے بدلے تمہارے برے کرموں کی سزا بھی بھگوان معاف کر دے اور تمہاری روح کو بھی نجات مل جائے اور تم بدروحوں کی دنیا سے نکل کر آکاش کی بلندیوں میں دیوتاؤں کی دنیا میں پہنچ جاؤ۔ کیونکہ جب تک میرے اندر پجاری رگھو جتنی یا اس سے بڑھ کر شکتی نہیں پیدا ہوتی تب تک میری روح جس کو آکاش کی بلندیوں پر جانا تھا آسمانوں اور زمین کے درمیان ہمیشہ بھٹکتی پھرتی رہے گی اور میرے محبوب شہزادے کی روح بھی سورگ میں بے چین رہے گی۔"

مالینی بدروح نے آخر اپنی زبان کھولی اور کہنے لگی۔ "روہنی! یہ کام کتنا مشکل بلکہ ایک طرح سے ناممکن ہے۔ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ کالی بدروح کے گلے کی مالا میں سے انسانی ہڈی کا مہرہ اتارنا تو بعد کی بات ہے اس کی مالا کو کوئی ہاتھ بھی



نہیں لگا سکتا۔ کالی بدروح سو بھی رہی ہوتی ہے تو چار خونخوار بدروحیں ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے اس کے ارد گرد پہرہ دے رہی ہوتی ہیں اور جہاں وہ سو رہی ہوتی ہے وہاں کوئی مکھی بھی داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتی۔"

روہنی نے کہا۔ "لیکن مالینی! ہمیں یہ کام ہر حالت میں کرنا ہے۔ اگر کالی بدروح کا مہرہ مجھے مل گیا تو سمجھ لو کہ میری تو نجات ہو گی ہی لیکن اس کے ساتھ ہی انسانوں کی دنیا کے کروڑوں بے گناہ انسان پجاری رگھو کی لائی ہوئی تباہی سے محفوظ ہو جائیں گے۔"

بدروح مالینی مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔ وہ روہنی کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ وہ انسانوں کی دنیا کو تباہی سے بچانا چاہتی تھی مگر اسے کوئی ترکیب سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جس پر چل کر وہ اپنے قبیلے کی خونخوار سردارنی کالی بدروح کی مالا کا مہرہ حاصل کر سکے۔

اچانک بدروح مالینی نے میری طرف دیکھا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں مجھے بڑی خوفناک سی چمک دکھائی دی تھی۔ پھر اس نے روہنی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "روہنی! ایک طریقہ ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" روہنی نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

بدروح مالینی نے کہا۔ "تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ ایک مرے ہوئے آدمی کے مقابلے میں ایک زندہ انسان زیادہ طاقت اور قابلیت رکھتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس زندہ انسان کو اپنی چھپی ہوئی طاقت کا احساس نہ ہو۔"

روہنی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ مگر وہ طریقہ کون سا ہے جس پر عمل کر کے میں کالی بدروح کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہوں۔"

بدروح مالینی کہنے لگی۔ "تمہارا ساتھی انسان..... اور تمہارے محبوب اور سورگباش شہزادے شیروان کے ہم شکل سے یہ کام لیا جا سکتا ہے۔"

یہ سنتے ہی میرے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مجھے روہنی نے بلائے بغیر کچھ بولنے سے منع کیا ہوا تھا۔ لیکن میں نے گھبرا کر کہہ دیا۔ ’’نہیں نہیں! میں یہ کام کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ میں آپ لوگوں کے لئے اپنی جان کی بازی نہیں لگا سکتا۔ میری زندگی پہلے ہی ہر وقت خطرے میں رہتی ہے۔ ذلیل پجاری رگھو مجھ پر کئی بار قاتلانہ حملے کر چکا ہے۔‘‘

بدروح مالینی نے کہا۔ ’’کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہاری جان کو جو ہر وقت موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے وہ ختم ہو جائے؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ تمہارا وہ دشمن جو ہر وقت تمہیں جان سے مار ڈالنے کے منصوبے بناتا رہتا ہے ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائے؟‘‘

میری زبان سے اپنے آپ نکل گیا۔ ’’میں یہی چاہتا ہوں کیونکہ اپنی حماقت کی وجہ سے میں جس عذاب میں مبتلا ہو چکا ہوں اس سے چھٹکارا پانے کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ میرا دشمن پجاری رگھو ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔‘‘

بدروح مالینی نے کہا۔ ’’تو پھر اس کی ایک ہی صورت ہے کہ جو میں تمہیں کہوں اس پر عمل کرو۔ اگر تم نے میری ہدایت کے مطابق سب کچھ کیا تو تمہیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچے گا اور تم کالی بدروح کا مہرہ بھی لانے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔‘‘

میری ساتھی روہنی نے بھی مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ’’شیروان! میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم میرے محبوب بھی ہو اور میرے شوہر بھی رہ چکے ہو۔ میں یہ کیسے گوارا کر سکتی ہوں کہ تمہیں کوئی گزند پہنچے۔ مجھے یقین ہے اور تم بھی میری سہیلی مالینی کی بات کا یقین کرو۔ وہ تمہیں جیسے کہے ویسے ہی کرو۔ اللہ کے فضل سے تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ اور پھر ذرا سوچو تمہارے اس عمل سے نہ صرف یہ کہ مجھے نجات مل جائے گی اور تمہاری جان کو جو خطرہ لگا ہوا ہے وہ دور ہو جائے گا بلکہ دنیا میں رہنے والے انسانوں کا کس قدر بھلا ہو گا کہ وہ ایک شیطان کے ظالمانہ ہتھکنڈوں سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائیں گے۔‘‘



میں پہلے ہی اس دلدل میں کمر تک دھنس چکا تھا۔ جب یہ صورت حال سامنے آئی تو میں نے سوچا کہ اگر میری نجات خدا نے ایسے ہی لکھی ہے تو چلو اس دلدل میں تھوڑا اور نیچے اتر جاتا ہوں۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں یونہی اپنی جان کی بازی لگانے کو تیار نہیں تھا۔ میں روہنی اور مالینی کی زبانی سن چکا تھا کہ بدروحوں کے قبیلے کی سردار کالی بدروح کس قدر خونخوار بدروح ہے۔ میں اس کام کے لئے حامی بھرنے سے پہلے ہر قسم کی تسلی کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے براہ راست روہنی کی بدروح سہیلی مالینی سے پوچھا۔ ’’تم مجھے پوری تفصیل کے ساتھ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہو گا؟‘‘

مالینی کہنے لگی۔ ’’سب سے پہلے میں تمہاری تسلی کرنا چاہتی ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم غیبی حالت میں ہو اور زندہ انسان ہو مرے ہوئے نہیں ہو۔ یعنی تم اپنی روح یا بدروح نہیں ہو۔ اور کالی بدروح پر تمہیں یہی سب سے بڑی فوقیت حاصل ہے کہ تم زندہ انسان ہو اور غیبی حالت میں ہو۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمہارے پاس میری سہیلی روہنی کی دی ہوئی طلسمی انگوٹھی بھی ہے جو تمہیں بدروحوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کی طاقت رکھتی ہے۔ اب میں تمہیں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا..... یہاں ہمارے بدروحوں کے قبیلے میں ایک رسم چلی آ رہی ہے کہ سیاہ چاند کی رات میں ایک زبردست جشن ہوتا ہے۔ یہ رات ہر چھ ماہ کے بعد آتی ہے۔ اس رات آدھی رات کے بعد آسمان پر سیاہ چاند طلوع ہوتا ہے۔ یہ چاند کالا سیاہ ہوتا ہے لیکن اس کے گول کنارے روشن ہوتے ہیں جس کی وجہ سے چاند سیاہ آسمان پر نظر آتا ہے۔ اس جشن میں کالی بدروح بھی شامل ہوتی ہے۔ اسے ایک تخت پر بیٹھا دیا جاتا ہے۔ قبیلے کی تمام بدروحیں کالی بدروح کے سامنے رقص کرتی ہیں اور اس کی تعریف کے گیت گاتی ہیں۔ اس رات کالی بدروح سوم رس بھی پیتی ہے۔ سوم رس تم جانتے ہی ہو گے انسانوں کی دنیا میں اسے شراب کہتے ہیں..... کالی بدروح کافی سوم رس پی

جاتی ہے کیونکہ اس کے بعد چھ ماہ تک اسے سوم رس کو ہاتھ بھی نہیں لگانا ہوتا۔ یہ جشن سیاہ چاندرات بھر جاری رہتا ہے۔ جب جشن ختم ہوتا ہے تو میں نے دیکھا ہے کہ کالی بدروح نشے میں مدہوش ہوتی ہے اور اسے اس کی چار باڈی گارڈ بدروحیں پالکی میں ڈال کر اس کے غار میں لے جاتی ہیں۔ اس کے بعد کالی بدروح اگلے روز سارا دن غار میں مدہوش پڑی رہتی ہے۔ بس یہی وہ رات ہے جب تم ہمت کر کے اس کی مالا میں سے ہڈیوں کا ایک مہرہ لا سکتے ہو۔ یہی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی تھی اور اس کے علاوہ اور کوئی ایسی ترکیب نہیں ہے جس کی مدد سے تم کالی بدروح کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو۔"

میں نے کہا۔ "کالی بدروح تو ضرور نشے میں مدہوش ہو گی لیکن جو چار بدروحیں تلواریں اٹھائے غار کے باہر پہرہ دے رہی ہوں گی تو وہ پوری طرح سے چوکس ہوں گی وہ مجھے کیسے غار میں داخل ہونے دیں گی۔ وہ تو وہیں میرا کام تمام کر دیں گی۔"

میرا یہ اعتراض سن کر میری ساتھی روہنی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ مالینی بدروح بڑے پرسکون انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔

O



میری ساتھی اور دوست روہنی نے مالینی سے کہا۔ "شیروان ٹھیک کہتا ہے مالینی... شیروان غیبی حالت میں بھی ان کے قریب سے جب گزرے گا تو میرا خیال ہے کہ انہیں اپنے کالے جادو کی طاقت سے اتنا ضرور محسوس ہو جائے گا کہ کوئی چیز غار میں داخل ہوئی ہے۔"

بدروح مالینی بڑے اطمینان سے روہنی کو سنتی رہی۔ جب اس نے اپنی بات ختم کی تو وہ کہنے لگی۔ "تم کیا سمجھتی ہو کہ میں ان پہرے دار بدروحوں کی جادوئی طاقت سے بے خبر ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ جب شیروان غیبی حالت میں بھی ان کے قریب سے ہو کر غار میں داخل ہو گا تو انہیں یہ احساس ضرور ہو جائے گا کہ کوئی نظر نہ آنے والی شے غار میں گئی ہے۔"

"تو پھر تمہارے پاس اس کا کیا توڑ ہے؟" روہنی نے پوچھا۔

مالینی نے کہا۔ "اس کا توڑ میرے پاس ہے۔"

"وہ کیا ہے؟" روہنی نے پوچھا۔

مالینی نے کہا۔ "میں شیروان کو ایسا چمگادڑ بنا کر غار میں بھیجوں گی جو نظر نہیں آئے گا۔ جب شیروان چمگادڑ کے روپ میں غار میں داخل ہو گا تو بدروحوں کو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ کوئی چمگادڑ غار میں گیا ہے۔ کالی بدروح کے غار میں دس بارہ چمگادڑ بھی رہتے ہیں جو سارا دن کالی بدروح کے تخت کے اوپر چھت کے ساتھ الٹے لٹکے رہتے ہیں اور رات کو باہر نکل کر سزا یافتہ بدروحوں کے غاروں میں جا کر اُن کا

خون چوستے ہیں۔ ان میں سے وہ چمگادڑ جس کا پیٹ بھر جاتا ہے کالی بدروح کے غار میں واپس آ جاتا ہے۔ چمگادڑ عام طور پر رات کی تاریکی میں نظر نہیں آتے۔ جب شیر وان چمگادڑ کے روپ میں غار میں داخل ہوگا تو پہرے دار بدروحیں یہی سمجھیں گی کہ یہ کالی بدروح کے غار کا چمگادڑ ہے جو کسی بدروح کے خون سے اپنا پیٹ بھر کر واپس آگیا ہے۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا میں چمگادڑ سے اپنے انسانی روپ میں واپس آ جاؤں گا؟"

"کیوں نہیں؟" مالینی نے کہا۔ "اگر میں تمہیں جادو کے زور سے چمگادڑ بنا سکتی ہوں تو تمہیں اسی جادو کے زور سے انسانی شکل میں واپس بھی لا سکتی ہوں۔"

میں چپ ہو گیا۔ میرے سر پر جو ایک نادانی کی وجہ سے ایک ناگہانی مصیبت آن پڑی تھی اسے کسی نہ کسی صورت مجھے کاٹنا ہی تھا۔

روہنی نے کہا۔ "لیکن شیر وان چمگادڑ کے روپ میں کالی بدروح کی مالا سے ہڈی کا مہرہ کیسے الگ کر سکے گا؟"

مالینی کہنے لگی۔ "چمگادڑ کے روپ میں بھی شیر وان کا دماغ ایک انسان کا دماغ ہو گا اور وہ اسی طرح کام کر رہا ہوگا جس طرح دوسرے انسانوں کا دماغ کام کرتا ہے۔ میں شیر وان کو ایک چھوٹا سا منتر بتا دوں گی۔ غار میں داخل ہونے کے بعد وہ کالی بدروح کے تخت کے ایک طرف بیٹھ جائے گا اور یہ دیکھے گا کہ کالی بدروح کہیں ہوش میں تو نہیں ہے۔ اگر وہ سوم رس کے نشے میں مدہوش ہوگی جس کا مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور ہوگی تو شیر وان میرا بتایا ہوا منتر دل میں دہرائے گا اس کے ساتھ ہی وہ اپنی انسانی شکل میں واپس آ جائے گا مگر وہ غیبی حالت میں ہی ہوگا۔ اس کے بعد شیر وان کو اپنی عقل اور بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہوگا اور بڑی احتیاط کے ساتھ کالی بدروح کی مالا میں سے ہڈی کا ایک مہرہ الگ کر کے اپنے قبضے میں کرنا ہوگا۔ مہرہ جب شیر وان



کے قبضے میں آ جائے گا تو وہ پھر میرا بتایا ہوا منتر دل میں ایک بار پڑھے گا اور اس کے فوراً بعد وہ ایک بار پھر چمگادڑ کا روپ اختیار کر لے گا اور اڑتا ہوا ہمارے غار میں واپس آ جائے گا۔ یہ ہے وہ طریقہ جس پر عمل کرنے سے تم کالی بدروح کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتی ہو۔ اس کے علاوہ کوئی ترکیب نہیں ہے۔"

میں نے سہمی ہوئی آواز میں مالینی سے پوچھا۔ "اور اگر کالی بدروح کو اچانک ہوش آ گیا تو پھر کیا ہوگا؟"

مالینی نے کہا۔ "پھر یہ ہوگا کہ کالی بدروح تمہیں پکڑ لے گی۔ سب سے پہلے وہ تمہاری گردن مروڑ کر تمہارا سر تمہارے دھڑ سے الگ کر دے گی۔ اس کے بعد تمہاری کٹی ہوئی گردن پر منہ رکھ کر تمہارا سارا خون پی جائے گی۔ پھر وہ تمہارے جسم کا سارا گوشت کھا جائے گی اور تمہاری ہڈیوں کو توڑ توڑ کر ان کے مہرے اور چھلے بنا کر ان کی مالا اپنے گلے میں ڈال لے گی۔"

میں سن رہا تھا اور میری روح فنا ہوئی جا رہی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میرے ساتھ ایسا ہی ہوگا۔ کالی بدروح کی مالا کو جیسے ہی میں ہاتھ لگاؤں گا اسے ہوش آ جائے گا اور میرا وہی ہولناک انجام ہوگا جس کی تفصیل بدروح مالینی نے بیان کی تھی۔ میں مالینی سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر دہشت کے مارے میرا گلا خشک ہو گیا تھا اور کوشش کے باوجود میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی تھی۔ میری ساتھی روہنی نے میرے جذبات کو بھانپ لیا تھا۔ اس نے میرے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مالینی سے پوچھا۔ "مالینی! کیا اس بات کا امکان ہے کہ شیر وان کے قریب جانے یا کالی بدروح کی مالا کو ہاتھ لگانے سے اسے ہوش آ جائے؟"

مالینی کہنے لگی۔ "ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ کیونکہ جشن کی رات کالی بدروح سوم رس کے نشے میں ساری رات بے سدھ پڑی رہتی ہے لیکن اگر اسے ہوش آ بھی گیا تو شیر وان کو چاہئے کہ فوراً میرا منتر پڑھ لے وہ اسی لمحے چمگادڑ کا روپ اختیار کر لے گا

اور اڑ جائے گا۔"

بدروح مالینی نے مجھے بھی تسلی دی اور کہا کہ مجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کالی بدروح سوم رس اتنا پی چکی ہوتی ہے کہ دوسرے دن سے پہلے اس کے ہوش میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آخر یہی فیصلہ ہوا کہ کالی بدروح کا مہرہ لینے کے لئے مجھے ہی چمگادڑ کے روپ میں اس کے غار میں جانا ہوگا۔ یہ موت کے منہ میں جانے والی بات تھی لیکن پجاری رگھو کی ہلاکت آمیز دشمنی کے خوف سے روز روز مرنے کی بجائے بہتر تھا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے یہ کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔

ہو سکتا ہے ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔

سیاہ چاند کے جشن کی رات کو ابھی سات دن باقی تھے۔ مالینی نے کہا۔ "اتنے دن تم دونوں میرے غار میں ہی رہو گے۔ تمہارا غار سے باہر نکلنا ہم سب کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔"

روہنی نے کہا۔ "ہم تمہاری ہدایت پر عمل کریں گے اور تمہارے غار سے باہر قدم نہیں رکھیں گے۔"

میں بیان نہیں کر سکتا کہ یہ سات دن میں نے مالینی بدروح کے غار میں کس ذہنی اذیت کے ساتھ گزارے۔ کہاں مجھے لاہور، کراچی کی کشادہ سڑکوں اور جنگلوں میں پھر کر شکار کھیلنے کی عادت تھی اور کہاں میں بدروحوں کی دنیا کے ایک تاریک غار میں بند ہو کر رہ گیا تھا۔ لیکن یہ اذیت مجھے ہر حال میں برداشت کرنی ہی تھی۔ آخر جشن کی رات آ گئی۔

شام ہوئی تو بدروح مالینی نے مجھے اپنے سامنے بٹھا کر وہ خفیہ جادوئی منتر بتایا جس کو پڑھ کر مجھے چمگادڑ سے انسان کا روپ اختیار کرنا تھا اور دوسری بار پڑھ کر انسان سے واپس چمگادڑ کی شکل اختیار کر کے کالی بدروح کے غار سے باہر نکلنا تھا۔ یہ چار لفظوں



کا منتر تھا جو آج بھی مجھے یاد ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں گا نہیں کیونکہ یہ سب کفر ہے اور کافروں کی خرافات ہے۔

مالینی نے مجھے کہا تھا کہ شیروان! میں نے تمہیں بڑا قیمتی منتر بتا دیا ہے۔ ہمیں اس کی اجازت نہیں ہوتی کہ ہم یہ منتر کسی انسان کو بتائیں۔ لیکن جب کسی کی جان کو خطرہ ہو تو اس منتر سے کام لیا جا سکتا ہے۔ مالینی نے مجھے ہدایت کی تھی اور کہا تھا۔

"شیروان! میں نے جو خفیہ منتر تمہارے دماغ میں ڈال دیا ہے اب میں اسے تمہارے دماغ سے نکال نہیں سکتی۔ میں جانتی ہوں یہ منتر تمہیں اس وقت بھی یاد رہے گا جب تم میری سہیلی روہنی کے ساتھ انسانوں کی دنیا میں واپس جاؤ گے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا اس منتر کو صرف اپنی جان بچانے اور کسی بے گناہ کی جان بچانے اور کسی بڑے مشکل وقت میں استعمال کرنا۔۔۔۔۔"

یہ منتر مجھے آج بھی یاد ہے۔ اور میں اس وقت بھی اگر چاہوں تو وہ خفیہ منتر پڑھ کر انسان سے کوئی دوسرا روپ اختیار کر سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ مالینی بدروح نے مجھے بلا ضرورت یہ منتر پڑھنے سے سختی سے منع کیا ہوا ہے۔

بہر حال میں اپنی داستان آگے شروع کرتا ہوں۔

بدروحوں کی دنیا میں وہ سیاہ چاند کے جشن کی رات تھی۔ اس رات مجھے چمگادڑ کے روپ میں خونخوار کالی بدروح کے غار میں داخل ہو کر اس کی مالا میں سے ہڈی کا ایک مہرہ نکال کر لانا تھا۔ یہ موت کا کھیل تھا۔ اس میں میری جان بھی جا سکتی تھی۔ اگرچہ بقول مالینی کے میں ہنگامی حالت میں منتر پڑھ کر انسان سے چمگادڑ بن کر وہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن کوئی پتہ نہیں تھا کہ اس دوران خونخوار کالی بدروح مجھ پر وار کر دے۔ آخر وہ ان سب بدروحوں کی سردارنی تھی اور بڑی زبردست آسیبی طاقت تھی۔ ہم نے کالی بدروح کا غار دیکھا ہوا تھا۔ مالینی نے بھی مجھے اچھی طرح سے سمجھا دیا تھا کہ اس کا غار کس جگہ پر ہے۔

رات ذرا گہری ہوئی تو مالینی نے اپنی سہیلی روہنی سے کہا۔ ''میں سیاہ چاند کے جشن میں شریک ہونے جا رہی ہوں۔ آدھی رات کو جب سیاہ چاند نکلے گا اور جشن کا ہنگامہ گرم ہو جائے گا تو میں تھوڑی دیر کے لئے تمہارے پاس غار میں واپس آ جاؤں گی تا کہ اپنے سامنے شیروان کو کالی کے غار کی طرف بھیج سکوں۔ تم دونوں اس دوران غار میں ہی رہنا، غار سے باہر ہرگز قدم نہ رکھنا۔''

یہ کہہ کر مالینی چلی گئی۔

میں اور روہنی غار میں اکیلے رہ گئے۔ روہنی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بڑے پیار اور کسی قدر تشویش کے لہجے میں کہا۔ ''میرے شہزادے شیروان! میں جانتی ہوں تم ایک بڑی ہی خطرناک مہم پر جا رہے ہو اور یہ خطرہ تم اپنے لئے ہی نہیں میرے لئے بھی مول رہے ہو۔ لیکن میرے شہزادے تم بھی جانتے ہو کہ ہمیں کالی بدروح کے مہرے کی کس قدر شدید ضرورت ہے اس کے بغیر ہم انسانوں کی دنیا میں واپس جا کر اپنے جانی دشمن پجاری رگھو کی خون خوار دشمنی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''تم میری فکر نہ کرو۔ میرا خدا میری حفاظت کرے گا۔ میں جس ہلاکت خیز دلدل میں پھنس چکا ہوں اب اس میں سے میرا خدا ہی مجھے باہر نکالے گا۔ تم مسلمان ہو چکی ہو۔ بس میرے لئے دعا کرنا۔''

روہنی یعنی سلطانہ کہنے لگی۔ ''میں تو تمہارے جانے کے فوراً بعد خدا کے حضور سجدے میں گر کر اس سے تمہاری حفاظت کی بھیک مانگوں گی۔ خدا میرے گناہ بھی بخش دے۔ شہزادے شیروان سے شادی کرنے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے میں بتوں کو خدا سمجھ کر ان کی پوجا کرتی رہی ہوں جو بہت بڑا گناہ تھا۔ شاید مجھے میرے اسی گناہ کی سزا مل رہی ہے۔''

روہنی کی آواز میں رقت پیدا ہو گئی۔ میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اتنی دیر سے ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے مجھے بھی اس سے ایک قسم کا تعلق



خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور کہا۔ ''سلطانہ! اگر انسان سچے دل سے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے معاف فرما دیتا ہے۔ مجھ سے اور تم سے نادانی اور ناسمجھی میں جو برے عمل ہوئے ہیں ہم نے ان سے توبہ کر لی ہے اور آئندہ سے ایسے برے عمل نہ کونے کا دل سے فیصلہ کر لیا ہے اس لئے سمجھ لو کہ خدا نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔ باقی ہمارے برے عمل کی وجہ سے جو نتیجہ ہمارے سامنے آ گیا ہے اسے تو ہمیں بھگتنا ہی ہو گا۔ مگر یقین کرو اللہ میاں اس آزمائش سے بھی ہمیں خیریت سے نکال دے گا۔''

میری باتوں سے روہنی یعنی سلطانہ کو بڑا حوصلہ ہوا۔ کہنے لگی۔ ''شیروان! پہلے کبھی تم نے مجھ سے اتنی اچھی باتیں نہیں کی تھیں۔ تمہاری باتوں نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے۔''

ہم غار میں ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔ اتنے میں دور سے بدروحوں کے شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ روہنی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے سیاہ چاند نکل آیا ہے اور بدروحوں کا جشن شروع ہو گیا ہے۔''

میرا دل چاہتا تھا کہ میں غار سے نکل کر آسمان پر دیکھوں کہ سیاہ چاند کیسا ہوتا ہے مگر مالینی نے ہمیں غار سے باہر قدم رکھنے کو سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ بدروحوں کے شور و غل کی آوازیں دور سے آ رہی تھیں۔ ان کی آوازیں چیخ و پکار کی بھیانک آوازیں تھیں۔ بدروحوں کے تو قہقہے بھی بھیانک ہوتے ہیں۔

آدھی رات کے بعد بدروح مالینی غار میں آ گئی۔ آتے ہی مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ ''میرا خیال تھا کہ کالی سردارنی سوم رس میں مدہوش ہو کر اپنے غار میں چلی جائے گی مگر آدھی رات گزرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک جشن میں دوسری بدروحوں کے ساتھ سوم رس پی رہی ہے۔ میں تمہیں صرف یہی بتانے کے لئے آئی تھی۔''

پھر اس نے روہنی سے کہا۔ ”روہنی! تم اپنے شہزادے کی فکر نہ کرنا۔ آج کالی سردارنی بہت سوم رس پی رہی ہے۔ جب وہ غار میں جائے گی تو اسے کوئی ہوش نہیں ہوگا اور شیروان کا کام آسان ہو جائے گا۔ میں جاتی ہوں اور جس وقت کالی سردارنی اپنے غار میں چلی گئی تو اس وقت آؤں گی۔“

مالینی چلی گئی۔

میں اور روہنی سلطانہ بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میری نیند بالکل اڑ چکی تھی۔ ان حالات میں نیند کیسے آسکتی تھی۔ رات گزرتی جارہی تھی۔ بدروحوں کے شوروغل کی آوازیں آہستہ آہستہ مدھم پڑنے لگی تھیں۔ پھر بالکل خاموشی چھا گئی۔ اب ہمیں مالینی کا انتظار تھا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ مالینی آگئی۔

کہنے لگی۔ ”خونخوار کالی نے آج بہت پی ہے۔ شیروان! تمہارا کام آسان ہو گیا ہے۔“

روہنی سلطانہ نے پوچھا۔ ”کیا وہ اپنے غار میں چلی گئی ہے؟“

مالینی نے کہا۔ ”اسے گئے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ لیکن میں چاہتی ہوں کہ ذرا اور انتظار کر لیا جائے تاکہ کالی بدروح نشے میں پوری طرح بے سدھ ہو جائے۔“

جب غار میں بیٹھے بیٹھے مزید ایک گھنٹہ گزر گیا تو مالینی نے مجھے کہا۔ ”شیروان! تیار ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”میں تیار ہی ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ چمگادڑ کی شکل اختیار کرنے کے بعد میں انسانوں کی طرح سوچوں گا یا میری سوچ بھی چمگادڑ کی طرح ہو جائے گی؟“

مالینی کہنے لگی۔ ”میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ چمگادڑ بننے کے بعد بھی تمہارا انسانی دماغ اسی طرح کام کرتا رہے گا۔ چمگادڑ کے روپ کا تمہارے دماغ اور دل پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ تم اسی طرح سوچو گے جس طرح اب سوچ رہے ہو۔ اس طرح محسوس کرو گے جس طرح اب محسوس کر رہے ہو۔ صرف اتنا فرق پڑے گا کہ



تمہارے جسم کا وزن بہت ہلکا ہو جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”میرے جسم کا وزن اس وقت بھی جبکہ میں غائب ہوں بہت ہلکا ہے۔“

مالینی بولی۔ ”بس چمگادڑ کے روپ بدلنے کے بعد تم بالکل ایسے ہی محسوس کرو گے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میرے سامنے چبوترے پر آکر بیٹھ جاؤ۔“

میں نے روہنی سلطانہ کی طرف دیکھا۔ روہنی سلطانہ کی آنکھوں میں اس وقت محبت کے جذبات جھلک رہے تھے۔ اس نے میرا غیبی ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا کیونکہ روہنی اور مالینی مجھے غیبی حالت میں بھی دیکھ رہی تھیں۔ مالینی نے مجھے ایک بار پھر کہا۔ ”تمہیں کالی بدروح کا غار یاد ہے نا؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے روہنی نے یہاں آتے وقت دور سے دکھایا تھا۔“

پھر میں نے مالینی کو کالی بدروح کے غار کا نقشہ بتایا تو مالینی نے کہا۔ ”تم نے بالکل صحیح نقشہ بتایا ہے۔ بس وہی خونخوار کالی کا غار ہے۔ ویسے بھی جب تم چمگادڑ بن کر جاؤ گے تو تمہیں ایک غار میں سے دوسرے چمگادڑوں کی بو آئے گی۔ جس غار میں سے چمگادڑوں کی بو آئے سمجھ لینا کہ وہی خونخوار کالی کا غار ہے کیونکہ صرف کالی کے غار میں چمگادڑوں کا بسیرا ہے اور وہ کسی غار میں نہیں جاتے۔ اب اپنی آنکھیں بند کر لو۔“

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مالینی نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ خدا جانے وہ دل میں کیا پڑھ رہی تھی۔ میری آنکھیں اگرچہ بند تھیں مگر مجھے اس کی دھیمی دھیمی بڑبڑانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد مالینی نے اونچی آواز میں وہ منتر پڑھا جو اس نے مجھے پہلے ہی یاد کرایا تھا۔ یہ چار لفظوں کا منتر تھا۔ لمبے لمبے چار لفظ تھے جو چڑیلوں کی زبان کے الفاظ لگتے تھے۔ جیسے ہی اس نے منتر ختم کیا اور میرا ہاتھ چھوڑ دیا مجھے ایک خفیف سا جھٹکا لگا اور میں چبوترے سے فضا میں بلند ہو گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ میں انسان سے چمگادڑ بن چکا ہوں۔ میرے چھتریوں ایسے

چھوٹے چھوٹے پر تھے اور میں غار کے اندر چکر لگا رہا تھا۔

روہنی حیرت زدہ سی ہو کر مجھے غار میں ادھر اُدھر اڑتے دیکھ رہی تھی۔ مالینی نے بلند آواز میں کہا۔ ”شیر وان! اس وقت تمہاری انگلی میں روہنی کی دی ہوئی انگوٹھی نہیں ہے لیکن یاد رکھو اس کا سارا اثر اور اس کی ساری طاقت تمہارے جسم میں موجود ہے جو تمہیں خونخوار کالی کے آسیب سے محفوظ رکھے گی۔ اب جاؤ۔ تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔“

روہی سلطانہ نے ہاتھ ہلا کر مجھے الوداع کیا۔ میں چمگادڑ کے روپ میں غوطہ لگا کر غار سے باہر آگیا۔

O



رات تاریک تھی۔ ہر طرف آسیبی سناٹا چھایا ہوا تھا۔ غار سے باہر آتے ہی میں اڑان بھر کر اوپر کو اٹھ گیا۔ میری نگاہ آسمان پر پڑی۔ آسمان کے مشرقی افق پر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک گول سیاہ چاند آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ وہ بالکل سیاہ تھا اور اس کے کناروں پر سے ہلکی ہلکی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ انسانوں کی دنیا میں ایسا عام طور پر چاند گرہن کے وقت ہوتا ہے۔ مالینی نے ٹھیک کہا تھا میرا جسم اگرچہ چمگادڑ کا تھا مگر میرا دماغ میرا اپنا تھا اور میں چمگادڑ کی طرح نہیں بلکہ انسانوں کی طرح سوچ رہا تھا۔

اتنا فرق ضرور پڑا تھا کہ میری سماعت کی حس زیادہ تیز ہو گئی تھی۔ میں اس طرف آگیا جہاں مجھے روہنی نے خونخوار کالی سردارنی کا غار دکھایا تھا۔ غار کے باہر دونوں طرف دو مشعلیں روشن تھیں۔ چار بدروح باڈی گارڈ ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے تھے۔ یہ کالے سیاہ حبشیوں کی طرح کی بدروحیں تھیں اور ان کی آنکھیں لال انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ چمگادڑوں کے بارے میں یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ وہ سارا دن درختوں کی شاخوں میں الٹی لٹکی رہتی ہیں اور رات کو اپنے شکار کی تلاش میں نکلتی ہیں کیونکہ انہیں دن کی روشنی میں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ رات کے اندھیرے میں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ وہ رات کے وقت گھروں کے باہر بندھی ہوئی گائے بھینسوں یا گھوڑوں وغیرہ کی گردن سے چمٹ کر ان کے خون سے اپنا پیٹ بھرتی ہیں۔ جب وہ رات کو ہوا میں پرواز کرتی ہیں تو وہ انسانی آنکھ کو

دکھائی نہیں دیتیں۔ ان کی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے اور وہ پلک جھپکنے میں اڑان بھر کر اِدھر سے اُدھر نکل جاتی ہیں۔

میں نے یہ دیکھنے کے لئے کہ پہرے دار بدروحوں کو دکھائی دیتا ہوں یا نہیں غار کے باہر فضا میں بڑی تیزی سے دو تین غوطے لگائے تو میں نے دیکھا کہ دو بدروحوں نے اوپر نگاہیں اٹھائیں اور پھر خاموشی سے پہرہ دینے لگیں۔ انہوں نے مجھے بھی کالی بدروح کے غار کی چمگادڑ سمجھا جو اپنا پیٹ بھرنے جا رہی تھی یا پیٹ بھر کر غار کی طرف واپس آ گئی تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ بدروحیں میرے وجود سے بے نیاز ہیں تو میں نے غوطہ لگایا اور ایک زناٹے کے ساتھ کالی بدروح کے غار میں گھس گیا۔

غار میں پہلے تو اندھیرا ہی اندھیرا تھا پھر دیکھا کہ آگے جا کر ایک چبوترہ تھا جس پر تخت بچھا تھا اس تخت پر ایک ڈراؤنی شکل والی بدروح بے سدھ پڑی تھی۔ یہ خونخوار کالی بدروح ہی ہو سکتی تھی۔ اس کی تصدیق یوں ہوئی کہ تخت کے سرہانے کی جانب جلتی ہوئی مشعل کی روشنی میں مجھے اس ڈراؤنی شکل والی سیاہ فام بدروح کے گلے میں ہڈیوں کی مالائیں نظر آ گئیں۔ اس خیال سے کہ میرے بار بار پرواز کرنے سے خونخوار کالی کی آنکھ نہ کھل جائے میں دیوار کے ساتھ چمٹ گیا اور چمگادڑوں والا چھوٹا سا سر گھما کر کالی بدروح کو دیکھنے لگا۔ خونخوار کالی بھینس کی طرح سانس لے رہی تھی۔ اس کے سانس کی ناگوار بو غار میں پھیلی ہوئی تھی۔ سانس لینے سے خونخوار کالی کا بھدا پیٹ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ میری نظریں اس کی گردن کی مالاؤں پر جمی ہوئی تھیں۔

میں نے دیوار کے ساتھ چمٹے ہوئے اپنے آپ کو چھوڑ دیا اور نیچے زمین پر آ کر چمگادڑوں کی طرح پر پھیلا کر بیٹھ گیا۔ میں بھی چمگادڑوں کی طرح ہانپ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ چمگادڑ کو بڑی جلدی سانس چڑھ جاتا ہے۔ پھر میں اچھل کر خونخوار کالی بدروح کے تخت پر جا بیٹھا اور غور سے اسے سوتے میں دیکھنے لگا۔ یہ چڑیل واقعی بے سدھ ہو



کر پڑی تھی اور اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ اب مجھے وہاں اپنے اصلی انسانی روپ میں ظاہر ہو کر کالی کی مالا سے انسانی ہڈی کا کوئی مہرہ نکالنا تھا۔ خونخوار کالی کے گلے میں ہڈیوں کی چھ سات مالائیں تھیں۔ میں نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ پہرے دار روحیں باہر ہی پہرہ دے رہی تھیں۔

میں نے مالینی کا بتایا ہوا منتر دل میں پڑھا اور اس کے فوراً بعد مجھے جیسے ایک دھچکا سا لگا اور دوسرے لمحے میں خونخوار کالی کے تخت پر اس کے بالکل قریب اپنی انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا۔ میں انسانی شکل میں آتے ہی بالکل سمٹ کر جتنا نیچے ہو سکتا تھا ہو گیا۔ مشعل کی روشنی ہڈیوں کی مالاؤں پر پڑ رہی تھی۔ ایک جگہ ہڈیوں کی ایک مالا کے مہرے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ میں جھٹکے سے مہرے توڑتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ کہیں کالی بدروح کو ہوش نہ آ جائے۔ مجھے کسی ایسے مہرے کی تلاش تھی جو ذرا سی کوشش کے بعد میرے ہاتھ میں آ جائے۔

جہاں سے چھ سات ہڈیوں کے مہرے باہر کو نکلے ہوئے تھے میں نے ان کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس وقت مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ایک ہزار وولٹ کی بجلی کی ننگی تار کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھا رہا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ کی انگلیاں دو تین بار کانپی تھیں مگر میں نے ہمت سے کام لیا اور خدا کا نام لے کر اپنی انگلیوں سے خونخوار کالی کی گردن کی مالاؤں کو اس جگہ سے چھوا جہاں سے کچھ ہڈیوں کے مہرے باہر کو نکلے ہوئے تھے۔ ایک مہرہ میری انگلیوں کی گرفت میں آ گیا۔ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسے آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا۔ میں نے مہرے پر اپنی گرفت کو مزید مضبوط کرتے ہوئے انگوٹھے سے اسے ذرا زور سے دبایا تو مہرہ مالا سے الگ ہو کر میرے ہاتھ میں آ گیا۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو مجھے نصیب ہوئی تھی۔

کالی بدروح کا مہرہ ہاتھ میں دبائے میں ایک دو سیکنڈ کے لئے وہیں پتھر کا بت بنا

رہا۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ کہیں خونخوار کالی کو پتہ تو نہیں چل گیا۔ لیکن اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ سوم رس میں دھت ہو کر بے ہوش پڑی تھی۔ قدرت میری مدد کر رہی تھی۔ اب وہاں ایک سیکنڈ بھی رکنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ میں نے دل میں مالینی کا بتایا ہوا منتر دوبارہ پڑھا اور اسی لمحے میں اپنی انسانی شکل کو چھوڑ کر ایک بار پھر چمگادڑ بن گیا۔ چمگادڑ بنتے ہی میں نے محسوس کیا کہ خونخوار کالی کا مہرہ میرے ایک ہاتھ کے چھوٹے سے پنجے میں تھا۔ میں فوراً اڑان بھر کر اوپر کو اٹھا اور غوطہ لگا کر تیزی سے غار میں سے باہر نکل گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ میں موت کے منہ سے زندہ سلامت ہی نہیں بلکہ اپنا مقصد حاصل کر کے نکل آیا ہوں۔

غار سے نکلنے کے فوراً بعد میں اوپر کی طرف بلند ہو گیا اور کافی اوپر جا کر میں اس ٹیلے کے عقب میں اترنے لگا جہاں روہنی اور مالینی بے چینی سے میری راہ دیکھ رہی تھیں۔ جب میں مالینی بدروح کے غار میں چمگادڑ کے روپ میں غوطہ لگا کر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ روہنی اور مالینی کے چہروں پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ تھی اور وہ نگاہیں اوپر اٹھائے مجھے غار میں چکر لگاتے دیکھ رہی تھیں۔ میں مٹی کے اس چبوترے پر اتر گیا جہاں سے مجھے مالینی نے چمگادڑ بنا کر اس خطرناک مہم پر روانہ کیا تھا۔ چبوترے پر بیٹھنے کے فوراً بعد میں نے خفیہ منتر پڑھا اور اپنی انسانی شکل میں ظاہر ہو گیا۔

مالینی اور روہنی جلدی سے میرے پاس آ گئیں۔ روہنی کو تو میرے زندہ واپس آ جانے کی بے حد خوشی ہوئی تھی۔ مالینی نے مجھ سے پوچھا۔ ”جس کام کے لئے تم گئے تھے کیا وہ ہو گیا؟“

میں نے اپنی بند مٹھی کھول کر اس کے آگے کر دی۔ میری مٹھی میں کالی بدروح کی مالا کی ہڈیوں کا مہرہ تھا۔ مالینی نے اسے اٹھا کر غور سے دیکھا۔ پھر سونگھا اور بولی۔ ”شیر وان! یہ کالی سردارنی کی مالا کا مہرہ ہی ہے۔ تم نے وہ کام کر دکھایا ہے جس کی مجھے بہت کم امید تھی بلکہ مجھے تو تمہاری جان کی بھی فکر لگ گئی تھی۔“



روہنی نے آگے بڑھ کر میری پیشانی کو چوم لیا اور کہنے لگی۔ ”خدا نے میری دعائیں قبول کر لیں۔“

پھر اس نے مالینی سے کہا۔ ”مالینی بہن! اب ہم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے واپس انسانوں کی دنیا میں جانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اجازت دو کیونکہ اگر کالی بدروح کو ہوش آ گیا تو ممکن ہے اسے پتہ چل جائے کہ اس کی مالا میں سے انسانی ہڈیوں کا ایک مہرہ کم ہو گیا ہے اور پھر ہمارے لئے یہاں سے فرار ہونا ناممکن ہو جائے۔“

مالینی کہنے لگی۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ مہرہ تمہارا ہے۔ اب اسے سنبھال کر اپنے پاس رکھنا بلکہ اس کو کسی مضبوط باریک تار میں پرو کر اپنے بازو سے باندھ لینا اور ہرگز ہرگز کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔“

پھر مالینی نے مجھے بھی ہدایت کرتے ہوئے کہا۔ ”شیر وان! روہنی تو ایک روح یا بھٹکی ہوئی بدروح ہے۔ تم زندہ انسان ہو۔ تم دوسرے انسانوں سے اکثر ملتے جلتے رہو گے۔ یاد رکھو۔ کالی کے مہرے کا ذکر تم بھی کسی کے آگے نہ کرنا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ راز بتا دینے سے تم دونوں اس سے بھی بھاری مشکل میں پھنس جاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”میں تم سے اور روہنی تم دونوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خونخوار کالی کے مہرے کا ذکر بھول کر بھی کسی سے نہیں کروں گا۔“

یہ بات میں بتانا بھول گیا ہوں کہ جس وقت مالینی نے مجھے چمگادڑ کا روپ دیا تھا تو وہ پہلے مجھے غیبی حالت سے واپس میری انسانی حالت میں لے آئی تھی اور جس وقت میں مہرہ لے کر اس کے پاس آ کر اپنی انسانی شکل میں واپس آیا تھا تو غیبی حالت میں نہیں تھا بلکہ ظاہری حالت میں تھا۔ روہنی نے کالی کا مہرہ لے کر اسے اپنی ساڑھی میں چھپا کر رکھ لیا تھا۔

اس کے بعد روہنی اور مالینی دونوں بدروح سہیلیاں ایک دوسری کے گلے لگ کر ملیں۔ مالینی نے کہا۔ ”روہنی! اپنا خیال رکھنا۔ پجاری رگھو تمہیں اپنے قبضے میں کرنے

کے لئے تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے اور وہ بڑا مکروہ اور طاقتور دشمن ہے۔ اس کے پاس ایسے ایسے ویدک منتر ہیں کہ اگر وہ کسی چٹان پر پھونک دے تو چٹان دو ٹکڑے ہو جائے۔"

روہنی نے کہا۔ "تم فکر نہ کرو مالینی! مجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے۔ میں اس کے ہر وار کا ڈٹ کا مقابلہ کروں گی اور پھر ایک دن اس شیطان کی مکروہ بدروح کو اگنی کی چتا میں جلا کر بھسم کر دوں گی اور اپنے آپ کو اور شہزادے شیروان کو اور دنیا کے سارے انسانوں کو پجاری رگھو کے چنگل سے مکت (آزاد) کرا دوں گی۔"

مالینی کہنے لگی۔ "میری پیاری سہیلی! تمہیں اور شیروان کو اب قدم قدم پر چوکس ہو کر رہنا پڑے گا کیونکہ بہت جلد پجاری رگھو کو معلوم ہو جائے گا کہ تم کالی بدروح کی مالا کا مہرہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی ہو۔ پجاری رگھو اس مہرے کی آسیبی طاقت کو جانتا ہے۔ وہ ہر قیمت پر تم سے یہ مہرہ چھین لینے کی کوشش کرے گا۔"

روہنی نے اس کے جواب میں کہا۔ "میں پجاری رگھو کے تمام ہتھکنڈوں کو جانتی ہوں۔ وہ مجھ سے کالی کا مہرہ کیا چھینے گا بلکہ میں خدا کی مدد سے اور اس مہرے کی آسیبی شکتی کے ذریعے رگھو کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کر دوں گی۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔ ہمیں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرنا چاہئے۔"

روہنی نے اتنا کہہ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور مجھے ایک دھچکا لگا اور میں غائب ہو گیا۔ مجھے سوائے اپنے وہاں ہر شے نظر آ رہی تھی۔ مالینی بھی نظر آ رہی تھی، روہنی بھی نظر آ رہی تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے روہنی بھی میری نگاہوں سے غائب ہو گئی۔

مالینی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خدا حافظ سلطانہ!"

بدروح مالینی نے پہلی بار وہاں روہنی کو اس کے مسلمان نام سے پکارا تھا۔ اس کے جواب میں مجھے روہنی کی آواز سنائی دی اس نے کہا۔ "خدا حافظ! مالینی!"



میرے پاؤں اپنے آپ زمین سے بلند ہو گئے اور ہم مالینی کے غار سے تیرتے ہوئے باہر ٹیلے کی ڈھلان پر نکل آئے۔ باہر نکلتے ہی روہنی نے مجھے سرگوشی میں کہا۔ "جب تک میں نہ کہوں زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا۔ بالکل خاموش رہنا۔"

ٹیلے کی ڈھلان پر آتے ہی ہم فضا میں اوپر کی طرف اٹھتے چلے گئے۔ جب ہم کافی بلندی پر چلے گئے تو میں نے نیچے دیکھا۔ بدروحوں کی دنیا کے پہاڑ سیاہ دھبوں کی طرح نظر آنے لگے تھے۔ ایک خاص اونچائی پر پہنچنے کے بعد روہنی سلطانہ نے مجھے ساتھ لئے ہوئے دائیں جانب ایک غوطہ لگایا اور ہم تیزی سے اڑنے لگے۔ ایک مقام پر آ کر ہمیں سیاہ دھوئیں کے مرغولوں نے گھیرے میں لے لیا۔ یہاں روہنی نے رفتار اور زیادہ تیز کر لی اور ہم سیاہ دھوئیں کے مرغولوں میں سے تیر کی طرح نکل گئے۔ آگے کھلی فضا تھی اور کسی قدر روشن بھی تھی۔ روہنی سلطانہ کی آواز آئی۔ "شیروان! میں انتہائی رفتار سے پرواز کرنے والی ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے اپنا سانس روک لیا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ جب آتی دفعہ روہنی نے انتہائی رفتار سے پرواز شروع کی تھی تو مجھے کچھ اس قسم کا احساس ہوا تھا جیسے کسی نے مجھے اچانک اوپر کھینچ لیا ہو۔ ایک سیکنڈ بعد مجھے بالکل ویسا ہی احساس ہوا اور اس کے بعد مجھے نیچے زمین نظر آنا بند ہو گئی۔ ایک سنسناہٹ کی سی آواز میرے کانوں میں مسلسل گونج رہی تھی اور مجھے اپنے چاروں طرف اور اوپر نیچے ایک گہرے سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ خلا تھا یا دنیا کی فضا تھی یا کون سا خلائی زون تھا جس میں سے روہنی ایک ایسی رفتار کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ اڑائے لئے جا رہی تھی جس کا اندازہ لگانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ کسی وقت مجھے لگتا کہ ہم خلا میں کسی جگہ معلق ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر اچانک مجھے گرمی کا احساس ہوا۔ کچھ دیر بعد گرمی ختم ہو گئی اور سردی شروع ہو گئی۔ کچھ دیر کے بعد سردی بھی ختم ہو گئی اور پھر نہ سردی تھی

اور نہ گرمی تھی۔ اچانک دور سے بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا تیزی سے آتا ہوا ہمارے قریب سے ہو کر پیچھے نکل گیا۔ اس کی وجہ سے مجھے احساس ہوا کہ ہم کس قدر زیادہ رفتار سے پرواز کر رہے ہیں۔ بادل بہت بڑا تھا مگر وہ میرے پلک جھپکنے سے بھی پہلے ہمارے قریب سے نکل گیا۔

میں حیران ہو رہا تھا کہ اگر ہم زمین کے گرد غلاف کی طرح لپٹی فضا میں سے گزر رہے ہیں تو فضا میں بکھرے ہوئے کروڑوں ذرات کی رگڑ سے ہم آگ میں جل کر بھسم کیوں نہیں ہو جاتے جس طرح کہ آسمان سے گرے ہوئے شہاب ثاقب زمین کی فضا میں داخل ہوتے ہی فضا کے ذرات کی رگڑ سے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم خلا میں سے گزر رہے تھے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم نہ صرف زندہ تھے بلکہ سانس بھی لے رہے تھے۔ خلا میں تو آکسیجن بالکل ہی نہیں ہوتی اور کوئی انسان خلائی لباس کے بغیر خلا میں سفر نہیں کر سکتا اور پھر خلا میں آکسیجن نہ ہونے کے علاوہ اتنی سردی ہوتی ہے کہ قطب شمالی اور قطب جنوبی کی یخ بستہ سردی کو ایک ساتھ ملا کر اس کی شدت کو ایک لاکھ گنا زیادہ کر دیا جائے تو بھی وہ خلا کی سردی کے مقابلے میں گرمی ہی ہو گی سردی نہیں ہو گی۔ نہ صرف یہ کہ مجھے سردی نہیں لگ رہی تھی اور دم بھی نہیں گھٹ رہا تھا بلکہ میں اتنے آرام سکون سے کھڑا تھا جیسے کسی لفٹ میں کھڑا ہوں۔

اچانک ہلکی خوشگوار ہوا مجھے چھو کر گزرنے لگی۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ اب وہ غائب نہیں تھی بلکہ نظر آنے لگی تھی۔ کہنے لگی۔ ”ہم اپنی منزل پر پہنچنے والے ہیں۔“

میں نے نیچے دیکھا۔ سفید بادلوں کے ٹکڑے بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہے تھے۔ ان کے نیچے کسی شہر کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ ہر طرف سنہری روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

روہنی کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ”شیروان! انسانوں کی دنیا کتنی خوب



صورت ہے۔“

”ہاں! میں دیکھ رہی ہوں۔ مجھے انسانوں کی دنیا اور انسانوں سے بڑی محبت ہے لیکن کچھ لوگ دنیا کی خوبصورتی اور یہاں رہنے والے معصوم انسانوں کی خوشیاں برباد کرنا چاہتے ہیں۔ میں انسانیت کے دشمن ایسے لوگوں کو ختم کرنے کا عہد کر چکی ہوں۔“

”میں دنیا اور انسانوں کی بھلائی کی اس مہم میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ میں نے بڑے جذباتی انداز میں سلطانہ سے کہا۔

وہ بولی۔ ”تمہاری زبان سے یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی ہے۔ اسی لئے میں تم سے پیار کرتی ہوں۔“

روہنی سلطانہ کے منہ سے نکلے ہوئے محبت بھرے الفاظ سن کر مجھے حیرانی بھی ہوئی اور خوشی بھی بہت ہوئی۔ اس نے پہلی بار مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ مجھے اس لئے بھی خوشی ہوئی کہ وہ جانتی تھی کہ میں اُس کا مرحوم خاوند یا محبوب نہیں ہوں جس نے دنیا میں دوسرا جنم لیا ہے۔ وہ مجھے بتا چکی تھی کہ میں اس کے مرحوم شوہر شیروان کا ہم شکل ہوں، اس کا دوسرا جنم نہیں ہوں۔ اگرچہ میری شکل میں اسے اپنا مرحوم محبوب یاد آ جاتا تھا اس کے باوجود اس نے میری ایک الگ شخصیت کا اعتراف کیا تھا اور میری اسی الگ شخصیت سے محبت کرنے لگی تھی۔

کسی شہر کی پہاڑیاں، جنگل اور کھیت ہمیں نیچے صاف نظر آنے لگے تھے۔ میں نے ابھی تک اس جگہ کو نہیں پہچانا تھا۔ پھر مجھے ایک دیو ہیکل قلعے کی فصیل دکھائی دی۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”سلطانہ! یہ کون سا شہر ہے؟“

اس نے کہا۔ ”ہم جہاں سے چلے تھے اسی جگہ واپس آ گئے ہیں یہ جھانسی کا شہر ہے اور جو قلعہ تم دیکھ رہے ہو یہ میرے محل کا کھنڈر ہے۔“

ہم ویران محل کے کھنڈر کی چھت پر اتر گئے۔ چھت پر قدم رکھتے ہی ہم دونوں

غیبی حالت سے اپنی اپنی انسانی شکل میں واپس آ گئے۔ اس وقت جھانسی شہر میں صبح ہو رہی تھی۔ محل کے نیم تاریک زینے میں سے اتر کر ہم محل کے بالکونی والے کمرے میں آ کر سنگ مرمر کے چبوترے پر بنی ہوئی بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے روہنی سلطانہ سے کہا۔ ''تمہاری سہیلی مالینی اگر ہماری مدد نہ کرتی تو ہم خونخوار کالی کا مہرہ حاصل کرنے میں شاید کبھی کامیاب نہ ہوتے۔''

روہنی کہنے لگی۔ ''ہماری مدد ہمارے خدا نے کی ہے۔ مالینی میری سہیلی ایک ذریعہ تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے خیال میں اب ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کیا اس محل کے کھنڈر میں چھپ کر اپنے دشمن پجاری رگھو کا انتظار کریں کہ وہ اپنے حبشی غلاموں کی بدروحوں کے ذریعے ہمارے خلاف کیا کارروائی کرتا ہے۔''

روہنی کہنے لگی۔ ''اس سے پہلے کہ دشمن ہم پر وار کرے ہمیں اس پر وار کر دینا چاہئے۔ دشمن کو اپنی طاقت جمع کرنے کا موقع نہیں دینا چاہئے۔''

میں نے اُسے کہا۔ ''لیکن ہمیں تو معلوم ہی نہیں کہ ہمارا دشمن ہمارے خلاف کہاں گھات لگا کر بیٹھا ہوا ہے۔ ہم کیسے اُس پر وار کر سکتے ہیں۔ کیا تم اپنی طلسمی طاقت سے یہ پتہ نہیں کر سکتیں کہ ہمارا دشمن پجاری رگھو اس وقت کہاں ہو گا اور وہ تمہیں اپنے قبضے میں کرنے اور مجھے ہلاک کرنے کے لئے کیا منصوبہ بندی کر رہا ہے؟''

روہنی کہنے لگی۔ ''پجاری رگھو بڑی زبردست طلسمی قوت کا مالک ہے۔ میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی لیکن اس کے وار کو ناکام ضرور بنا سکتی ہوں اور اس پر چھپ کر یا گھات لگا کر وار بھی کر سکتی ہوں۔ میں اس کے سامنے نہیں جا سکتی۔ اگر میں اس کے سامنے آ گئی تو پھر میں اپنا آپ نہیں بچا سکوں گی۔ یوں مجھے اس سے دوُرخی جنگ کرنی ہو گی۔ اس سے اپنا آپ بچانا بھی ہو گا اور اس پر وار بھی کرنا ہو گا۔ ہماری یہ جنگ پستول، بندوق کی جنگ نہیں ہو گی بلکہ طلسمی منتروں کی جنگ ہو گی۔''



میں نے روہنی سے کہا۔ ''میں نے سن رکھا ہے کہ ہر جن بھوت یا چڑیل کی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔ اگر انسان کو اس کمزوری کا پتہ چل جائے تو وہ چڑیل یا بھوت انسان کے قبضے میں آ جاتا ہے۔ پجاری رگھو بھی ایک بدروح ہے، ایک بھوت ہے۔ کیا اس کی کوئی ایسی کمزوری نہیں ہے؟''

روہنی کہنے لگی۔ ''ضرور ہو گی۔ قدرت نے ان شیطانی بدروحوں کی ہلاکت کے لئے ان کا کوئی نہ کوئی کمزور پہلو ضرور رکھا ہوتا ہے۔ پجاری رگھو کی بھی کوئی نہ کوئی کمزوری ضرور ہو گی، اس کا مجھے علم نہیں۔ اس کا ہمیں سراغ لگانا ہو گا۔''

''یہ سراغ کیسے لگایا جا سکتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

روہنی گہری سوچ میں تھی۔ کہنے لگی۔ ''پجاری رگھو کی کمزوری کا راز مجھے مردہ برہمن لڑکی کی ادھ جلی لاش ہی بتا سکتی ہے۔ ایسی لاش جسے چتا کی آگ پر پوری طرح جلائے بغیر دریائے گنگا کی لہروں کے حوالے کر دیا گیا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بڑی پیچیدہ اور بھول بھلیوں والی بات ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے ہر ہندو عورت اور مرد کی لاش کو جب چتا پر رکھ کر آگ لگائی جاتی ہے تو اس کے جسم کو پورے طور پر جلا کر راکھ کر دیا جاتا ہے اور اس کے رشتے دار صبح کے وقت اس کی ہڈیاں وغیرہ برتن میں ڈال کر لے جاتے ہیں۔ کسی برہمن عورت کی ایسی لاش ہمیں شاید کہیں سے بھی نہیں ملے گی جسے آدھا جلا کر دریا میں بہا دیا گیا ہو۔''

روہنی کہنے لگی۔ ''صرف ایک جگہ سے ہمیں ایسی ادھ جلی لاش مل سکتی ہے وہ جگہ بنارس میں دریائے گنگا کے کنارے پر واقع شمشان ہیں۔ بنارس میں دریائے گنگا کے شمشانوں کو ہندو لوگ بڑا مقدس مانتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر کسی ہندو مردے کو گنگا کے کسی گھاٹ کے شمشان میں جلایا جائے تو اس کی آتما سیدھی سورگ میں چلی جاتی ہے اور اسے آواگون کے چکر سے نجات مل جاتی ہے۔ چنانچہ لوگ یہی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا اگر کوئی مر جائے تو وہ اس کی لاش گنگا کے گھاٹ پر نذرِ آتش

کریں۔ اس وجہ سے بنارس کے دریا کنارے والے شمشانوں میں ایسی صورت حال پیدا ہو گئی ہے کہ وہاں مردہ لاشوں کی قطار لگی رہتی ہے۔ بنارس اور دوسرے قریبی شہروں سے بھی لوگ اپنے مردوں کو وہاں جلانے کے لئے لاتے ہیں۔ مردے جلانے والوں کو سارا دن سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ اتنے رش میں کسی مردے کے پوری طرح سے جل کر راکھ ہونے کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ اپنے مردے گھاٹ پر لاشیں جلانے والوں کے حوالے کر کے انہیں پیسے دے کر چلے جاتے ہیں۔ وہ چھ چھ سات سات گھنٹے انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے مردوں کے ساتھ لاشیں جلانے والے یہ سلوک کرتے ہیں کہ انہیں جلدی جلدی تھوڑا بہت جلا کر ادھ جلی لاش کو دریائے گنگا میں بہا دیتے ہیں۔ ان آدھ جلی لاشوں کو مچھلیاں کھا جاتی ہیں۔ بعض لاشیں تیرتی ہوئی دور نکل جاتی ہیں۔ ہمیں صرف دریائے گنگا کے گھاٹ پر سے ہی کسی برہمن ہندو عورت کی آدھ جلی لاش مل سکتی ہے۔"

میں نے روہنی سے پوچھا۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ کسی آدھ جلی لاش پر تم نے چلہ کیا تو وہ تمہیں پجاری رگھو کی کمزوری بتا سکے گی؟"

روہنی بدروح نے کہا۔ "یہ میں جانتی ہوں کہ اگر میرا چلہ پورا ہو گیا اور چلہ کاٹنے کے دوران پجاری رگھو کو پتہ نہ چل گیا تو عورت کی آدھ جلی لاش بول پڑے گی اور مجھے بتا دے گی کہ پجاری رگھو کی کمزوری کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہمیں سب سے پہلے یہی کرنا چاہئے۔ کیونکہ دشمن کی اگر کوئی کمزوری ہاتھ آ جائے تو اسے آسانی سے شکست دی جا سکتی ہے۔"

روہنی کہنے لگی۔ "اس کے لئے ہمیں آج ہی بنارس جانا ہو گا اور وہاں شمشان گھاٹ پر کسی برہمن عورت کی آدھ جلی لاش کو تلاش کرنا ہو گا۔"

"اور اگر ہمیں پوری لاش نہ مل سکی تو کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔

روہنی نے کہا۔ "پوری لاش کی مجھے ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے صرف ادھ



جلی لاش کا سر چاہئے۔ مجھے ادھ جلے سر پر منتر پڑھ کر چلہ کاٹنا ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "بنارس یہاں سے کتنی دور ہو گا؟"

روہنی نے جواب دیا۔ "فاصلہ میرے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہمیں دیر نہیں کرنی چاہئے اور اسی وقت بنارس روانہ ہو جانا چاہئے۔"

میں نے کہا۔ "بدروحوں کی دنیا میں تو مجھے بھوک کا احساس تک نہیں ہوا۔ شاید اس لئے کہ وہاں میں تمہارے ساتھ غیبی حالت میں تھا مگر اب زندہ حالت میں ہوں۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ سب سے پہلے تو میں کسی ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھاؤں گا۔ اس کے بعد ہی میں تمہارے ساتھ بنارس جا سکوں گا۔"

روہنی مسکرانے لگی اور کہا۔ "تم زندہ انسانوں کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک کا مسئلہ ہے۔ اسی نے دنیا میں سارا فساد ڈالا ہوا ہے۔ میرا یہ مسئلہ مرنے کے بعد اپنے آپ حل ہو گیا ہے۔ مجھے نہ بھوک لگتی ہے نہ پیاس لگتی ہے۔ چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مگر جھانسی شہر کے کسی ہوٹل میں نہیں جائیں گے۔ یہاں تم پولیس والوں کو ان کی گاڑی سمیت بھسم کر چکی ہو۔ کسی پولیس کانسٹیبل نے ہمیں دیکھ لیا تو خواہ مخواہ ہمارا وقت ضائع ہو گا۔ کسی دوسرے شہر میں چلتے ہیں۔"

روہنی بولی۔ "ہم انڈیا کی راجدھانی دلی سے ہوتے ہوئے بنارس جائیں گے۔ دلی میں مسلمانوں کے بڑے ہوٹل ہیں وہاں تمہیں اپنی مرضی کا کھانا مل جائے گا۔ کیا تم تیار ہو؟"

میں نے کہا۔ "مجھے تیار رہنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کروں اب یہ میری مجبوری بن گئی ہے۔"

روہنی نے میرا ہاتھ تھام لیا اور کہنے لگی۔ "میرے شیروان! یہ میری بھی مجبوری ہے۔ یہ میری نجات اور تمہاری زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ میں یہ ہرگز برداشت نہیں کر سکتی کہ تم شیطان پجاری رگھو کے ہاتھوں ہلاک ہو جاؤ۔ اپنی نجات

کے لئے تو مجھے یہ سب کچھ کرنا ہی پڑ رہا ہے لیکن تمہیں زندہ سلامت دیکھنے کے لئے میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔"

میں نے روہنی سے پوچھا کہ کالی بدروح کا مہرہ اس نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے ناں۔ اس نے کہا۔ "کالی کا مہرہ میرے بلاؤز کے اندر بالکل محفوظ ہے۔"

میں نے اسے اپنا ہاتھ دکھا کر کہا۔ "اور تمہاری دی ہوئی انگوٹھی بھی میرے پاس بالکل محفوظ ہے۔"

روہنی نے میری انگلی میں پڑی ہوئی شہزادے کے تابوت کی سیاہ نگینے والی انگوٹھی پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی۔ "خدا کے حکم سے یہ انگوٹھی تمہاری حفاظت کرے گی۔"

ہم پرانے محل کے ویران کمرے سے نکل کر شکستہ بالکونی میں آگئے۔ روہنی نے منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکا۔ میرا جسم فوراً غائب ہو گیا لیکن میں اسے دیکھ رہا تھا۔ دوسرے لمحے روہنی بھی میری نگاہوں سے غائب ہو گئی مگر اس نے میرا ہاتھ اسی طرح پکڑ رکھا تھا۔ اس کے بعد ہم ویران محل کی بالکونی سے پرواز کر گئے۔

ہم اڑان بھرتے ہی کافی بلندی پر چلے گئے تھے۔ روہنی کو معلوم تھا کہ اسے کس طرف جانا ہے۔ ہماری رفتار بہت تیز تھی۔ دور نیچے مجھے جنگل، آبادیاں اور دریا، پہاڑ بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف جاتے نظر آ رہے تھے۔ کچھ ہی دیر کے بعد روہنی نے کہا۔ "ہم دلی پہنچنے والے ہیں۔"

چند لمحے گزرے ہوں گے کہ روہنی مجھے لے کر بلندی سے نیچے آنے لگی۔ کافی نیچے آنے کے بعد مجھے بھارت راجدھانی دلی کی بلند عمارتیں، ماڈرن ہائی رائز بلڈنگیں، کشادہ سڑکیں اور ان پر چلتا ٹریفک اور لوگوں کے ہجوم دکھائی دینے لگے۔ میں نے دلی شہر دیکھا ہوا تھا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ "ہم کس جگہ اتریں گے؟"

روہنی نے کہا۔ "ہم لال قلعے کی عقبی دیوار کے پاس اتریں گے۔ وہاں سے جامع مسجد قریب ہی ہے۔ وہاں مسلمانوں کے بہت ہوٹل ہیں۔"



ہم لال قلعے کے پیچھے ایک چھوٹے سے پارک میں اتر آئے۔ ہم دونوں غیبی حالت میں تھے یعنی ہم سب کو دیکھ رہے تھے مگر کوئی ہمیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ روہنی نے کہا۔ "کیا خیال ہے۔ ہم اسی طرح غیبی حالت میں ہی کسی ہوٹل میں نہ جائیں؟"

میں نے کہا۔ "نہیں نہیں روہنی۔ غیبی حالت میں میری بھوک ختم ہو گئی ہے۔ میں زندہ حالت میں کچھ کھانا پینا چاہتا ہوں۔"

روہنی بولی۔ "جیسے تمہاری مرضی لیکن احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ ظاہر ہوں جہاں ہم پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ وہاں آ جاؤ۔"

روہنی نے پارک کے ایک گھنے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس درخت کے نیچے کوئی آدمی نہیں تھا۔ وہاں آتے ہی ہم دونوں اپنی شکل میں واپس آگئے۔ زندہ حالت میں ظاہر ہوتے ہی مجھے بھوک اور پیاس لگنے لگی۔ روہنی کا لباس تبدیل ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے زعفرانی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ اب وہ مسلمان عورتوں کے لباس میں تھی اور اس نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ "سلطانہ! یہ دوسرا لباس تمہیں کہاں سے مل گیا؟"

وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔ "غیب کی دنیا میں ہر شے موجود ہوتی ہے۔ بس وہیں سے میں نے یہ لباس حاصل کر لیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "مگر یہ لباس تم نے کس وقت پہنا تھا؟ تم تو میرے ساتھ غیبی حالت میں تھیں اور تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔"

وہ بولی۔ "یہ ہماری بدروحوں کی دنیا کی باتیں ہیں۔ یہ اتنی آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ بہتر یہی ہے کہ تم ان کے بارے میں کچھ نہ پوچھا کرو کیونکہ ہمیں ایک لمبا سفر اکٹھے طے کرنا ہے اور اس سفر میں تم بہت سی ایسی باتیں دیکھو گے جنہیں دیکھ کر تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔"

دلی کی جامع مسجد کا علاقہ مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ ہے اور یہاں کئی مسلمانوں کے ہوٹل اور ریستوران ہیں جہاں حلال گوشت پکایا جاتا ہے۔ یہاں اس زمانے میں مسلم ہوٹل کے نام سے ایک ہوٹل بڑا مشہور تھا ہم اس ہوٹل کے ایک کیبن میں بیٹھ گئے۔ ہوٹل کا ملازم لڑکا آگیا۔ میں نے اسے ایک آدمی کا کھانا لانے کے لئے کہا تو وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”صاحب! آپ کی بیگم صاحبہ نہیں کھائیں گی؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں بھائی وہ نہیں کھائیں گی۔ میرے لئے جو پکا ہے لے آؤ۔“

روہنی زیر لب مسکرا رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”کبھی مجھے بھی بھوک لگا کرتی تھی اور میں بھی اپنے شیروان کے ساتھ محل میں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”تمہیں کھانوں کی خوشبو تو ضرور آتی ہوگی۔“

اس نے کہا۔ ”بہت زیادہ خوشبو آتی ہے۔ شاید یہی میری سزا ہے کہ مجھے ہر قسم کے کھانوں کی خوشبو آئے گی مگر میں کچھ کھا نہیں سکوں گی۔ اس لئے کہ میں نیک روح نہیں ہوں۔ ایک گناہ گار اور بدروح ہوں.....“

اور روہنی سلطانہ دھیمی آواز میں خدا سے اپنے گناہوں کی بخشش کی دعا مانگنے لگی۔ مجھے اس پر بڑا رحم آیا اور مجھے عبرت بھی حاصل ہوئی کہ انسان کو جب تک وہ زندہ ہے ہمیشہ نیک عمل کرنے چاہئیں اور گناہوں سے بچنا چاہئے اور اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ انسان کو اگر اس کے نیک اعمال کی جزا ملتی ہے تو برے اعمال کی سزا بھی ضرور مل کر رہتی ہے۔ یہ اللہ کا حکم ہے جسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔

کھانا کھانے کے بعد جب لڑکا بل لے کر آیا تو میں نے بل روہنی کے آگے کر دیا۔ اس نے اپنی بند مٹھی کھولی تو اس میں سو روپے کا انڈین کرنسی نوٹ تھا۔ بل پچھتر روپے کا تھا۔ روہنی نے لڑکے سے کہا۔ ”باقی پیسے تم رکھ لو۔ یہ تمہارا انعام ہے۔“

لڑکا خوش ہو گیا اور سلام بیگم صاحبہ کہہ کر چلا گیا۔

روہنی نے مجھے کہا۔ ”چلو ہم ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔“



ہم ہوٹل سے نکل کر لال قلعے کے پیچھے آگئے۔ وہاں آس پاس کوئی انسان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں روہنی نے منتر پھونک کر پہلے مجھے غائب کیا پھر خود بھی غائب ہو گئی۔ اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم زمین سے بلند ہو کر دلی کے آسمان پر پرواز کرنے لگے۔ ہم ایک بار پھر کافی بلندی پر چلے گئے تھے اور نیچے زمین بھورے رنگ کی نظر آ رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ہمیں زیادہ سے زیادہ پندرہ بیس منٹ لگے ہوں گے کہ روہنی نے نیچے آتے ہوئے کہا۔ ”شیروان! اس وقت ہم ہندوؤں کے متبرک شہر بنارس کے اوپر ہیں۔“

میں نیچے دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے نیچے سوائے بھورے رنگ کے دھبوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر ایک دم سے شہر کے مکان دکھائی دینے لگے۔ ان کے درمیان ایک سفید لکیر نظر آ رہی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”یہ ہندوؤں کا پوتر دریا گنگا ہے۔ یہی ہماری منزل ہے۔“

ہم دریا کنارے ایک شمشان گھاٹ کے پاس اتر آئے۔

روہنی نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ گنگا کنارے سب سے بڑا شمشان گھاٹ تھا۔ دریا کے ساتھ لمبے لمبے چبوترے بنے ہوئے تھے جن پر چھ سات چتائیں جل رہی تھیں۔ ان چتاؤں کی آگ میں مردے جلائے جا رہے تھے۔ ہر چتا کے قریب مردوں کے بھوپان لمبی لمبی قطاروں کی شکل میں زمین پر پڑے تھے۔ ہم مسلمان جس چارپائی پر میت کو رکھ کر قبرستان لے جاتے ہیں اسے جنازہ کہتے ہیں۔ ہندو بانس کے جس چھاپے پر اپنے مردے کو ڈال کر جلانے کے لئے لے جاتے ہیں اسے بھوپان کہتے ہیں۔ بھوپان بانس کا ایک سٹریچر ہوتا ہے جس پر مردے کو ڈال کر اوپر کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ اگر کسی نئی نویلی دلہن کا مردہ ہو تو اس پر گوٹے والی لال چنی ڈال دی جاتی ہے۔

میں اور روہنی غیبی حالت میں شمشان گھاٹ پر مردوں کی قطار کے پاس کھڑے تھے۔ ایک بھوپان کے مردے پر سرخ گوٹے والا دوپٹہ ڈالا ہوا تھا۔ روہنی نے مجھے

سرگوشی میں کہا۔ ''یہ کسی نئی نویلی دلہن کا مردہ ہے۔ مجھے اسی مردے کے ادھ جلے سر کی ضرورت ہے۔''

میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ ''لیکن یہ لاش تو قطار کے سب سے آخر میں ہے۔ اس کی باری کافی دیر بعد آئے گی۔''

روہنی نے کہا۔ ''ہم اس کے جلنے کا انتظار کریں گے۔''

کچھ مرنے والوں کے لواحقین اور رشتے دار بھی وہاں سوگوار حالت میں بیٹھے اپنے مردے کی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ایسے رشتے دار جو دور پرے کے رشتے دار تھے مردے کو لاشیں جلانے والے کے حوالے کر کے جا چکے تھے۔ ہم کسی کو دکھائی تو دیتے نہیں تھے ہم وہیں کھڑے ہو کر دلہن کے مردے کی باری کا انتظار کرنے لگے۔ یہ شمشان گھاٹ دریا کے کنارے پر تھا وہاں جلائے جانے والے مردوں کی چار قطاریں تھیں۔ ہر قطار میں سات سات آٹھ آٹھ مردوں کے بھوپان زمین پر پڑے تھے۔ ہم جس قطار میں ایک طرف ہٹ کر کھڑے تھے اس کے آخر میں جو چتا جل رہی تھی اس پر دو آدمی کام کر رہے تھے۔ جس مردے کے عزیز واقارب وہاں موجود تھے یہ لاشیں جلانے والے بڑی احتیاط اور ادب احترام کے ساتھ مردے کے جنازے یعنی بھوپان کو اٹھا کر چتا کی آگ پر رکھتے تھے لیکن جس مردے کے بھوپان کے پاس مردے کا کوئی عزیز نہیں ہوتا تھا اس کے بھوپان کو وہ گھسیٹ کر چتا کے اوپر رکھ کر تھوڑا سا اِدھر اُدھر کرتے جیسے بھون رہے ہوں اور مردہ پورا جلتا بھی نہیں تھا کہ وہ ادھ جلے مردے کو دریا میں پھینک دیتے تھے۔

دلہن کے مردے کے پاس صرف تین آدمی بیٹھے تھے۔ جب اس کے جلانے کی باری آئی تو لاشیں جلانے والوں نے دلہن کی لاش کو بھوپان سمیت اٹھایا اور بڑے آرام سے جلتی چتا کے شعلوں پر رکھ دیا۔ دلہن کے اوپر ڈالا ہوا سرخ ریشمی دوپٹہ دیکھتے دیکھتے جل گیا۔ اس کے بعد دلہن کے مردے کا جسم جلنے لگا۔ دلہن کے رشتے



دار جو اس کے ساتھ آئے تھے کچھ دیر وہاں کھڑے چتا کی طرف تکتے رہے پھر خاموشی سے ایک طرف کو چل دیئے۔ لاشیں جلانے والوں نے انہیں جاتے دیکھ کر چتا میں سلاخیں ڈالیں اور دلہن کے ادھ جلے مردے کو نکال کر دریا میں ڈال دیا۔

روہنی نے مجھے کہا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

روہنی ہوا میں کوئی چار فٹ بلند ہو کر دریا کے اس مقام پر آ گئی جہاں دلہن کی ادھ جلی لاش کو پھینکا گیا تھا۔ دلہن کی لاش چتا کی بھڑکتی آگ میں اتنی دیر میں ہی کافی جل چکی تھی۔ اس کا جسم سیاہ پڑ چکا تھا اور آدھے سے زیادہ گوشت جھڑ گیا تھا۔ یہ ادھ جلی لاش گنگا کی لہروں پر تیرتی ہوئی تیزی سے آگے کی طرف چلی جا رہی تھی۔ میں روہنی کے ساتھ ہی تھا۔ دن کا وقت تھا چاروں طرف دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روہنی میرا ہاتھ پکڑے دلہن کی تیرتی ہوئی لاش کے ساتھ ساتھ آگے جا رہی تھی۔

O

میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ جا رہا تھا۔

جب دلہن کی لاش دریا کنارے کافی آگے نکل گئی اور شمشان گھاٹ بہت پیچھے رہ گئے اور دریا کنارے جھاڑیاں اور گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تو روہنی نے دریا کی لہروں کے بہاؤ کے ساتھ تیرتی لاش کو جھک کر بازو سے پکڑ کر اٹھایا تو لاش کا بازو اس کے جسم سے الگ ہو گیا۔ روہنی نے دوسرے بازو کو پکڑ کر اٹھایا تو وہ بھی جسم سے الگ ہو گیا۔ اس کے فوراً بعد ایسا ہوا کہ دریا کے اندر سے ایک بہت بڑی مچھلی منہ پھاڑے نمودار ہوئی اور اس نے دلہن کی لاش کی ایک ٹانگ کو اپنے جبڑوں میں دبوچ کر جھٹکا دیا تو لاش کی ایک ٹانگ بھی اس کے جسم سے الگ ہو گئی۔ مچھلی لاش کی ٹانگ منہ میں دبائے دریا میں غوطہ لگا گئی۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”لاش کو دریا سے نکال لو نہیں تو مچھلیاں باقی بچی ہوئی لاش بھی ہڑپ کر جائیں گی۔“

روہنی اسی وقت لاش پر جھک گئی اور دلہن کی لاش کو بالوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا اور ایک درخت کے نیچے لا کر رکھ دیا۔ عجیب ڈراؤنی لاش تھی۔ صرف ایک ٹانگ، دھڑ اور سر باقی رہ گیا تھا وہ بھی جل کر سیاہ ہو چکا تھا۔ ایک طرف کے سر کے بال سارے جل چکے تھے۔ ایک طرف کے کچھ بال خدا جانے کیسے جلنے سے بچ گئے تھے۔ ناک کا گوشت جل گیا ہوا تھا۔ آنکھوں کی جگہ دو سیاہ گڑھے باقی رہ گئے تھے۔ دونوں ہونٹ بھی جل چکے تھے اور اوپر نیچے کے دانت سارے کے سارے دکھائی دے رہے تھے۔ گردن آگ میں جل کر پچک کر رہ گئی تھی۔ سینے کی چھ سات پسلیاں



صاف نظر آ رہی تھیں۔ پیٹ پھٹ چکا تھا اور اندر کے تمام اعضاء انتڑیاں وغیرہ کوئلہ بن چکی تھیں۔

ہم لاش کے پاس بیٹھ گئے۔ روہنی نے دونوں ہاتھوں سے دلہن کی لاش کے ادھ جلے سر کو پکڑ کر ذرا سے اپنی طرف کھینچا تو اس کا سر دھڑ سے الگ ہو گیا اور صرف کھوپڑی روہنی کے ہاتھ میں رہ گئی۔

روہنی نے دلہن کی باقی ماندہ لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور کھوپڑی اٹھا کر اوپر کو بلند ہو گئی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ درختوں کے اوپر جا کر اس نے شہر بنارس کی دائیں جانب رخ کر لیا۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! بنارس کے شمال میں گئو گھاٹ کے جنگل میں سوامی جی کی دو سو سال پرانی گھپا ہے۔ اس گھپا کے اندر سوامی جی کی مڑھی ہے۔ مجھے اس مڑھی کے پاس بیٹھ کر دلہن کی کھوپڑی اپنے سامنے رکھ کر ساری رات منتروں کے جاپ کا چلہ کاٹنا ہو گا۔ رات کے پچھلے پہر دلہن کی کھوپڑی میرے سوالوں کے جواب دینے شروع کر دے گی اور پجاری رگھو کی کمزوری ہم پر ظاہر کر دے گی۔“

اس وقت سورج ڈھلنے لگا تھا۔ گئو گھاٹ کے جنگل میں سوامی جی کی پرانی گھپا میں پہنچتے پہنچتے شام کا اندھیرا چھا گیا۔ سوامی کی گھپا ایک اجاڑ ویران کھنڈر کی شکل میں ایک تالاب کے کنارے واقع تھی۔ یہ پرانی اینٹوں کی مخروطی میناری عمارت تھی جس کی دیواروں کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھیں۔ دروازے کے دونوں پٹ غائب تھے۔ ہم گھپا میں داخل ہو گئے۔ اندر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ سیلن کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ روہنی نے کہا۔ ”شیروان! تم اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتے۔ میں دیکھ لیتی ہوں۔ اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو مجھے مڑھی کے سرہانے مٹی کا پرانا چراغ نظر آ رہا ہے میں اسے روشن کرتی ہوں۔“

مجھے اندھیرے میں روہنی سائے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک جگہ سے مٹی کا چراغ اٹھایا اور اس کو انگلی سے چھوا۔ چراغ کی لو روشن ہو

گئی۔ اس نے چراغ مڑھی کے سرہانے اینٹ پر رکھ دیا۔ چراغ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ایک ٹوٹا پھوٹا اینٹوں کا چبوترہ تھا جس پر چھوٹی سی مخروطی مڑھی بنی ہوئی تھی۔ ہر طرف مکڑیوں کے جالے لٹک رہے تھے۔

روہنی نے دلہن کی ادھ جلی کھوپڑی مڑھی کے آگے ایک اینٹ پر رکھ دی اور میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''مجھے اس کھوپڑی پر منتر پھونک کر چلہ کاٹنا ہے۔ مجھے ساری رات لگ جائے گی۔ تم اگر چاہو تو یہاں گھپا کے کونے میں بیٹھ جاؤ۔ اگر چاہو تو باہر کھلی ہوا میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ جب رات ڈھلنے لگے تو آ جانا۔''

میں نے کہا۔ ''میں کچھ دیر تمہارے پاس ہی رہوں گا۔ اس کے بعد اگر جی چاہا تو باہر چلا جاؤں گا۔''

روہنی بولی۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن جب میں منتر پڑھ کر چلہ شروع کروں تو مجھے بالکل نہ بلانا نہیں تو چلہ الٹا پڑ جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''میں خاموش رہوں گا۔ لیکن یہ دلہن کی کھوپڑی تم سے کیسے بات کرے گی؟''

روہنی بولی۔ ''میں اس نئی نویلی دلہن کی آتما کو حاضر کروں گی۔ وہ حاضر ہو کر مجھ سے خود ہی بات کرے گی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بھی تو بدروح ہی ہو گی۔ کہیں مجھے چمٹ تو نہیں جائے گی؟''

روہنی نے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے تمہیں کسی کی بدروح پریشان نہیں کر سکتی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر میں اپنے اردگرد ایک طلسمی دائرہ کھینچ دیتی ہوں۔''

روہنی نے وہاں پڑی ہوئی ایک لکڑی کا ٹکڑا اٹھایا اور جہاں وہ کھڑی تھی وہاں اپنے اردگرد ایک دائرہ کھینچ دیا۔ دائرہ کھینچتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ کچھ پڑھتی جا رہی تھی۔ دائرہ کھینچنے کے بعد اس نے مجھ سے کہا۔ ''میرے چلہ کاٹنے کے دوران کوئی بھی بدروح اس دائرے سے نکل کر تمہاری طرف نہیں آ سکے گی۔ اب خاموش ہو کر



بیٹھے رہو۔ میں چلہ شروع کرنے لگی ہوں۔''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ روہنی دلہن کی کھوپڑی کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور کسی عجیب و غریب منتر کا پاٹھ کرنا شروع کر دیا۔ دیئے کی روشنی میں وہ مجھے صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے منتر پڑھنے شروع کر دیئے۔ منتر پڑھتے پڑھتے تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ کھوپڑی پر پھونک مار دیتی تھی۔ کچھ دیر تک تو میں اُسے تکتا رہا پھر مجھ پر غیبی حالت میں بھی ہلکی ہلکی غنودگی طاری ہونے لگی اور میں نیند کی آغوش میں اتر گیا۔ نیند کی حالت میں بھی میرے کانوں کو روہنی کے منتروں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ دیر گزرنے کے بعد یہ آواز آنی بھی بند ہو گئی۔ کچھ پتہ نہیں میں کب تک سویا رہا۔ میری آنکھ اس وقت کھلی جب روہنی کے منتر پڑھنے کی آواز کافی بلند ہو چکی تھی۔ اب وہ منتر پڑھتے پڑھتے زمین پر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا کر کھوپڑی پر ڈال دیتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے دیئے کی روشنی میں دیکھا کہ دلہن کی ادھ جلی کھوپڑی نے حرکت کرنی شروع کر دی۔ وہ آہستہ آہستہ تھرکنے لگی تھی۔ کھوپڑی کو حرکت کرتے دیکھ کر روہنی نے زیادہ بلند آواز میں منتروں کا جاپ شروع کر دیا۔

میں دل میں خوف سا محسوس کر رہا تھا کہ خدا جانے اب یہاں کیسی کیسی بدروحیں اترنا شروع ہو جائیں گی اور روہنی کے ساتھ مجھ پر بھی کوئی ناگہانی مصیبت نازل ہو جائے گی۔ کھوپڑی تھرکتے تھرکتے ایک بار ذرا سی اچھلی اور اینٹ پر سیدھی ہو کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں کے سیاہ گڑھے اس طرح روشن ہو گئے جیسے اس کے اندر کسی نے بجلی کا بلب روشن کر دیا ہو۔

تب روہنی منتر پڑھتے پڑھتے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی پھر اس نے ذرا اونچی آواز میں دلہن کی کھوپڑی کو سوال کیا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

کھوپڑی میں سے ایک عورت کی آواز آئی۔ ''میرا نام چمپا ہے۔''

روہنی نے پوچھا۔ ”کیا تم مجھے دیکھ رہی ہو؟“

کھوپڑی نے جواب دیا۔ ”ہاں میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں نے تمہارا چلہ کاٹا ہے۔ جو پوچھوں گی بتاؤ گی؟“

کھوپڑی نے جواب دیا۔ ”بتاؤں گی۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”مجھے بتاؤ پجاری رگھو کی کمزوری کیا ہے؟“

کھوپڑی کی آنکھوں سے نکلتی روشنی یہ سوال سنتے ہی مدھم پڑ گئی۔ پھر ایک دم تیز ہو گئی۔ کھوپڑی نے کہا۔ ”پجاری رگھو کی کوئی کمزوری نہیں ہے۔ اس کی شکتی کی کوئی اتھاہ نہیں ہے۔ تم اس کا مقابلہ نہیں کر سکو گی۔ یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔“

روہنی نے کہا۔ ”تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ میں بھی بدروح ہوں اور بدروح جس بدروح کا چلہ کاٹتی ہے اس کا ذمہ ہو جاتا ہے کہ وہ چلہ کاٹنے والی بدروح کی مدد کرے اس لئے میرا مدد کرنا تمہارا فرض بن چکا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ میں پجاری رگھو کی بدروح کو کس طریقے سے شکست دے سکتی ہوں؟“

کھوپڑی نے کہا۔ ”تم کسی بھی طریقے سے پجاری رگھو کو شکست نہیں دے سکو گی نادان بدروح! اس خیال کو بھول جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گی۔“

روہنی نے اپنی آواز کو ذرا بلند کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارا چلہ کاٹ کر تمہارا حق ادا کر دیا ہے۔ اب تم اپنا حق ادا کرو اور مجھے بتاؤ کہ میں اپنے دشمن کو کیسے نیست و نابود کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں تمہیں کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور معلوم ہو گا۔“

کھوپڑی نے کہا۔ ”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ مجھے پریشان نہ کرو۔“

روہنی نے دلہن کی بدروح کو دھمکی دیتے ہوئے کہا۔ ”چمپا کی بدروح! میری بات غور سے سن اگر تم نے مجھے کوئی طریقہ بتا دیا تو میں تمہاری کھوپڑی اگنی دیوی کے شعلوں کے حوالے کر دوں گی تاکہ جل کر راکھ ہو جانے کے بعد تمہاری بدروح کو



چین نصیب ہو۔ اگر تم نے انکار کیا تو میں تمہاری کھوپڑی کو جنگلی درندوں کے آگے ڈال دوں گی جو تمہیں چبا چبا کر کھا جائیں گے اور تمہاری بدروح تڑپتی رہ جائے گی۔“

اچانک کھوپڑی کی آواز بلند ہوئی۔ ”بھگوان کے لئے ایسا نہ کرنا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے تمہیں بتائے دیتی ہوں۔“

روہنی نے کہا۔ ”میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایسا نہیں کروں گی۔ اب بتاؤ وہ کون سا طریقہ ہے جس کے ذریعے میں اپنے دشمن پجاری رگھو کو شکست دے سکتی ہوں۔“

کھوپڑی کہنے لگی۔ ”یہ بات تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ تم غائب ہو کر دنیا والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکتی ہو مگر پجاری رگھو تمہیں غیبی حالت میں بھی دیکھ سکتا ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

کھوپڑی نے کہا۔ ”میں تمہیں ایک ایسی چیز دوں گی جس کو استعمال کرنے سے تم پجاری رگھو کو بھی نظر نہیں آؤ گی۔ بس میں تمہاری اتنی ہی مدد کر سکتی ہوں۔ جب تم پجاری رگھو کی نگاہوں سے بھی غائب ہو سکو گی۔ جب وہ بھی تمہیں نہیں دیکھ سکے گا تو اس کے قریب پہنچ کر تم اسے ہلاک کرنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکتی ہو۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”وہ کون سی چیز ہے؟“

دلہن کی کھوپڑی نے کہا۔ ”اس کے لئے تمہیں میرے سر کو اگنی دیوی کے شعلوں کے سپرد کرنا ہو گا۔ جب میری کھوپڑی جل کر راکھ ہو جائے گی تو میری راکھ کا کچھ حصہ تم اپنے پاس رکھ لینا اور باقی دریا میں بہا دینا۔“

روہنی نے پوچھا۔ ”میں تمہاری راکھ کو لے کر کیا کروں گی؟“

کھوپڑی نے کہا۔ ”جب تم میری راکھ کی ایک ایک سلائی اپنے آنکھوں میں ڈال کر پجاری رگھو کے سامنے جاؤ گی تو وہ اپنی زبردست جادو کی طاقت کے باوجود تمہیں نہیں دیکھ سکے گا۔ اس حالت میں تم اپنے دشمن کو ختم کرنے کے لئے کوئی بھی وار کر

سکتی ہو۔ لیکن ایک بات کا تمہیں خیال کرنا پڑے گا۔"

"کس بات کا؟" روہنی نے پوچھا۔

دلہن کی ادھ جلی کھوپڑی نے کہا۔ "میری کھوپڑی کی راکھ کا اثر ایک دن تک بھی رہ سکتا ہے اور ایک گھنٹے میں بھی ختم ہو سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راکھ کی سلائی آنکھوں میں ڈالنے کے دس منٹ بعد ہی اس کا اثر ختم ہو جائے اور تم پجاری رگھو کو نظر آنے لگو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک منٹ بعد میری راکھ کا اثر دوبارہ واپس آ جائے اور تم ایک بار پھر پجاری رگھو کی نظروں سے غائب ہو جاؤ۔"

روہنی نے جھنجلا کر کہا۔ "اس طرح تو میں کسی مشکل میں بھی پھنس سکتی ہوں۔ میں پجاری رگھو کو ایک بار نظر آ گئی تو وہ مجھے اسی وقت اپنے قبضے میں کر لے گا۔"

کھوپڑی نے کہا۔ "اس کا کوئی توڑ تمہیں خود تلاش کرنا ہو گا۔ تمہارے لئے میں جو کچھ کر سکتی تھی وہ میں نے بتا دیا ہے اس سے زیادہ کچھ کرنے کی میری طاقت نہیں ہے۔"

روہنی نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ جیسا تم نے کہا ہے میں ویسے ہی کروں گی۔"

جیسے ہی روہنی کی زبان سے یہ الفاظ نکلے دلہن کی کھوپڑی کی آنکھوں کی روشنی بجھ گئی اور وہ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ میں روہنی اور دلہن کی کھوپڑی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب کھوپڑی جو تھوڑی دیر پہلے اینٹ پر سیدھی کھڑی تھی ایک طرف لڑھک گئی تو روہنی نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "دلہن کی بدروح چلی گئی ہے۔ تم نے ہماری گفتگو ضرور سن لی ہو گی۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا ہے۔"

روہنی کھوپڑی کو ہاتھ میں لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کہنے لگی۔ "اب ہمیں اس کھوپڑی کو جلا دینا ہو گا۔"

ہم گھپا سے نکل کر باہر تالاب کے پاس آ گئے۔ رات کا اندھیرا چاروں طرف چھا



چکا تھا۔ ہم نے اِدھر اُدھر سے درختوں کے سوکھے پتے اور گری پڑی شاخیں ایک جگہ اکٹھی کر لیں۔ روہنی نے دلہن کی کھوپڑی کو اس کے اندر رکھ کر اس کے اوپر اور لکڑیاں رکھ دیں اور پھر روہنی نے سوکھی شاخوں اور پتوں کے ڈھیر کو اپنی انگلی سے چھوا اور ڈھیر کو آگ لگ گئی۔ جب ساری لکڑیاں جل گئیں تو روہنی نے درخت کی ایک ٹہنی سے کرید کر انگاروں کو ایک طرف ہٹایا تو دلہن کی کھوپڑی ویسی کی ویسی پڑی تھی۔

روہنی نے کہا۔ "یہ جل کر راکھ ہو چکی ہے۔"

پھر روہنی نے درخت کا ایک چوڑا پتا اٹھایا اور اس کو کھوپڑی کے ساتھ لگا کر کھوپڑی کو ٹہنی سے ہلایا۔ آدھی کھوپڑی راکھ بن کر پتے میں گری۔ اس کے فوراً بعد باقی کی کھوپڑی بھی اپنے آپ راکھ بن کر بیٹھ گئی۔ روہنی نے پتے میں جو راکھ اٹھائی تھی اسے پتے سمیت اپنے آنچل کے ساتھ اچھی طرح سے باندھ کر رکھ لیا اور کہنے لگی۔ "کھوپڑی کی بچی ہوئی راکھ کو ہمیں دریا میں بہا دینا ہو گا۔"

اور اس نے کھوپڑی کی باقی کی راکھ کو بھی اپنے آنچل کے دوسرے سرے میں ڈال کر باندھ لیا اور کہنے لگی۔ "دریا یہاں سے دور نہیں ہے۔ ہمیں وہاں اس راکھ کو بہا دینا ہو گا۔ میرے ساتھ آ جاؤ۔"

ہم سوامی جی کی گھپا کے علاقے سے پرواز کر کے دریائے گنگا کی طرف چلے۔ دریا قریب ہی تھا۔ ہم بنارس شہر کے شمال میں ہی تھے۔ ہم نے دلہن کی کھوپڑی کی راکھ کو دریا میں بہا دیا۔

آسمان پر اس وقت سحر کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ "مجھے یہ بتاؤ کہ اب ہمیں کس طرف جانا ہے اور کیا کرنا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو ہمیں ابھی تک اپنی مہم میں کوئی کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ تم نے دلہن کی لاش کا چلہ ضرور کاٹا ہے مگر اس کے بدلے میں دلہن کی بدروح نے تمہاری طاقت میں تھوڑا سا اضافہ

کرنے کے [illegible] تمہیں کچھ نہیں بتایا۔ اگر ہم ذرا غور کریں تو ہم بالکل نہتے ہیں اور ایک ایسے دشمن کے سامنے کھڑے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا اسلحہ موجود ہے۔ میں مانتا ہوں کہ کھوپڑی کی راکھ کی سلائی آنکھوں میں لگانے کے بعد ہم اپنے دشمن پجاری رگھو کو نظر نہیں آئیں گے لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہیں ہوگا کہ پجاری رگھو کی طاقت کا سب سے کمزور پہلو کون سا ہے تاکہ ہم اسے اپنے حملے کا نشانہ بنا سکیں۔ جب تک ہمیں اس کے کسی کمزور پہلو کا راز معلوم نہیں ہوگا ہم اپنی مہم میں کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔ ہم پجاری رگھو پر دستی بموں کا ٹوکرا بھی پھینک دیں گے تو اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔"

روہنی بڑے غور سے میری باتیں سن رہی تھی۔ جب میں نے اپنی بات ختم کی تو کہنے لگی۔ "میں تمہاری باتوں سے پورا اتفاق کرتی ہوں۔ لیکن ابھی ہم جنگ کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمیں جہاں کہیں سے بھی کوئی جنگ میں کام آنے والا اسلحہ ملتا ہے ہم اسے اپنے پاس رکھ لیتے ہیں کہ شاید کبھی وقت پر کام آجائے کیونکہ ہمارے دشمن پجاری رگھو کی طلسمی طاقت کے کئی پہلو ہیں، کئی حلقے ہیں۔ خدا نے چاہا تو ہمیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں اپنے دشمن پر کہاں وار کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

روہنی کہنے لگی۔ "ہمیں صبح ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ جب دن نکل آئے گا اور بنارس شہر کے بازار کھل جائیں گے تو مجھے کسی دکان سے چاندی کا ایک خالی تعویذ اور چاندی کا ایک تار خریدنا ہوگا۔ خالی تعویذ میں، میں کھوپڑی کی راکھ بند کر کے اسے اپنے ایک بازو کے ساتھ باندھ لوں گی۔ چاندی کے تار میں کالی بدروح کا مہرہ پرو کر میں دوسرے بازو پر باندھ کر استعمال کروں گی یہ دونوں کام کرنے کے بعد ہی ہم دشمن تک پہنچنے کا کوئی راستہ تلاش کر سکیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اس دوران دشمن خود بھی ہم پر حملہ کر دے کیونکہ



میرا خیال ہے پجاری رگھو کو ضرور پتہ چل گیا ہوگا کہ ہم بدروحوں کی دنیا میں کالی بدروح کے پاس چلے گئے تھے۔ پجاری رگھو ہوشیار ہو گیا ہوگا۔"

روہنی بھی شاید اسی طرح سوچ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ "پجاری رگھو بدروحوں کی دوسری دنیا میں رہتا ہے جہاں ہم لوگ نہیں جا سکتے۔ وہ میری بلکہ اب ہماری تلاش میں انسانوں کی دنیا میں ضرور آتا ہے۔ ہمیں صرف یہ سراغ لگانا ہوگا کہ وہ انسانوں کی دنیا میں کب آتا ہے اور یہاں کس شمشان گھاٹ یا ویران جگہ میں آکر اترتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم خود ایک بدروح بھی ہو۔ تمہارے پاس رگھو کے مقابلے میں کوئی کم طلسمی طاقت نہیں ہے۔ کیا تم یہ سراغ نہیں لگا سکتیں؟"

روہنی نے جواب دیا۔ "میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میری طلسمی طاقت پجاری رگھو کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

میں نے فوراً کہا۔ "تو پھر ہم تو اسی طرح بھٹکتے رہیں گے اور تمہارے ساتھ میں بھی بھٹکتا رہوں گا اور اس دوران کوئی پتہ نہیں کب ہمارا دشمن اچانک ہم پر وار کر کے ہمیں ختم کر ڈالے....."

روہنی کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ کہنے لگی۔ "میں ایک کام کر سکتی ہوں۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

کہنے لگی۔ "آج سے تین سو سال پہلے جب میں اپنے محل میں ملکہ بن کر رہ رہی تھی تو درگا نام کی میری ایک سہیلی تھی جو جے پور کے راجہ کی رقاصہ یعنی نرتکی اور محبوبہ بھی تھی۔ لیکن نرتکی درگا کو محل کے ایک حبشی غلام سے محبت ہو گئی۔ راجہ کو پتہ چلا تو اس نے درگا نرتکی کو قتل کروا دیا۔ مجھے یقین ہے کہ درگا نرتکی کی بدروح اسی محل میں موجود ہوگی۔ مجھے اس کے پاس جا کر اس بارے میں مشورہ کرنا چاہئے۔ بدروحوں کو دوسری بدروحوں کے بہت سے راز معلوم ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ ”تو پھر ابھی اس کے پاس چلتے ہیں۔“

روہنی نے کہا۔ ”بدروحیں ویران جگہوں پر آدھی رات کے وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ دن کے وقت وہ زمین کے اندر پاتال میں چھپی رہتی ہیں۔ ہم کچھ وقت بنارس میں خالی تعویذ وغیرہ خریدنے میں گزارتے ہیں۔ اس کے بعد جے پور کی طرف پرواز کر جائیں گے اور وہاں رات ہونے کا انتظار کریں گے۔“

یہ فیصلہ کرنے کے بعد ہم اسی غیبی حالت میں پرواز کر کے بنارس شہر کی ایک ویران جگہ پر دریا کنارے اتر گئے۔ روہنی نے کہا۔ ”اب ہمیں عام انسانوں کی شکل صورت میں واپس آجانا چاہئے۔“

سب سے پہلے روہنی اپنی عورت کی شکل میں واپس آئی اس کے بعد اس نے مجھ پر منتر پھونکا اور میں اپنی انسانی شکل وصورت میں واپس آگیا۔ ہم بنارس کے ایک بازار میں آگئے جہاں دکانیں کھل چکی تھیں اور لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ ہم ایک ہندو سنار کی دکان پر گئے اور اس سے خالی تعویذ طلب کیا۔ بنارس پجاریوں اور جوتشیوں کا شہر بھی مشہور تھا۔ ہندو ویسے بھی توہم پرست ہوتے ہیں اور جوتشی نجومی کی مرضی کے بغیر کوئی کاروبار شروع کرتے ہیں اور نہ بچوں کی شادی بیاہ کا دن مقرر کرتے ہیں۔ کسی کی بیماری لمبی ہو جائے تو وہ پجاری سے کاغذ پر لکھا ہوا ویدوں کا اشلوک لے کر اسے خالی تعویذ میں بند کر کے اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے۔

چنانچہ اس قسم کے چاندی کے خالی تعویذ انڈیا کے شہروں اور خاص طور پر مندروں کے شہر بندرابن، کاشی، ہردوار، متھرا اور بنارس میں سناروں کی دکانوں پر عام مل جاتے ہیں۔ لالہ جی نے روہنی کو چاندی کا ایک تعویذ دکھایا اور کہا۔ ”بہن جی! یہ خالص چاندی کا تعویذ ہے۔“

تعویذ چھوٹا سا تھا لیکن اس میں کھوپڑی کی راکھ ہی تو رکھنی تھی۔ روہنی نے وہ تعویذ اور چاندی کا ایک مضبوط باریک تار بھی خرید لیا۔ اس کے بعد ہم دکان سے باہر



نکلے تو میں نے روہنی سے کہا۔ ”انسانی جسم میں واپس آنے کے بعد مجھے بھوک کا احساس ہو رہا تھا۔“

روہنی نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ کہنے لگی۔ ”جے پور چل کر ناشتہ کر لینا۔“

بنارس سے ہم غیبی حالت میں جے پور آگئے۔

جے پور کا پرانا شہر، شہر کے قلعے اور پرانے محلات اور پرانی بارہ دریاں سب روہنی کی دیکھی بھالی تھیں۔ ہم ایک ویران سے مقام پر اتر کر انسانی شکل میں واپس آ گئے۔ وہاں سے جے پور شہر میں داخل ہوئے یہ بڑا تاریخی شہر تھا۔ راجاؤں کے پرانے محل تھے جن میں سے بعض محل ابھی تک کافی صحیح حالت میں تھے۔ دنیا بھر کے ملکوں کے سیاح ان محلات کو دیکھنے ہر سال آتے تھے۔ میں نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر ناشتہ کیا اور وہاں سے اٹھا کر روہنی مجھے اس تین سو برس پرانے محل میں لے آئی جہاں اس کی سہیلی نرتکی درگا کا قتل ہوا تھا۔ یہ محل اپنی پرانی حالت میں نہیں تھا اور ویران ہو چکا تھا۔ لیکن بھارت کے محکمہ آثار قدیمہ والوں نے پھر بھی اسے کافی بہتر حالت میں رکھا ہوا تھا۔

جس وقت ہم محل میں داخل ہوئے اس وقت کچھ غیر ملکی سیاح بھی محل میں ادھر اُدھر چل پھر کر تصویریں وغیرہ اتار رہے تھے۔ ہم دونوں اپنی عام انسانوں والی شکل میں ظاہر حالت میں تھے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب نہیں تھے۔ اگرچہ روہنی عام شلوار قمیض میں تھی مگر اس کی شخصیت ہی بڑی پرکشش تھی۔ وہ دراز قد اور خوبصورت تھی۔ اس کی چال میں بھی مہارانیوں والا وقار تھا۔ ہم دونوں وقت گزارنے کے لئے راجہ کے پرانے محل میں گھوم پھر رہے تھے اور روہنی مجھے بتا رہی تھی کہ جب میں اپنی سہیلی نرتکی درگا سے کبھی ملنے آتی تھی تو ہم اس جھروکے کے پاس بیٹھ کر بڑی باتیں کیا کرتی تھیں۔ وہاں ہم سیر کرتی تھیں۔ نرتکی درگا کا کمرہ محل

کی دوسری منزل پر تھا۔ اسی طرح باتیں کرتے ہم محل کے بے شمار ستونوں والے ہال کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ایک نوجوان غیر ملکی سیاح بھی وہاں چل پھر کر محل کی دیواروں پر بنے ہوئے پرانے نقش و نگار کی تصویریں اتار رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھا تو جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا شاید وہ روہنی کی پروقار شخصیت سے متاثر ہو گیا تھا۔ اس نے ہمارے قریب آ کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں کہا۔ ”شما کرنا۔ میں تمہاری ایک فوٹو لینا چاہتا ہوں۔ کیا تم کو اعتراض تو نہیں۔“

یونہی میرے منہ سے نکل گیا۔ ”نہیں کوئی اعتراض نہیں۔“

روہنی نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ تصویر اتروانا نہیں چاہتی تھی لیکن چونکہ میں نے حامی بھر لی تھی شاید اس لئے اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ اس غیر ملکی نوجوان سیاح کے ہاتھ میں ایسا کیمرہ تھا جس میں سے اسی وقت کلر فوٹو باہر آ جاتی تھی۔ اس قسم کے کیمرے اس زمانے میں یورپ کے ملکوں میں عام ہوتے تھے۔

میں تصویر اتروانے کے لئے روہنی کے پاس پوز بنا کر کھڑا ہو گیا۔ غیر ملکی سیاح نے کیمرے کا رخ ہماری طرف کیا اور بٹن دبا دیا اور تھینک یو کہا۔ اسی لمحے کیمرے کے اندر سے ہلکی سی آواز کے ساتھ ہماری رنگین فوٹو باہر نکل آئی۔ غیر ملکی سیاح نے بڑے شوق سے فوٹو کو نکال کر دیکھا اور پھر دیکھتا ہی رہ گیا۔ کبھی وہ فوٹو کو دیکھتا اور کبھی ہماری طرف دیکھتا۔ میں نے آگے بڑھ کر غیر ملکی سیاح سے کہا۔ ”یہ تصویر ہمیں دے دو۔ یہ ہماری یادگار فوٹو ہے۔“

غیر ملکی سیاح نے فوٹو میری طرف بڑھا دی اور پھر اپنے کیمرے کا شٹر کھول کر اسے غور سے دیکھنے لگا۔ اب جو میں نے فوٹو لے کر اسے دیکھا تو میں بڑا حیران ہوا کیونکہ اس فوٹو میں، میں تو موجود تھا مگر روہنی موجود نہیں تھی وہ غائب تھی۔ اس کی تصویر نہیں اتری تھی حالانکہ تصویر اترواتے وقت وہ میرے ساتھ کھڑی تھی۔ روہنی بھی فوٹو کو دیکھ رہی تھی۔



غیر ملکی سیاح تو اس قدر حیرت زدہ تھا کہ کبھی اپنے کیمرے کو دیکھتا اور کبھی روہنی کی طرف دیکھتا تھا۔ اسی حیرت کے عالم میں وہ ہمیں فوٹو دے کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد روہنی مجھ سے کہنے لگی۔ ”میں جانتی تھی کہ میری فوٹو نہیں اترے گی۔ میں تمہیں منع بھی کرنا چاہتی تھی لیکن تم تصویر اتروانے کے لئے ہاں کر چکے تھے اس لئے خاموش رہی۔“

حیران میں بھی تھا اور کلر فوٹو کو بار بار دیکھ رہا تھا۔ فوٹو میں روہنی کی جگہ بالکل ایسے خالی تھی جیسے میں نے وہ تصویر اکیلے اتروائی ہو۔ حالانکہ وہ تصویر اترواتے وقت میرے پاس کھڑی تھی۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”کیمرے نے تمہاری تصویر کیوں نہیں اتاری؟“

اس نے میرا بازو تھام کر مجھے محل کے دوسرے حصے کی طرف لے جاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”میں زندہ عورت نہیں ہوں۔ میں مر چکی ہوں اور اپنی بدروح کی شکل میں چل پھر رہی ہوں اور ہم بدروحوں کی تصویر کوئی بھی کیمرہ نہیں اتار سکتا۔“

یہ میرے لئے ایک نیا انکشاف تھا۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”اس محل میں وہ کمرہ کہاں ہے جہاں تمہاری سہیلی دُرگا کو قتل کیا گیا تھا۔“

اس نے کہا۔ ”وہ کمرہ اس محل کے تہہ خانے میں ہے مگر وہاں ہم صرف رات کے وقت ہی جائیں گے۔“

میں خاموش رہا اور روہنی سے بالکل نہ پوچھا کہ ہم صرف رات کے وقت ہی وہاں کیوں جائیں گے۔ دن کے وقت کیوں نہیں جا سکتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روہنی نے شروع دن ہی سے مجھے اس قسم کے سوالات پوچھنے سے منع کر دیا تھا۔

جے پور میں اتنے قدیم محلات، بارہ دریاں اور تاریخی مقامات تھے کہ ہمیں ان میں گھومتے ہوئے شام ہو گئی۔ مجھے پھر بھوک لگ گئی تھی چنانچہ ہم جے پور شہر کے ایک ہوٹل میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں میں نے کھانا کھایا اس کے بعد ہم نرتکی دُرگا کے

محل میں واپس آ گئے۔ یہ محل بھی انڈیا کے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں تھا۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ سیاحوں کی آمد و رفت کے لئے گیٹ بند کر دیا جا چکا تھا۔

باہر دو مسلح چوکیدار پہرہ دے رہے تھے۔ مگر ہمیں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ روہنی مجھے ایک خفیہ راستے سے محل کے اندر لے گئی۔ ہم غائب ہو کر بھی جا سکتے تھے مگر غائب ہونے کی طاقت کو روہنی وہاں کبھی استعمال نہیں کرتی تھی جہاں اس کے بغیر بھی کام چل سکتا ہو۔ ہمیں آدھی رات گزر جانے کے بعد محل کے تہہ خانے میں جانا تھا اس لئے ہم وقت گزارنے کے لئے محل کی چھت پر بارہ دری میں بیٹھ گئے۔

رات کا منظر بڑا خوبصورت تھا۔ آسمان پر چاند نکلا ہوا تھا جس کا عکس دوسری جانب ایک بہت بڑی جھیل میں پڑ رہا تھا۔ چاندنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ محل کی چھت پر سے جے پور شہر کی روشنیاں چمکتے ہیرے موتیوں کی طرح لگ رہی تھیں۔

روہنی نے اپنے بلاؤز کے اندر سے کالی بدروح کا مہرہ اور وہ تہہ کی ہوئی کاغذ کی پڑیا نکال لی جس میں دلہن کی کھوپڑی کی راکھ تھی۔ پھر اس نے چاندی کا تار اور چاندی کا تعویذ بھی نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ کہنے لگی۔ ”میں چاہتی ہوں۔ اس وقت یہ کام بھی ہو جائے۔“

سب سے پہلے اس نے چاندی کے تعویذ میں دلہن کی کھوپڑی کی راکھ ڈالی اور اسے اچھی طرح سے بند کر کے اپنی قمیض کی آستین اوپر اٹھائی اور مجھ سے کہا۔

”شیروان! میری جان! یہ تعویذ اوپر کر کے میرے بازو پر باندھ دو۔“

میں نے تعویذ بڑی احتیاط کے ساتھ اس کے بازو کے اوپر کر کے باندھ دیا۔ اس کے بعد روہنی نے کالی بدروح کے مہرے میں چاندی کا تار پرو دیا اور مجھ سے کہا۔

”کالی بدروح کا یہ مہرہ تعویذ کے نیچے کر کے باندھ دو۔“

میں نے اسے بھی روہنی کے بازو سے باندھ دیا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین



نیچے کر لی۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! شروع شروع میں تمہارے سر پر ہیرے جواہرات سے جڑا ہوا چھوٹا سا تاج ہوا کرتا تھا اور گلے میں سفید موتیوں کی مالا..... اب تم وہ کیوں نہیں پہنتیں؟ انہیں تم نے کہاں غائب کر دیا ہے؟“

روہنی نے مسکرا کر کہا۔ ”شیروان! ابھی ان باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہے۔ جب وقت آئے گا تو میں انہیں بھی پہن لوں گی۔“

میں نے کہا۔ ”تم شلوار قمیض میں بھی بڑی اچھی لگتی ہو۔“

وہ شرما سی گئی۔ کہنے لگی۔ ”شیروان! میرے محبوب! تم نے پہلی بار مجھ سے محبت پیار کی بات کی ہے۔ کبھی تم ہر وقت مجھ سے یہ باتیں کیا کرتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”میں وہ شیروان نہیں ہوں سلطانہ! جو تمہارا خاوند اور جھانسی کے صوبے کا صوبیدار ہوا کرتا تھا۔ میں محض اس کا ہم شکل ہوں یعنی میری تھوڑی سی اس سے شکل ملتی ہے۔“

روہنی آسمان پر چمکتے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”اگر تم ایسا ہی سمجھتے ہو تو میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی۔ میں تو اسی میں خوش ہوں کہ تین سو برس کے بعد انسانوں کی دنیا میں مجھے میرے شیروان کی شکل مل گئی ہے۔“

اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور گہرا سانس بھر کر محبت بھرے لہجے میں بولی۔ ”شیروان! وعدہ کرو کہ اس مہم میں کامیاب ہو جانے کے بعد بھی تم میرا ساتھ نہیں چھوڑو گے۔“

میں نے کہا۔ ”پتہ نہیں تب کیا حالات ہوں گے۔ میں وعدہ نہیں کر سکتا۔“

میں اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ ایک بار مجھے اس بدروحوں کی خرافات سے نجات مل جائے تو پھر کسی بدروح سے ملنا تو درکنار میں اس کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔

روہنی نے کہا۔ ''کیوں! تم ایسا وعدہ کیوں نہیں کر سکتے؟ لو میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ اس مہم کی کامیابی کے بعد جب میری روح کو نجات مل گئی تو اس کے بعد بھی میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

میں نے دل میں کہا۔ ''خدا نہ کرے کہ تم میرے ساتھ رہو۔''

اوپر سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ بھلا میں تمہیں ایسا کرنے سے کیسے منع کر سکتا ہوں۔ تم جب اور جس وقت اور جہاں چاہو میرے پاس پہنچ جاؤ گی میں تمہیں روک ہی نہیں سکوں گا۔''

روہنی نے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ بولی۔ ''کیا تم نہیں چاہتے کہ میں تمہیں ملنے آیا کروں؟''

میں نے جلدی سے اسے مطمئن کرنے کے انداز میں کہا۔ نہیں، نہیں سلطانہ! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ تم ہر وقت میرے پاس آ سکتی ہو۔''

اس قسم کی منافقت سے صرف میرے ایسا زندہ انسان ہی کام لے سکتا تھا۔ میری منافقت کو روہنی ایک بدروح ہو کر بھی نہ سمجھ سکی اور میری جھوٹی تسلی سے مطمئن ہو گئی۔

محل کی چھت پر بیٹھے باتیں کرتے جب آدھی رات ہو گئی تو روہنی کہنے لگی۔ ''رات آدھی گزر چکی ہے۔ اب ہمیں محل کے تہہ خانے میں جانا ہو گا۔''

یہ سن کر میرا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکا اور پھر معمول پر آ گیا۔ بس دل میں یہی خیال آیا تھا کہ میں ایک اور تین سو سال پرانی مقتولہ کی بدروح سے ملنے جا رہا ہوں۔ خدا خیر ہی کرے۔

روہنی کو اس قدیم محل کے سارے راستوں اور خفیہ راستوں کا علم تھا۔ وہ تین سو سال پہلے اس محل میں اپنی رقاصہ سہیلی دُرگا سے ملنے آیا کرتی تھی۔ ہم چھت سے



اترے اور ایک ایسی راہداری میں سے گزرنے لگے جس کی ایک جانب سنگ مرمر کے روشندان کی جالیوں میں سے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ وہ ایک زینے کے پاس آ کر رُک گئی جو نیچے اترتا تھا۔ کہنے لگی۔ ''یہ زینہ اس تہہ خانے میں اترتا ہے جہاں آج سے تین سو برس پہلے میری سہیلی نرتکی کا خون ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں پہنچنے کے بعد تمہیں کچھ ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں۔ تم ڈرو گے تو نہیں؟''

میں نے دل میں کہا۔ ''ڈروں گا نہیں تو کیا خوش ہوں گا؟''

مگر اوپر سے کہا۔ ''تم میرے ساتھ ہو۔ مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''مجھے تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔'' روہنی نے خوش ہو کر کہا اور میرے آگے ہو کر زینہ اترنے لگی۔

زینے میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ زینہ نیچے کافی دور تک چلا گیا تھا۔ روہنی نے کہا۔ ''میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دو۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

زینہ ختم ہو گیا۔ ہم تہہ خانے میں آ گئے۔ تہہ خانے میں بھی گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ ابھی تک روہنی کے کندھے پر ہی رکھا ہوا تھا کہ کہیں کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑوں۔ روہنی نے کہا۔ ''اپنا ہاتھ میرے کندھے پر ہی رکھنا۔ میں ایک جگہ روشنی کرتی ہوں۔''

وہ اندھیرے میں چونکہ دیکھ سکتی تھی اس لئے بے تکان چلی جا رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ ایک جگہ رُک گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ اس نے اپنا ایک بازو اونچا کیا ہے۔ پھر تہہ خانے میں مدھم سی روشنی پھیل گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ہم ایک ستون کے پاس کھڑے تھے اور ستون کے ساتھ لگی ہوئی ایک بریکٹ پر موم بتی روشن ہو گئی تھی۔

میں نے روہنی سے حیران ہو کر پوچھا۔ ''کیا یہ موم بتی یہاں تین سو برس سے

بجھی ہوئی تھی؟"

روہنی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے اچانک خیال آ گیا کہ روہنی نے مجھے ایسے سوال کرنے سے منع کر رکھا ہے جس کے جواب کا تعلق اس دنیا کی عقل و دانش کی حدود سے باہر ہو۔

میں نے تہہ خانے کی فضا کو دیکھا۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں تہہ خانے کا ماحول اور زیادہ پراسرار لگنے لگا تھا۔ تہہ خانے کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ چھت سے لے کر فرش تک چھ سات ستون کھڑے تھے۔ ایک جگہ دو ستونوں کے درمیان پتھر کا ایک کافی بڑا تخت بنا ہوا تھا۔ تخت کے پیچھے دیوار کے ساتھ لوہے کے تین چار رنگ چھلے لگے ہوئے تھے جن کے درمیان لوہے کی بڑی میخیں ٹھکی ہوئی تھیں۔ روہنی نے مجھے وہ زنجیریں دکھاتے ہوئے کہا۔ "میری پیاری سہیلی دُرگا نرتکی کو ظالم راجہ کے حکم سے ان زنجیروں کے ساتھ باندھ کر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ ظالم راجہ دُرگا سے اپنے ساتھ بے وفائی کرنے کا بڑی سنگ دلی سے بدلہ لے رہا تھا۔ ایک مہینے تک دُرگا کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کے بعد آخر راجہ کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا اس کی لاش کو یہاں دبا دیا گیا تھا؟"

روہنی نے کہا۔ "نہیں۔ لاش کو راجہ کے حکم سے جنگل میں جلا کر اس کی ہڈیاں راجستھان کے صحراؤں میں جگہ جگہ بکھیر دی گئی تھیں۔"

روہنی یہ بتانے کے بعد خاموش ہو گئی۔ شاید وہ اپنی پرانی سہیلی کی سوگوار یادوں میں ڈوب گئی تھی۔ میں بھی خاموش ہو گیا تھا۔ روہنی میرے بالکل قریب ایک ستون کے پاس بیٹھی تھی۔ ہمارا رُخ پتھر کے تخت کی طرف تھا۔ اچانک روہنی ایسے چونک سی پڑی جیسے اسے تہہ خانے میں کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ میں کچھ کہنے لگا تو روہنی نے جلدی سے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ روہنی



نے اپنی گردن کو ایک جانب تھوڑا سا ایسے جھکا لیا تھا جیسے کسی آواز کو سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں بھی ہمہ تن گوش ہو کر کسی غیبی آواز کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر ابھی تک وہاں مجھے کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔ تہہ خانہ زمین کے کافی نیچے جا کر بنایا گیا تھا اور وہاں قبر ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دینے لگی جیسے کوئی ٹھنڈے سانس بھر رہا ہو۔

میرے جسم میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ ٹھنڈی آہوں کی یہ آواز روہنی نے بھی سن لی تھی۔ اس نے میرے ہاتھ کو آہستہ سے دبایا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ آواز تم سن رہے ہو۔ میں بھی سن رہی ہوں۔

ٹھنڈی آہوں کی آواز جیسے آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔

روہنی نے میرے بازو کو پکڑا۔ خود بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھے بھی اٹھا لیا۔ ہم ستون کے پاس موم بتی کی روشنی میں کھڑے تھے اور ہماری نظریں سامنے پتھر کے تخت کی جانب تھیں۔ ٹھنڈے سانسوں کی آواز ہمارے اتنے قریب ہو گئی کہ مجھے لگا جیسے کوئی بالکل میرے کان کے قریب آ کر ٹھنڈے سانس بھر رہا ہے۔ بڑے درد بھرے انداز میں ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے۔ اس وقت مجھ پر واقعی بہت زیادہ خوف طاری ہو چکا تھا۔ ٹھنڈے سانس بھرنے کی آوازیں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگیں۔ یہاں تک کہ وہ بہت مدھم ہو گئیں جیسے بہت دور سے آ رہی ہوں۔ پھر اچانک ایک ہولناک چیخ سے میں لرز گیا اور روہنی کے ساتھ لگ گیا۔ یہ کسی عورت کی چیخ تھی اور ایسی اذیت ناک چیخ میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر کسی عورت کے کراہنے کی آواز آنے لگی۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی بدنصیب عورت کو ذبح کیا جا رہا ہے اور اس میں اتنی سکت بھی باقی نہیں رہی کہ وہ لفظ بھی منہ سے نکال سکے۔

یہ اذیت ناک ڈراؤنی کراہیں بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں۔ اب تہہ خانے کی فضا میں ایسا سناٹا چھا گیا جس میں موت کی دہشت تھی۔ شاید میرے ساتھ کھڑی

روحنی کے یہ محسوسات نہ ہوں مگر میں ایک زندہ اور زندگی سے محبت کرنے والے انسان کی حیثیت سے ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ روحنی بالکل ساکت کھڑی تھی اور اس کی نگاہیں تخت کے پیچھے سامنے والی دیوار پر لگی تھیں۔ میں بھی اس دیوار کو دیکھنے لگا۔ اچانک دیوار پر ایک سایہ سا لہرا کر غائب ہو گیا۔ یہ سایہ روحنی نے بھی ضرور دیکھ لیا تھا۔ جیسے ہی یہ سایہ غائب ہوا روحنی نے پہلی بار زبان کھولتے ہوئے کہا۔ ”ڈُرگا! کیا تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں روحنی ہوں۔ تمہاری سہیلی روحنی!“

جس زمانے میں ڈُرگا روحنی کی سہیلی تھی اس زمانے میں ابھی روحنی کی شادی مغل صوبے دار سے نہیں ہوئی تھی اور وہ ابھی مسلمان بھی نہیں ہوئی تھی۔ روحنی نے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا اور مغل شہزادے نے اس کا نام سلطانہ رکھا تھا۔

میں غیر شعوری طور پر سامنے والی دیوار کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک عورت کی خشک اور ویران سی آواز سنائی دی۔

”مین نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟“

ظاہر ہے یہ بدروح ڈُرگا ہی کی آواز تھی۔ اس کا لہجہ ایسا تھا جیسے اسے روحنی کا وہاں آنا ناگوار گزرا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں روحنی کے ساتھ تھا جس کا تعلق زندہ انسانوں کی دنیا سے تھا۔ اتنا مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ بدروحیں اپنی دنیا میں انسانوں کی مداخلت پسند نہیں کرتیں اور اگر کوئی بھولا بھٹکا انسان غلطی سے ان کی دنیا کی حدود میں داخل ہو جائے تو پھر اس سے چمٹ جاتی ہیں اور اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں جب تک کہ اس کی جان نہیں لے لیتیں۔

روحنی بھی اس نقطے کو سمجھ گئی تھی۔ شاید روحنی کو اپنی غلطی کا احساس بھی ہو گیا تھا کہ اسے مجھے ساتھ لے کر وہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔



اس نے ڈُرگا کی بدروح سے مخاطب ہو کر وضاحت کرنے کے انداز میں کہا۔

”ڈُرگا! تم دیکھ رہی ہو جو انسان میرے ساتھ آیا ہے وہ شہزادہ شیروان ہے۔“

ڈرگا بدروح ایک لمحے کے لئے خاموش رہی۔ پھر اس کی آواز آئی۔ ”یہ تمہارا شہزادہ شیروان نہیں ہے۔ یہ تم بھی اچھی طرح سے جانتی ہو۔ یہ اس کا ہم شکل ایک اجنبی انسان ہے۔“

روحنی نے کہا۔ ”ڈرگا! میں مانتی ہوں کہ یہ میرے مرے ہوئے خاوند کا ہم شکل ہے مگر اس نے میری آتما کو پجاری رگھو کی قید سے رہائی دلا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے اسے میری مدد کرنے کی یہ سزا مل رہی ہے کہ پجاری رگھو اس کی جان کا دشمن بن گیا ہے اور مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ہلاک کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میرا فرض بن گیا ہے کہ میں اس کی جان کی حفاظت کروں اور اسے پجاری رگھو کے انتقام سے بچاؤں۔“

ڈُرگا کی بدروح نے پہلے تو کوئی جواب نہ دیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ وہاں سے جا چکی ہے لیکن روحنی کو درگا کی بدروح کی موجودگی کا احساس تھا۔ وہ خاموش کھڑی ڈُرگا کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔ جب ڈُرگا کی خاموشی طول پکڑ گئی تو روحنی نے کہا۔

”ڈُرگا! میری پیاری بہن! مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں موجود ہو۔ میں تمہیں دیکھ رہی ہوں۔ تم خاموش کیوں ہو؟“

ڈُرگا بدروح کی خشک آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ”روحنی! تم کیا کہنا چاہتی ہو؟“

روحنی نے کہا۔ ”ڈُرگا! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ گئی ہے۔ کیا تم میری مدد کرو گی؟“

ایک بار پھر تہہ خانے میں خاموشی چھا گئی۔ ڈُرگا بدروح کی آواز آئی۔ ”کس قسم کی مدد چاہتی ہو؟“

روہنی نے کہا۔ ''یہ بات تم سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ جب سے میں اس کی قید سے آزاد ہوئی ہوں پجاری رگھو مجھے دوبارہ اپنے قبضے میں کرنے کے لئے کئی خطرناک کوششیں کر چکا ہے۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ اگر اس بار میں اس کے قبضے میں چلی گئی تو میری کبھی مکتی نہیں ہو گی اور میں قیامت تک اس کی قید میں بے بس ہو کر پڑی رہوں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ مجھے آزاد کرنے کی وجہ سے پجاری رگھو میرے ساتھی شیروان کا بھی دشمن بن گیا ہے اور وہ اس پر چار مرتبہ قاتلانہ حملے کر چکا ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ نہ ہوتی تو یہ آج زندہ نہ ہوتا مگر میں اسے زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔''

درگاہ کی بدروح نے روہنی کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''روہنی! تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

روہنی نے بھی بات کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ''پجاری رگھو کے آگ میں جل کر ختم ہو جانے میں ہی میری مکتی ہے۔ میری نجات ہے۔ لیکن میں اُس کی طلسمی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ہاں! اگر مجھے اُس کی کسی کمزوری کا پتہ چل جائے تو پھر میں اُس کو آسانی سے ختم کر سکتی ہوں۔ تم پجاری رگھو کو اس کی اور اپنی زندگی کے دوران بھی جانتی تھی اور موت کے بعد تمہیں اس کے بارے میں زیادہ پتہ چل گیا ہو گا۔ کیا تم مجھے اس کی کوئی کمزوری بتا سکتی ہو؟ میں یہی معلوم کرنے تمہارے پاس آئی ہوں۔''

درگا بدروح نے حسب معمول کچھ دیر تک خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ''پجاری رگھو کی طاقت کا راز موت کے دیوتا یم دُوت کی وہ مورتی ہے جو اس نے پجاری رگھو کو خوش ہو کر دی تھی۔ اس مورتی پر یم دُوت کا منتر لکھا ہوا ہے۔ اگر کسی ذریعے سے وہ مورتی تمہارے پاس آ جاتی ہے تو تم پجاری رگھو پر اپنی کم طلسمی طاقت سے بھی فتح حاصل کر لو گی۔''



یم دُوت کی یہ مورتی پجاری رگھو نے کہاں رکھی ہوئی ہے؟ کیا تم بتا سکتی ہو؟''

روہنی کے اس سوال کے جواب میں دُرگا بدروح بولی۔ ''اس کا کسی کو علم نہیں ہے۔ یہ تمہیں خود معلوم کرنا ہو گا۔ میرا وقت ختم ہو گیا ہے۔ اب میں جاتی ہوں۔''

روہنی نے جلدی سے کہا۔ ''مجھے ایک آخری بات بتا دو دُرگا۔''

''بولو۔ میں سن رہی ہوں۔'' دُرگا بدروح نے کہا۔

روہنی کہنے لگی۔ ''تمہیں معلوم ہی ہے کہ میں بدروحوں کی اس دنیا میں داخل نہیں ہو سکتی جس کا سردار پجاری رگھو ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ پجاری رگھو اپنی بدروحوں کی دنیا سے نکل کر کب انسانوں کی دنیا میں آتا ہے اور اپنا ٹھکانہ کہاں بناتا ہے؟''

درگا بدروح نے جواب دیا۔ ''میں اتنا جانتی ہوں کہ پجاری رگھو کی بدروح مہینے میں ایک بار اُس شمشان گھاٹ کی یاترا کرنے ضرور جاتی ہے جہاں مرنے کے بعد اس کے مردہ جسم کو چتا کی آگ میں جلایا گیا تھا۔ یہ وہ دن ہوتا ہے جس کی رات کو پجاری رگھو کے مردے کو چتا کی آگ میں جلایا گیا تھا۔''

روہنی نے جلدی سے پوچھا۔ ''اب مجھے یہ بھی بتاتی جاؤ کہ یہ شمشان گھاٹ کس شہر میں ہے۔''

دُرگا بدروح نے کہا۔ ''پجاری رگھو کے مردے کو آج سے تین سو سال پہلے جلایا گیا تھا۔ اُس زمانے میں مندروں کی نگری متھرا نگری بھی ایک چھوٹا سا گاؤں ہوا کرتی تھی۔ متھرا نگری کے پورب میں ایک شمشان گھاٹ ہوا کرتا تھا۔ پجاری رگھو کو اسی شمشان گھاٹ میں اگنی دیوی کے شعلوں کے سپرد کیا گیا تھا۔ آج یہ شمشان گھاٹ کھنڈر بن چکا ہے اور وہاں کوئی مردہ نہیں جلایا جاتا۔ پجاری رگھو ہر مہینے کی سولہویں تاریخ کو وہاں آتا ہے اور تین راتیں شمشان گھاٹ کے سولہ پھیرے لگاتا ہے۔ اس ویران شمشان گھاٹ سے کچھ دور جنگل میں ایک اندھا کنواں ہے۔ پجاری رگھو کی

بدروح اس کنویں کو اپنا ٹھکانا بناتی ہے۔"

روہنی نے درگا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "درگا! بس مجھے تم سے یہی کچھ پوچھنا تھا۔ اب میں بھی جاتی ہوں۔"

درگا بدروح کی آواز آئی۔ "روہنی! ایک بات سے ہوشیار رہنا۔ بدروحوں کے دوسرے قبیلے کی سردارنی کالی بدروح پجاری رگھو کی منہ بولی بہن ہے اور پجاری رگھو کی بدروح جب شمشان گھاٹ کی یاترا کرنے انسانوں کی دنیا میں آتی ہے تو کالی کے راکھشش اس کی حفاظت کے لئے اس کے ساتھ آتے ہیں۔"

"میں ان سے ہوشیار رہوں گی۔ تمہارا شکریہ دُرگا!"

دُرگا بدروح کی اچانک غصیلی آواز بلند ہوئی۔ "اب اس منش جاتی (انسان) کو لے کر یہاں سے نکل جاؤ۔"

روہنی نے میرا بازو پکڑا اور ہم جلدی سے زینہ طے کرتے تہہ خانے سے نکل آئے۔ محل کے اوپر والے کمرے میں آنے کے بعد روہنی کہنے لگی۔ "دُرگا کو تمہارا میرے ساتھ وہاں آنا برا لگا تھا کیونکہ بدروحیں ویسے بھی زندہ انسانوں کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ تم مسلمان بھی ہو۔"

میں نے کہا۔ "مگر تم بھی تو مسلمان ہو چکی ہو۔ پھر دُرگا کی بدروح نے تمہیں کیسے گوارا کر لیا؟"

روہنی کہنے لگی۔ "مسلمان ہونے سے پہلے بچپن سے جوانی اور شادی کے وقت تک کا عرصہ جب میں ہندو تھی ہم دونوں نے ایک ساتھ گزارا تھا۔ بس دُرگا اسی دوستی کا لحاظ رکھے ہوئے تھی اور اسی کی پالنا کر رہی تھی۔"

رات ڈھلنے لگی تھی۔ جے پور کے اس ویران محل میں اب ہمارا کوئی کام نہیں تھا۔ ہم محل کے صدر دروازے سے باہر نکلے تو پہرے پر موجود چوکیداروں میں سے ہمیں کوئی بھی نہ دیکھ سکا کیونکہ ہم غیبی حالت میں تھے۔ صبح کے انتظار میں ہم ایک



جھیل کنارے بارہ دری میں آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ "میں نہانا چاہتا ہوں۔ مجھے غیبی حالت سے انسانی شکل میں واپس لے آؤ۔"

روہنی نے خاص منتر پڑھ کر پھونکا اور میں اپنی ظاہری انسانی شکل صورت میں واپس آ گیا۔ روہنی نے کہا۔ "تم جھیل میں اتر کر نہا لو۔ میں یہیں بیٹھی ہوں۔"

جھیل کنارے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ میرے پاس وہاں تولیہ صابن تو تھا نہیں ویسے ہی جسم کو اچھی طرح سے مل کر غسل کیا اور کپڑے پہن کر بارہ دری میں آ گیا۔

روہنی کہنے لگی۔ "آج کارتک کے مہینے کی چودہ تاریخ ہے۔ دو دن بعد رات کو پجاری رگھو کی بدروح متھرا کے شمشان گھاٹ پر آئے گی۔ ہمیں آج ہی وہاں پہنچ جانا چاہئے۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اعتراض ہوتا بھی تو میرے اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ بدروحوں کے آسیب کے جس چکر میں پھنس گیا تھا اب اسے ہر حالت میں مجھے پورا کرنا ہی تھا۔ میں نے کہا۔ "جیسے تمہاری مرضی۔"

روہنی بولی۔ "ہم آج اور کل کا دن متھرا شہر میں گزاریں گے۔ ہم وہ اندھا کنواں بھی دیکھیں گے جس میں پجاری رگھو کی بدروح اپنا ٹھکانا بنائے گی۔"

میں نے روہنی سے کہا۔ "میں بار بار غیب ہونے سے تنگ آ چکا ہوں کیوں نہ ہم عام انسانوں کی طرح اس بار ریل گاڑی میں سفر کریں۔"

روہنی کہنے لگی۔ "تمہیں تنگ نہیں آنا چاہئے۔ ابھی تو ہماری خطرناک مہم شروع ہی ہوئی ہے۔ ابھی تو ہمیں نہ جانے کیا کیا کچھ کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ میں جانتا ہوں اور اس کے لئے میں نے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے لیکن اس وقت میرا دل ٹرین میں عام لوگوں کے ساتھ سفر کرنے کو چاہ رہا ہے۔"

روہنی بولی۔ "ٹھیک ہے۔ اگر یہ تمہاری خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

یہیں سے ہم ریلوے سٹیشن پر چلتے ہیں۔" جے پور کے قدیم محلات والے علاقے سے نکل کر ہم ریلوے سٹیشن پر آ گئے۔ اس وقت روہنی بھی عام انسانی شکل صورت میں تھی۔ میں بھی اپنی انسانی شکل میں تھا۔ روہنی اس بار جب غیبی حالت سے زندہ عورت کے روپ میں ظاہر ہوئی تھی تو اس نے کاسنی رنگ کی ریشمی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے شلوار قمیض کیوں تبدیل کر لی؟"

اس نے کہا۔ "ہم مندروں کے شہر متھرا جا رہے ہیں۔ شلوار قمیض کو یہاں مسلمانوں کا لباس سمجھا جاتا ہے اس لئے میں نے ہندو عورتوں کی طرح ساڑھی پہن لی ہے۔"

معلوم ہوا ہے کہ ایک گھنٹے بعد بھوپال سے ایک ٹرین آ رہی ہے جو متھرا سے ہوتی ہوئی دلی جائے گی۔ میں نے روہنی سے کہا۔ "مجھے کچھ پیسے دو۔ میں ٹرین کے دو ٹکٹ لے آؤں۔" روہنی نے اپنی مٹھی کھول کر کہا۔ "ٹکٹ کا میں نے انتظام کر لیا ہوا ہے۔"

روہنی کی ہتھیلی پر ٹرین کے دو ٹکٹ تھے۔ میں نے ٹکٹ لے کر انہیں غور سے دیکھا۔ یہ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ کے ٹکٹ تھے اور ان پر اس روز کی تاریخ پڑی ہوئی تھی۔ مجھے کوئی تعجب نہ ہوا۔ مجھے معلوم تھا کہ روہنی بدروح ایسا کر سکتی ہے۔ میں نے ایک ٹکٹ روہنی کو دے دیا اور ایک ٹکٹ اپنے پاس رکھ لیا اور ہم پلیٹ فارم پر ایک طرف بیٹھ کر متھرا جانے والی ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ دن کا وقت تھا جے پور کے سٹیشن پر مسافروں کی کافی ریل پیل تھی۔ ہم خاموش بیٹھے مسافروں کو آتے جاتے دیکھ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ٹرین آ گئی۔ فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ میں ایک ادھیڑ عمر یورپین جوڑا پہلے سے بیٹھا تھا۔ میں اور روہنی بھی آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹرین چل پڑی۔

O



ٹرین جے پور کے سٹیشن سے نکلی تو سامنے بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر یورپی جوڑے نے بڑی تھرمس میں سے چائے نکالی اور آدمی نے انگریزی میں ہم سے پوچھا۔ "کیا آپ چائے پئیں گے؟"

روہنی نے مسکراتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا۔ "جی نہیں شکریہ۔"

یہاں میں یہ بتا دوں کہ بدروحیں دنیا کی ہر زبان بول اور سمجھ لیتی ہیں۔ روہنی جس زمانے میں زندہ تھی اور ریاست کی ملکہ تھی اس زمانے میں ابھی ہندوستان میں انگریز نہیں آئے تھے مگر روہنی انگریزی زبان سمجھ اور بول لیتی تھی۔ انگریز مرد کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ اتنی ہی عمر اس کی انگریز بیوی کی ہو گی۔ انگریز مرد نے کہا۔ "آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟ ہمیں تو دلی جانا ہے۔"

روہنی نے کہا۔ "ہم متھرا تک جا رہے ہیں مندروں کی یاترا کرنے۔"

انگریز مرد نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ایڈم سمتھ ہے۔ میں دلی میں ہیرے جواہرات کا بزنس کرتا ہوں۔ یہ میری بیوی ایلس ہے۔ ہم دلی جا رہے ہیں۔"

ایلس ہماری طرف مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے چہروں پر بڑی معصومیت تھی۔ ٹرین راجستھان کے صحرائی ٹیلوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ میل ٹرین تھی۔ اس نے ایک سٹیشن چھوڑ دیا اور آگے نکل گئی۔ دوسرا سٹیشن آیا تو ٹرین رک گئی۔ وہاں سے دو دیہاتی ہمارے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ یہ دونوں دیہاتی ہٹے کٹے تھے

اور ان میں سے ایک کی جودھپوری سٹائل کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں سرخی مائل رنگت کی تھیں اور ایک دیہاتی نے چمڑے کا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ ہم نے اس کی طرف حیران ہو کر دیکھا کیونکہ وہ فرسٹ کلاس کے مسافر لگتے نہیں تھے۔ انگریز مرد نے ہندوستانی زبان میں اُن سے کہا۔ ”بابا لوگ! یہ فرسٹ کلاس کا ڈبہ ہے۔“

مونچھوں والے دیہاتی نے ذرا غصے سے جواب دیا۔ ”ہمارے پاس فرسٹ کلاس کے ٹکٹ ہیں۔“

اس کے بعد کسی نے اُن سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا کہ اُن کے پاس فرسٹ کلاس کے ہی ٹکٹ ہوں۔ ٹرین سٹیشن سے روانہ ہو گئی۔ جب ٹرین ویران علاقے میں پہنچی تو ان پراسرار دیہاتیوں میں سے ایک باتھ روم میں گھس گیا۔ تھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوسرا دیہاتی بھی اٹھ کر باتھ روم کے پاس کھڑا ہو گیا جیسے اپنے ساتھی کے باہر نکلنے کا انتظار کر رہا ہو۔

اتنے میں باتھ روم میں سے پہلے والا دیہاتی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں باہر نکلا تو اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ باہر نکلتے ہی اس نے پستول کا رخ ہماری طرف کر دیا اور گرج دار آواز میں کہا۔ ”خبردار! اگر کسی نے گاڑی کی زنجیر کھینچنے کی کوشش کی تو اسے وہیں ڈھیر کر دوں گا۔“

اس دوران دوسرے دیہاتی نے بھی اپنی صدری کے اندر سے پستول نکال لی تھی۔ انگریز مرد اور عورت پہلے تو گھبرا گئے۔ پھر انگریز مرد نے ہندوستانی میں کہا۔ ”بابا لوگ! ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“

مونچھوں والے دیہاتی نے کہا۔ ”ابھی پتہ چل جائے گا کس کے پاس کیا ہے۔“

اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ ”ان سب کی تلاشی لو۔“

یہ دونوں ڈاکو تھے۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔ میں نے روہنی کی طرف دیکھا۔ روہنی نے مجھے آنکھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ان ڈاکوؤں کو ان کی موت اس



ڈبے میں لے آئی تھی۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ ایک ایسے کمپارٹمنٹ میں ڈاکہ ڈالنے آگئے ہیں جہاں ایک انتہائی خطرناک بدروح پہلے سے بیٹھی ہوئی ہے۔

ایک ڈاکو انگریز جوڑے کے سامان کو جلدی جلدی کھول کر دیکھنے لگا۔ انگریز عورت کے اٹیچی کیس میں سے جواہرات کا ایک قیمتی ہار نکل آیا۔ اسے دیکھ کر دونوں ڈاکوؤں کی آنکھیں کھل گئیں۔ مونچھوں والے ڈاکو نے اب ہماری طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ”تم بھی نکالو جو کچھ تمہارے پاس ہے۔“

روہنی نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔ ”ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“

ایک ڈاکو نے ہنس کر دوسرے سے کہا۔ ”بھیکو! یہ تو گن سندری ہے۔ اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو چلو اسی کو اٹھا کر ساتھ لئے چلتے ہیں۔“

دوسرے ڈاکو بھیکو نے کہا۔ ”ارے اس کی تلاشی تو لو۔ اس نے بھی اپنی انگیا میں ہیرے جواہرات نہ چھپا رکھے ہوں۔“

پہلا ڈاکو فوراً روہنی کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس نے روہنی کے بلاؤز پر ہاتھ ڈالا روہنی نے اسے پیچھے دھکیل دیا اور کہا۔ ”خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا۔ خاموشی سے انگریز عورت کا ہار اسے واپس کر دو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔“

ڈاکو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ بولا۔ ”بھیکو رے بھیکو! یہ کیا کہتی ہے؟“

دوسرے ڈاکو بھیکو نے کہا۔ ”یہ کہتی ہے مجھے اسی طرح اٹھا کر اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تم سے بیاہ کروں گی۔“

دونوں ڈاکو ایک بار پھر قہقہے لگا کر ہنسے۔ تب میں نے غصہ کھا کر کہا۔ ”تم جانتے نہیں کہ ہم کون ہیں۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ انگریز عورت کا ہار اسے واپس کر دو اور ڈبے سے باہر چھلانگیں لگا دو۔“

لیکن اس قسم کی باتوں کا ان عادی جرائم پیشہ ڈاکوؤں پر اثر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بوڑھا انگریز جوڑا ہماری طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور یہی سوچ رہا ہو گا

کہ ہمیں ڈاکو ضرور مار ڈالیں گے۔ مگر ان بے چاروں کو کیا خبر تھی کہ خود ڈاکوؤں کو موت گھیر کر وہاں لے آئی ہے۔ میں نے روہنی کے چہرے پر بڑے خونخوار قسم کے تاثرات کو ابھرتے دیکھ لیا تھا۔ کم از کم مجھے روہنی کی آنکھوں میں بدروحوں والی ہیبت نظر آگئی تھی۔

جیسے ہی ایک ڈاکو روہنی کو پکڑنے کے لئے اس کی طرف بڑھا روہنی ایک دم اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور فوراً غائب ہو گئی۔ ڈاکو اور انگریز میاں بیوی حیرت زدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے مگر میں روہنی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ وہیں میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے منتر پڑھ کر مجھ پر پھونکا اور پھر میں بھی غائب ہو گیا۔ اب ہم انگریز میاں بیوی اور ڈاکوؤں کو دیکھ رہے تھے مگر وہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ڈاکوؤں پر ہم دونوں کے غائب ہونے سے دہشت طاری ہو گئی۔ دونوں ڈاکو ہندو تھے۔ دونوں ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگے۔ ”کالی میا! ہمیں شما کر دے۔ کالی میا ہمیں شما کر دے۔“

مگر اُن کی موت کا وقت آن پہنچا تھا۔ میں نے روہنی کی آنکھوں میں اس کے بلاؤز پر ڈاکو کے ہاتھ ڈالنے کے بعد جو بھیانک شعلے اٹھتے دیکھ لئے تھے انہیں ان دونوں ڈاکوؤں کی موت ہی بجھا سکتی تھی۔

روہنی نے ڈاکو سے کہا۔ ”عورت کا ہار اسے واپس کر دو۔“

مونچھوں والا ڈاکو بھی تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دونوں ڈاکوؤں نے کہا۔ ”ابھی دیتا ہوں کالی میا!“

اور اس نے صدری میں سے قیمتی جواہرات کا ہار نکال کر انگریز عورت کے حوالے کر دیا اور ہاتھ باندھ کر بولا۔ ”شما کر دو کالی میا! شما کر دو۔“

مگر معافی کا وقت گزر چکا تھا۔ ایک بجلی سی چمکی۔ روہنی کا ایک ہاتھ اوپر کو اٹھا اور دونوں ڈاکوؤں کی گردنیں کٹ گئیں اور ان کے سر کمپارٹمنٹ کے فرش پر گر پڑے۔ دھڑ دوسری طرف گر پڑے اور خون کے چھینٹے ڈبے کی دیواروں اور سیٹوں پر پڑنے



لگے۔ انگریز مرد اور عورت دونوں ڈرے ہوئے بیٹھے تھے۔ روہنی نے ان کی طرف متوجہ ہو کر انگریزی میں کہا۔ ”پولیس تم لوگوں سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کرے گی۔ کیونکہ اس ڈبے میں کچھ نہیں ہوا۔ میں دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں غائب کر رہی ہوں۔“

روہنی نے اپنے ہاتھ کا اشارہ فرش پر پڑے ڈاکوؤں کے خون آلود سروں اور دھڑوں کی طرف کیا اور دوسرے لمحے وہاں کچھ نہیں تھا۔ دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں اور دیواروں اور فرش پر گرا ہوا ان کا خون غائب ہو گیا تھا۔ روہنی نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم چلتی ٹرین کی کھلی کھڑکی میں سے باہر نکل گئے۔ باہر نکلتے ہی ہم ہوا میں اڑنے لگے۔

روہنی نے مجھے کہا۔ ”میں اسی لئے انسانوں کے درمیان کبھی نہیں گئی اور نہ جانا چاہتی ہوں۔ آج کا انسان دوسرے انسان کے ساتھ ظلم کرتا ہے، قتل کرتا ہے، دوسرے انسان کی محنت کی کمائی لوٹتا ہے، دوسروں کی کمائی پر ڈاکے ڈالتا ہے۔ دوسروں کی ماں، بہن کی عزتوں سے کھیلتا ہے۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا..... اسی لئے میں انسانوں سے دور رہتی ہوں اور کبھی ایک شہر سے دوسرے شہر جانا ہوتا ہے تو ان کے شہروں کے اوپر سے ہو کر گزر جاتی ہوں۔“

میں نے سوچا کہ روہنی اگرچہ ایک بدروح ہے مگر اس کی بات میں کس قدر سچائی ہے۔ ہم اس طرف پرواز کر رہے تھے جس طرف ٹرین جا رہی تھی۔ چلتی ٹرین کی کھڑکی سے باہر نکلتے ہی روہنی نے غیبی حالت میں اتنی تیزی سے پرواز شروع کر دی تھی کہ ٹرین ہمارے پیچھے مجھے ایک سیاہ دھبے کی طرح دکھائی دی اور دوسرے لمحے یہ سیاہ دھبہ بھی غائب ہو گیا۔

جے پور سے دلی کی طرف جائیں تو راستے میں پہلے آگرہ کا بڑا اسٹیشن آتا ہے۔ اس کے بعد متھرا آ جاتا ہے۔ ہم چند منٹ کے بعد آگرہ شہر کے اُوپر سے گزر رہے تھے۔

مجھے ایک جانب دریا کے کنارے تاج محل کی عالی شان عمارت دکھائی دی۔ ہم آگرہ شہر کے اوپر سے بھی نکل گئے۔ کچھ دیر تک نیچے جنگل اور کھیت دکھائی دیتے رہے جو بڑی تیز رفتاری سے پیچھے کی طرف جا رہے تھے۔ اس کے بعد شہر کے مکان اور مندر نظر آنے لگے۔ روہنی نے کہا۔ ''ہم متھرا پہنچ گئے ہیں۔''

روہنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ وہ نیچے کی طرف غوطہ لگا گئی۔ اس نے متھرا شہر کے اوپر چاروں طرف دائرے کی شکل میں ایک چکر لگایا اور پھر شہر کی پورب کی جانب درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس اُتر گئی۔ ہمیں لوگوں کی نظروں سے چھپنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہم کسی کو نظر نہیں آتے تھے۔ روہنی آس پاس نظر دوڑاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''پرانا شمشان گھاٹ یہیں کہیں ہونا چاہئے۔''

یہ شہر کے باہر کا علاقہ تھا اور ابھی اس طرف نئی کالونیاں آباد نہیں ہوئی تھیں۔ سامنے کھیت تھے۔ اُن کے پار درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ روہنی نے اس طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چلو وہاں چل کر دیکھتے ہیں۔''

ہم زمین سے پانچ سات فٹ بلند ہو کر ہوا میں تیرتے ہوئے کھیتوں کے پار آ گئے۔ یہاں پہنچ کر روہنی نے اپنی رفتار بالکل آہستہ کر دی۔ اب ہم زمین سے سات فٹ کی بلندی پر ایسے تیر رہے تھے جیسے انسان خواب میں کبھی کبھی اپنے آپ کو اڑتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اچانک روہنی میرا ہاتھ تھامے فضا میں ہی ساکت ہو گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ فاصلے پر دکھائی دینے والے درختوں کے جھنڈ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''شیروان! مجھے ان درختوں کی طرف سے جلے ہوئے مُردوں کی بو آ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے وہاں کوئی نیا شمشان گھاٹ ہو جہاں کوئی مُردہ جلایا جا رہا ہو۔''

روہنی بولی۔ ''نہیں، یہ تازہ جلنے والے مردوں کی بو نہیں ہے۔ یہ ان مردوں



کی بو ہے جنہیں آج سے تین سو برس پہلے جلایا گیا تھا۔''

میں بالکل حیران نہ ہوا۔ میں نے روہنی کی اتنی عقل کو حیران کر دینے والی باتیں دیکھی تھیں کہ اب مجھے کسی بات پر حیرت نہیں ہوتی تھی۔ ہاں کبھی کبھی خوف ضرور آنے لگتا تھا۔ کیونکہ روہنی بدروح اگرچہ بری بدروح نہیں تھی لیکن اب اس کے ہاتھوں اوپر تلے دو تین بڑی خوفناک وارداتیں سرزد ہو چکی تھیں جو ایک سے بڑھ کر ایک دہشت طاری کر دینے والی تھیں۔ میں نے یونہی کہہ دیا۔ ''کیا تمہیں آج سے تین سو سال پرانے جلے ہوئے مُردوں کی بو آ جاتی ہے؟''

روہنی نے کہا۔ ''مجھے اُن انسانوں کے جلنے کی بھی بو آ جاتی ہے جنہیں آج سے ہزاروں برس پہلے کسی وجہ سے زندہ جلا دیا گیا تھا۔''

اس کے بعد میں نے روہنی سے کوئی سوال نہ کیا۔ روہنی کئی بار مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر چکی تھی۔ مجھے بھی اب اس سے تھوڑی تھوڑی محبت ہونے لگی تھی۔ لیکن اب مجھے اس سے تھوڑا تھوڑا ڈر بھی آنے لگا تھا۔

ہم کھیتوں کے پار درختوں کے جھنڈ کے پاس آ کر زمین پر اتر گئے۔ یہاں چاروں طرف ویرانی برس رہی تھی۔ کہیں زمین پر مٹی کی چھوٹی ڈھیریاں تھیں، کہیں خشک گھاس تھی، کہیں جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ ایک طرف کیکر کے کچھ درخت اپنی سیاہ ٹہنیاں پھیلائے اس طرح زمین کی طرف جھکے ہوئے تھے جیسے کسی شے کو اپنے پنجوں کی گرفت میں پکڑنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ روہنی میرے پاس ہی کھڑی اُن درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ''ان درختوں کی طرف چلو۔''

ہم چلتے ہوئے کیکر کے بدشکل درختوں کے پاس آ گئے۔ یہاں ایک ٹوٹا پھوٹا چبوترا دکھائی دیا جس کی ایک جانب سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔ روہنی چبوترے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی اور بولی۔ ''اس چبوترے سے مجھے سینکڑوں برس پہلے جلے ہوئے مُردوں کی بو آ رہی ہے۔ یہی وہ شمشان گھاٹ ہے جہاں آج سے تین سو سال

پہلے ہمارے دشمن پجاری رگھو کی لاش کو چتا پر جلایا گیا تھا اور وہ پرسوں رات اسی جگہ کی یاترا کرنے آ رہا ہے۔"

میں اس منحوس چبوترے کی طرف دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ جانے یہ شمشان گھاٹ میری زندگی میں اب کیا نیا گل کھلانے والا ہے۔ روہنی نے ایک طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "شیروان! میرے ساتھ آ جاؤ۔ وہ اندھا کنواں بھی یہاں قریب ہی ہو گا جہاں پجاری رگھو کی بدروح تین راتیں، تین دن ڈیرہ جمائے گی۔"

یہ اندھا کنواں شمشان کے چبوترے کے پیچھے کچھ فاصلے پر تھا۔ مجھے تو یہ اندھا کنواں بالکل نظر نہ آیا۔ لیکن روہنی کی تیز نگاہوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ ایک جگہ اونچے اونچے سرکنڈوں نے کچھ جگہ گھیر رکھی تھی۔

اندھا کنواں ان سرکنڈوں کے درمیان میں تھا۔ کنواں واقعی اندھا تھا۔ اس میں کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ نیچے تہہ تک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ کسی کسی وقت کنوئیں کے اندر سے باریک سی سیٹی کی آواز آ جاتی تھی۔

روہنی نے کہا۔ "یہ سانپ کی آواز ہے۔"

میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ میں دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ روہنی کہیں مجھے لے کر کنوئیں میں نہ اُتر جائے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ روہنی کہنے لگی۔ "ابھی رگھو کی بدروح یہاں نہیں پہنچی۔ ہمیں کنوئیں میں اُتر کر اس کا جائزہ لینا ہو گا۔"

میں نے روہنی کو صاف کہہ دیا کہ میں اس آسیب زدہ کنوئیں میں اس کے ساتھ نہیں جاؤں گا جہاں ایک سانپ بھی رہتا ہے۔ روہنی نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں پھر تم کیوں ڈرتے ہو؟ کیا پہلے کبھی تمہیں کچھ ہوا ہے جو اب ہو گا۔ اور پھر ہم تو غائب ہیں۔ ہمیں کوئی چیز کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔"

میں جانتا تھا کہ مجھے روہنی کے ساتھ کنوئیں میں اُترنا ہی پڑے گا۔ میں خاموش



ہو گیا۔ روہنی مجھے ساتھ لے کر اندھے کنوئیں میں اُتر گئی۔ ہم اس طرح کنوئیں میں نہیں اتر رہے تھے جس طرح آدمی رسی کی مدد سے کسی کنوئیں میں اترتا ہے۔ ہم کنوئیں کے بالکل درمیان میں سے ہو کر اس طرح نیچے جا رہے تھے جس طرح رُوئی کا ہلکا پھلکا گالا آہستہ آہستہ نیچے جا رہا ہو۔

کنوئیں میں جیسے جیسے ہم نیچے اُتر رہے تھے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس اندھیرے میں صرف ہم غیبی حالت میں ہی تھوڑا بہت دیکھ سکتے تھے۔ کنواں اتنا گہرا تھا کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے ہم کسی بڑے قطر والے پائپ کے اندر اُتر رہے ہیں۔ سانپ کی آواز آنا بند ہو گئی تھی۔ اس قسم کے موقعوں پر مجھے روہنی نے بات کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ اس لئے میں اس سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہم کنوئیں میں اتر رہے ہیں یا زمین کے اندر جا رہے ہیں۔ میں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ پہلے کنوئیں کے دہانے پر روشنی کا دائرہ دکھائی دیتا تھا مگر اب وہ اتنا دُھندلا ہو گیا تھا کہ ہمیں بھی بڑی مشکل سے نظر آتا تھا جن کی نگاہیں غائب ہو جانے کے بعد تیز ہو جاتی تھیں۔

روہنی نے میرا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اچانک ایک جگہ پہنچنے پر ایسی آواز آنے لگی جیسے دور کسی بند کوٹھڑی میں کوئی بچہ رو رہا ہو۔ میں ڈر کر روہنی کے ساتھ لگ گیا۔ یہ آواز غائب ہوئی تو ایک دم سے دس بارہ سانپوں کی دل ہلا دینے والی پھنکاریں سنائی دینے لگیں۔ مجھے کنوئیں کی گول زنگ آلود دیوار پر کئی سانپ اِدھر اُدھر رینگتے نظر آئے۔

میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

روہنی نے آہستہ سے سرگوشی میں کہا۔ "ڈرو مت۔ یہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

ہم تھوڑا اور نیچے گئے تو سانپوں کی آوازیں خاموش ہو گئیں اور اس کے ساتھ ہی میرے قدم کنوئیں کی تہہ سے لگ گئے۔ کنوئیں کی تہہ لجلجی تھی۔ مجھے ایسے

محسوس ہوا جیسے میں نے کسی بہت بڑی چھپکلی کے اوپر پاؤں رکھ دیئے ہوں۔ میں اتنا کبھی نہیں ڈرتا تھا جتنا خوف مجھے اُس وقت محسوس ہوا۔ اندھیرے میں ہمیں کنوئیں کی گول دیوار دھندلی اور سرمئی رنگ کی نظر آرہی تھی۔ میں نے تہہ کی طرف دیکھا۔ یہ دیکھ کر میری جان ہوا ہو گئی کہ کنوئیں کی تہہ جہاں ہم کھڑے تھے دلدل کی طرح اوپر نیچے ہونے لگی تھی۔ میں نے روہنی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اُس کا بازو پکڑ لیا۔

اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کس قدر خوف محسوس کر رہا ہوں۔ اس نے سرگوشی میں مجھے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہو گیا ہے تمہیں شیروان؟“ میں نے لرزتی ہوئی سرگوشی میں کہا۔ ”مجھے کنوئیں کی تہہ نیچے کھینچ رہی ہے۔“

روہنی نے کہا۔ ”یہ تمہارا وہم ہے۔ اپنا دل مضبوط رکھو۔“

میں نے دل میں کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کے فوراً بعد جیسے کنوئیں کی تہہ ساکت ہو گئی اور میرا ڈر خوف دور ہو گیا۔ روہنی جھک کر کنوئیں کی دیوار کی زنگ آلود اکھڑی ہوئی اینٹوں کے درمیان پڑے ہوئے چھوٹے بڑے شگافوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ یہ اندھا کنوئیں واقعی چڑیلوں کا مسکن لگتا تھا۔ ایک تو یہ تین سو سال پرانا تھا۔ دوسرے اس کی دیواروں میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور جگہ جگہ جنگلی بیلیں اگی ہوئی تھیں۔

دیوار کے ایک شگاف کے پاس روہنی کچھ زیادہ دیر تک رکی رہی۔ وہ اُس اندھے کنوئیں میں جو بھی سراغ رسانی کر رہی تھی مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے اِردگرد یہ دیکھ رہا تھا کہ کوئی سانپ تو میری طرف نہیں بڑھ رہا۔ یہ کنواں دس پندرہ فٹ گولائی میں تھا اور کئی جگہوں پر گلے سڑے کوڑے کرکٹ کی ڈھیریاں پڑی ہوئی تھیں۔ کنوئیں کی تہہ جہاں ہم کھڑے تھے بے حد تاریک تھی اور مجھے بھی چیزیں بڑے غور سے دیکھنے کے بعد دکھائی دے رہی تھیں حالانکہ غیبی حالت میں مجھے گہری سے گہری تاریکی میں بھی چیزیں صاف نظر آجاتی تھیں۔ روہنی



ابھی تک گول دیوار کے شگاف سے باہر نکلی ہوئی اینٹوں کو بڑے غور سے جھک کر دیکھ رہی تھی۔ پھر اُس نے ایک نوکیلی اینٹ پر آہستہ سے ہاتھ پھیرا تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا جیسے اسے کسی جگہ سے بجلی کے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ ”روہنی.....“

روہنی نے فوراً میرے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو وہ شگاف کی نوکیلی اینٹ پر پھیر رہی تھی۔ اُس ہاتھ میں سے جلے ہوئے انسانی گوشت کی بو آرہی تھی۔ میں روہنی سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر پوچھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ہاتھ کو کسی چیز کا جھٹکا لگنے کے بعد روہنی بھی ڈر گئی ہے۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ہم کنوئیں میں اوپر کو اٹھنے لگے۔

کنوئیں میں اترتے وقت ہماری رفتار بہت ہی ہلکی تھی لیکن کنوئیں سے باہر جاتے وقت ہماری رفتار تیز ہو گئی تھی۔ ہمیں اپنے نیچے سانپوں کی پھنکاریں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ پھنکاریں آدھے کنوئیں تک ہمارے پیچھے آئیں پھر صرف ایک سانپ کی سیٹی کی آواز رہ گئی۔ اس آواز نے کچھ اوپر تک ہمارا پیچھا کیا پھر یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ اوپر سے کنوئیں کے دہانے پر ان کی روشنی کچھ مدھم پڑ گئی تھی۔ ہم کنوئیں سے باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ باہر آسمان بادلوں سے ڈھک چکا تھا اور کالی گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ اُن کی وجہ سے دن کی روشنی مدھم پڑ گئی تھی۔

کنوئیں سے باہر نکلنے کے بعد جب روہنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تو میں نے اُس سے پوچھا۔ ”تمہیں دیوار کے شگاف میں کچھ نظر آیا تھا کیا؟“

روہنی نے آہستہ سے کہا۔ ”مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”پھر تم نے جلدی سے اپنا ہاتھ پیچھے کیوں کر لیا تھا؟“

روہنی نے کہا۔ ”تم بہت سوال پوچھنے لگے ہو۔ یہ عادت ٹھیک نہیں۔“

میں خاموش ہو گیا۔ اتنے میں بارش شروع ہو گئی۔ ہم چونکہ غائب تھے اس لئے ہم بارش میں بھیگ نہیں سکتے تھے۔ روہنی میرے ساتھ تھی اور ہم زمین سے کوئی تین فٹ بلند ہو کر جا رہے تھے مگر ہم چل نہیں رہے تھے بلکہ فضا میں تیر رہے تھے۔ عام زندگی میں تو شاید آپ کو کبھی اس کا تجربہ نہ ہوا ہو لیکن خواب میں آپ نے ضرور کبھی نہ کبھی اس طرح فضا میں تیرنے کا تجربہ کیا ہو گا۔

ہم واپس ویران شمشان گھاٹ پر آ گئے۔ روہنی نے مجھ سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو۔"

میں وہیں فضا میں رُک گیا۔ میرے اندر کوئی موٹر انجن نہیں لگا ہوا تھا کہ جس کی بریک لگا کر میں رُک جاتا تھا۔ میں جب غائب ہو جاتا تھا تو صرف اپنے ارادے سے پرواز کرنے یا فضا میں تیرنے لگ جاتا تھا اور اپنے ارادے سے ہی فضا میں رُک جاتا تھا۔ میرا ارادہ ہی میرا موٹر انجن اور اس موٹر انجن کی بریک تھی۔

میں روہنی کو دیکھ رہا تھا۔ اُس نے ویران شمشان گھاٹ کے شکستہ چبوترے کے ارد گرد دو تین چکر لگائے اور واپس میرے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ اس وقت بارش تیز ہو گئی تھی اور اُس کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ روہنی نے شمشان گھاٹ کی بائیں جانب نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے ایک کوٹھڑی نظر آ رہی ہے۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ہم کوٹھڑی کی طرف بڑھے۔ کوٹھڑی وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر تھی۔ کوٹھڑی کے درو دیوار سے لگ رہا تھا کہ یہ تین سو برس پرانی کوٹھڑی کا کھنڈر ہے۔ اس کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کا رنگ دھوپ اور بارشوں سے سیاہ پڑ چکا تھا۔ دروازہ غائب تھا اس کی جگہ ایک تنگ راستہ اندر جانے کے لئے رہ گیا تھا۔ ہم کوٹھڑی کے اندر چلے گئے۔ کوٹھڑی میں کوئی کھڑکی، کوئی روشندان نہیں تھا۔ تنگ دروازے میں سے ابر آلود دن کی جو مدھم سی روشنی اندر آ رہی تھی وہ کوٹھڑی کے اندھیرے میں جذب ہو رہی تھی اور سوائے دروازے کی چوکھٹ کے کوٹھڑی میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی



تھی۔ روہنی نے مجھے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ "آج سے تین سو سال پہلے یہاں مردے جلانے والے رہا کرتے تھے۔"

اس کے جواب میں، میں نے کچھ نہ کہا۔ میں اس آسیبی کوٹھڑی سے باہر نکل جانا چاہتا تھا مگر روہنی کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اُس پر ظاہر ہو کہ میں خوف محسوس کر رہا ہوں۔ حالانکہ پہلے میں نے کبھی اتنا خوف محسوس نہیں کیا تھا۔ پتہ نہیں اس وقت میں ایسا کیوں محسوس کرنے لگا تھا۔

روہنی کوٹھڑی کے کونے کی طرف گئی۔ اندھیرے میں مجھے وہاں کونے میں مٹی کا ایک بڑا مٹ نظر آ رہا تھا جس کے اوپر کسی نے پتھر کی سل رکھ دی تھی۔ مٹی کا یہ مٹ ایسا تھا جیسا کہ پرانے زمانے میں لوگ دیہات میں اناج رکھنے کے لئے گھروں میں استعمال کرتے تھے۔ روہنی نے مٹ کے اوپر رکھی ہوئی سل کو ایک طرف ہٹایا۔ معلوم نہیں اُس وقت اسے کیا محسوس ہوا ہو گا لیکن مجھے اپنے چہرے پر بائیں رخسار پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا۔ پھر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میری گردن پر اپنے گیلے لجلجے ہونٹ رکھ دیئے ہوں۔ میں اتنا ڈر گیا کہ چیخ مار کر کوٹھڑی سے بھاگ اٹھا۔ اور شمشان گھاٹ کے چبوترے کے پاس آ کر سہمی ہوئی آنکھوں سے کوٹھڑی کی طرف دیکھنے لگا کہ کوئی آسیبی شے تو میرے پیچھے نہیں آ رہی۔ میں نے روہنی کو فضا میں تیرتے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ بارش ہو رہی تھی۔

روہنی میرے پاس آ کر ایک لمحے کے لئے رُکی۔ اُس نے بڑی سختی سے میرا بازو پکڑا اور مجھے اپنے ساتھ اڑاتے ہوئے وہاں سے شہر کی طرف لے گئی۔ وہ بڑی تیزی سے اُڑ رہی تھی اور چند سیکنڈ میں متھرا شہر میں آ گئی۔ سامنے ایک پرانے مندر کی اونچی دیوار تھی جس کے اوپر ایک درخت جھکا ہوا تھا۔ درخت کے گرد مٹی کا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ روہنی مجھے لے کر وہاں بیٹھ گئی۔ اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "تم چیخ مار کر وہاں سے کیوں بھاگ گئے تھے؟"

میں نے کہا۔ ’’مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس لگا تھا اور پھر کسی شے نے اپنے گیلے ہونٹ میری گردن پر رکھ دیئے تھے۔

روہنی کہنے لگی۔ ’’شیروان! میں اُس وقت تک تم سے الگ نہیں ہونا چاہتی جب تک مجھے اس بات کا یقین نہیں ہو جاتا کہ تمہاری زندگی دشمن پجاری رگھو سے محفوظ ہو گئی ہے اور میری آتما کو، میری رُوح کو نجات مل گئی ہے۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ تمہیں نہ تو اپنی جان عزیز ہے اور نہ یہ چاہتے ہو کہ میری روح کو میرے دشمن رگھو سے نجات ملے۔‘‘

میں شرمندگی محسوس کرنے لگا کہ واقعی مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ روہنی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑی آزردگی اور محبت کے ساتھ کہا۔ ’’شیروان! میں نے تمہاری اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ تم میرے خاوند اور میرے محبوب شہزادے شیروان کا دوسرا جنم نہیں ہو بلکہ اس کے ہم شکل ہو۔ لیکن مجھے تو تمہارے روپ میں اپنا محبوب ہی نظر آتا ہے۔ میں تو تم سے اسی طرح محبت کرتی ہوں اور تمہاری خیر خواہ ہوں جس طرح میں اپنے خاوند شیروان سے محبت کرتی تھی اور اس کی خیر خواہ تھی۔ اس کے علاوہ تمہیں بدروح رگھو کی دشمنی کا ثبوت بھی مل چکا ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ وہ تم پر تین چار بار قاتلانہ حملہ کر چکا ہے اور تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ اگر تم مجھ سے الگ ہو گئے تو تمہارے لئے پجاری رگھو سے اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی۔ پھر تم کیوں مجھ سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہو؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں نے تم سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ڈرنا ایک قدرتی بات ہے۔ کبھی کبھی بہادر سے بہادر آدمی بھی ڈر جاتا ہے۔ بس مجھ پر انسانی کمزوری غالب آ گئی اور میں ڈر گیا۔ وعدہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ مگر ایک بات میں تمہیں ضرور بتانا چاہتا ہوں۔ میں نے عین اس وقت اپنے چہرے پر کسی غیبی چیز کا سانس اور اپنی گردن پر اس کے ہونٹوں کا لمس محسوس کیا تھا جب تم نے کوٹھڑی میں



مٹی کے مٹ کے اوپر رکھی ہوئی پتھر کی سِل ہٹائی تھی۔‘‘

میری اس بات پر روہنی نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ میں نے اُس کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھے تو اس سے پوچھا۔ ’’کیا تم نے مٹی کے مَٹ میں کچھ دیکھا تھا؟‘‘

روہنی نے کہا۔ ’’شیروان! اس مٹکے میں کوئی آسیب ضرور تھا جو میرے پتھر کی سل ہٹانے سے مٹکے میں سے تیزی سے باہر نکل گیا تھا۔‘‘

’’آسیب؟‘‘ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

روہنی کہنے لگی۔ ’’ہاں آسیب..... یہ وہی آسیب تھا جس کے سانس کو تم نے اپنے چہرے اور جس کے کراہت آمیز لجلجے ہونٹوں کو تم نے اپنی گردن پر محسوس کیا تھا۔‘‘

میں نے اپنے دل میں کہا۔ لگتا ہے ایک اور بلا میرے پیچھے لگ گئی ہے خدا ہی مجھے ان بدروحوں اور بلاؤں سے بچا سکتا ہے۔ میں نے روہنی سے کہا۔ ’’آسیب کا تم نے نام کیوں لیا ہے۔ کیا آسیب کوئی دوسری قسم کی بدروح ہوتی ہے؟‘‘

روہنی نے کہا۔ ’’تم اسے نہیں سمجھ سکو گے۔ تم یہی سمجھ لو کہ آسیب بھی ایک بدروح ہوتی ہے مگر اس میں اور بدروح میں یہ فرق ہوتا ہے کہ بدروح کی سزا کی مدت لمبی ہو جائے تو وہ بدروح آسیب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ آسیب سے بدروحیں بھی گھبراتی ہیں۔ آسیب کو اپنے قبضے میں کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ آسیب کو قبضے میں کرنے کا ایک خاص منتر ہوتا ہے جس کو اگنی منتر یعنی آگ کا منتر کہتے ہیں۔‘‘

میں نے پوچھا۔ ’’کیا تمہیں وہ منتر آتا ہے؟‘‘

روہنی نے کہا۔ ’’آج تک یہ منتر ہندوستان میں صرف دو چار منتریوں کو ہی معلوم ہو سکا ہے اور وہ بھی اس منتر کے راز کو مرنے کے بعد اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ وہ کوئی بہت بڑا منتری تھا جس نے شمشان گھاٹ کے مٹکے میں اس آسیب کو قید کیا ہوا

تھا جو میرے پتھر کی سل سرکانے کے بعد مٹکے میں سے باہر نکل گیا تھا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا یہ آسیب تھا جس نے میری گردن پر اپنے گیلے ہونٹ لگائے تھے؟"

"ہاں۔" روہنی بولی۔ "جب یہ آسیب بند مٹکے میں سے باہر نکلا تھا تو میں نے اس کی سانس کی دھیمی پھنکار ایسی آواز سنی تھی۔ یہ آسیب مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا لیکن اس نے مجھے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر میں اس بات پر پریشان ہوں کہ آسیب تمہارے پاس آکر کیوں رُک گیا اور اس نے تمہاری گردن پر اپنے گیلے ہونٹ کیوں رکھ دیئے تھے؟"

مجھے فکر ہوئی کہ کہیں آسیب نے مجھے اپنا نشانہ بنانے کے لئے تو نہیں چن لیا۔ جب میں نے اس کا ذکر روہنی سے کیا تو وہ کہنے لگی۔ "میرا نہیں خیال کہ یہ آسیب تمہیں نقصان پہنچانے کے ارادے سے تمہارے پاس آیا تھا۔ اگر ایسی بات ہوتی تو وہ تمہیں نقصان پہنچا چکا ہوتا اور تم اس وقت میرے سامنے نہ ہوتے بلکہ خدا جانے زمین کے اندر کون سی دنیا میں پہنچ گئے ہوتے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا یہ کسی مرد کا آسیب تھا یا کسی عورت کا؟"

روہنی نے کہا۔ "یہ کسی نوجوان لڑکی کا آسیب تھا۔"

میں نے دوسرا سوال کیا۔ "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ یہ کسی نوجوان لڑکی کا آسیب تھا۔"

روہنی بولی۔ "ہمیں پتہ چل جاتا ہے۔ کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ تم نہیں سمجھ سکو گے۔"

میں نے اپنا خوف دُور کرنے کی غرض سے پوچھا۔ "کیا یہ آسیب اس وقت بھی ہمارے ساتھ ہے؟"

روہنی نے کہا۔ "میں آسیب کو نہیں دیکھ سکتی۔ آسیب صرف اُن منتریوں کو ہی



دکھائی دیتا ہے جن کے پاس آسیب کا منتر ہو یا پھر ان لوگوں کو نظر آجاتا ہے جن کو آسیب خود اپنی مرضی سے یہ پراسرار منتر بتا دے۔"

میں نے روہنی سے کہا کہ تم نے تو آسیب کو کسی بڑے منتری دشمن کی قید سے رہائی دلائی ہے اور اسے اسی طرح مٹکے سے آزاد کرایا ہے جس طرح میں نے تمہیں مرتبان کھول کر پجاری رگھو کی قید سے آزاد کرایا تھا۔ اس اعتبار سے تو آسیب کو تمہارا شکرگزار ہونا چاہئے۔ روہنی کہنے لگی۔ "آسیب کبھی کسی انسان کے دوست نہیں بنتے لیکن اگر کسی کے دوست بن جائیں تو پھر اُن سے اچھا دوست اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اُس نوجوان لڑکی کے آسیب نے تمہاری گردن کو چوم لیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اُس کو تم پسند آگئے ہو اور اُس نے تمہیں اپنا دوست بنا لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ اس لڑکی کا آسیب مجھے کسی وقت بھی چمٹ سکتا ہے اور جس آدمی کو کوئی آسیب چمٹ جائے اس کا تو برا حشر ہو جاتا ہے۔"

روہنی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ کہنے لگی۔ "اس نوجوان لڑکی کے آسیب نے تمہیں پسند کر لیا ہے۔ وہ تمہاری دوست بن گئی ہے۔ اس کا آسیب تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

میں نے اس نوجوان لڑکی کے آسیب میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ "اگر میں اس لڑکی کے آسیب کو دیکھ ہی نہیں سکتا تو پھر اس کی دوستی کا مجھے کیا فائدہ؟"

روہنی بولی۔ "شاید وہ خود کبھی تمہیں اپنا آپ دکھا دے لیکن کیا تمہیں اسے دیکھنے کا بہت شوق ہے؟ اگر ایسی بات ہے تو یہ خیال اپنے دل سے نکال دو۔ آسیب کی دوستی کا اگر کچھ فائدہ ہوتا ہے تو اس کا نقصان بھی بہت ہوتا ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے اس نوجوان لڑکی کے آسیب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور میرے دل سے اس کا خوف دُور ہو گیا تھا۔ مگر روہنی کی یہ بات میں نے اپنے پلے باندھ لی تھی کہ کسی آسیب کی دوستی اچھی نہیں ہوتی۔

متھرا شہر کے اُس قدیم مندر کے باہر درخت کے نیچے چبوترے پر بیٹھے باتیں کرتے ہمیں کافی وقت گزر گیا تھا۔ میں اور روہنی ابھی تک غیبی حالت میں ہی تھے اور کوئی ہمیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جتنی دیر تک میں غائب رہتا تھا اتنی دیر تک نہ مجھے بھوک لگتی تھی نہ ہی پیاس لگتی تھی۔ جب غیبی حالت سے زندہ انسانی حالت میں واپس آتا تھا تو بھوک اور پیاس کا احساس بھی میرے دوسرے احساسات کے ساتھ واپس آ جاتا تھا۔

میں نے روہنی سے کہا۔ ”سلطانہ! ہم کب تک یہاں بیٹھے رہیں گے؟ ہمیں آج کا دن اور کل کا دن بھی اس شہر میں گزارنا ہے کیونکہ پجاری رگھو کی بدروح کی یاترا کل رات سے شروع ہونے والی ہے۔ میرا خیال ہے کیوں نہ ہم کسی اچھے سے ہوٹل میں یہ وقت گزاریں۔“

روہنی ہنس کر بولی۔ ”تم زندہ انسان ہو تم لوگوں کو اپنے آرام و آسائش کا ضرور خیال آ جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہم آرام نہ کریں تو کام بھی اچھی طرح سے نہیں کر سکتے۔“

روہنی بولی۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ چلو شہر کے کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔“

ہندوستان کو آزادی ملے ابھی دو چار سال ہی گزرے تھے اور متھرا شہر میں بھی ابھی نہ تو اتنی آبادی بڑھی تھی اور نہ فائیو سٹار قسم کے ہوٹل ہی تعمیر ہوئے تھے۔ ہم نے پرواز کرتے ہوئے شہر کے اوپر ایک چکر لگایا۔ ہمیں متھرا ریلوے سٹیشن کے قریب ایک ہوٹل کی عمارت دکھائی دی۔ روہنی نے کہا۔ ”یہ ہوٹل مجھے اچھا لگتا ہے۔ چلو نیچے اترتے ہیں۔“

ہم ایک خالی جگہ دیکھ کر زمین پر اتر آئے۔ زمین پر اترنے کے بعد روہنی انسانی شکل میں واپس آ گئی۔ وہ مجھے بھی انسانی شکل میں واپس لے آئی۔ ہم ہوٹل کی لابی میں آ گئے۔ اُس زمانے کے مطابق یہ کافی ماڈرن ہوٹل تھا اور خاص طور پر یہ غیر ملکی



سیاحوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھ کر بنایا گیا تھا۔

ہم نے اس ہوٹل میں دو ساتھ ساتھ کمرے لے لئے۔ زندہ حالت میں واپس آنے کے بعد مجھے سخت بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے نیچے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ روہنی میرے ساتھ ہی تھی۔ پھر اپنے کمرے میں جا کر اچھی طرح سے نہا کر تازہ دم ہو گیا۔ روہنی کے پاس ہر وقت انڈین کرنسی کے نوٹ موجود رہتے تھے۔ خدا جانے وہ غیب میں سے کہاں سے نئے نئے نوٹ منگوا لیتی تھی۔ اس نے کچھ نوٹ مجھے بھی دے دیئے تھے کہ اپنے پاس رکھ لوں ان کی کسی وقت مجھے بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں نے وہ رات ہوٹل میں ہی بسر کی۔

دوسرے دن شہر کی سیر کرتے رہے۔ روہنی مسلمان ہو چکی تھی۔ اسے مندروں میں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب سے وہ میرے ساتھ تھی میں نے اسے کبھی کسی مندر میں کسی مورتی کے آگے ماتھا ٹیکتے نہیں دیکھا تھا۔ رات کو ہم ہوٹل میں واپس آ گئے۔ میں نے کھانا کھایا۔ ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال کے کونے میں بیٹھے تھے۔ ہم کافی پی رہے تھے۔ روہنی کے ساتھ ایسا لگتا تھا کہ وہ زندہ انسان نہیں تھی بلکہ اپنی بدروح تھی اسے کھانے پینے کی حاجت نہیں تھی مگر وہ جس وقت چاہتی میرے ساتھ کھانا بھی کھا لیتی تھی اور چائے کافی بھی پی لیتی تھی۔ اس کو میں نے کبھی نہاتے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہر وقت تازہ دم رہتی تھی اور جس قسم کا چاہے لباس پہن لیتی تھی۔

روہنی چونکہ اپنی زندگی میں مسلمان ہو چکی تھی اور اس کے بعد اس کی زندگی نیک اعمال کے ساتھ بسر ہوئی تھی اور وہ صرف ایک سنگین گناہ کی پاداش میں مرنے کے بعد بدروح کی شکل میں سزا بھگت رہی تھی اس لئے وہ بدروحوں کی جملہ بری خصلتوں اور آلودگیوں سے محفوظ تھی اور مجھے اس کے لباس میں سے ہمیشہ ایک طلسمی خوشبو سی آیا کرتی تھی۔

روہنی نے ایک بار مجھے کہا تھا۔ ”انسان کو اپنے برے اعمال کی سزا ضرور بھگتنی

پڑتی ہے۔ کبھی کبھی یہ سزا اُسے دنیا میں ہی مل جاتی ہے لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اسے مرنے کے بعد یہ سزا ملتی ہے۔ مجھے بھی میری موت کے بعد یہ سزا ملی ہے مگر خدا نے مجھے بخش دیا ہے اور میری سزا کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ اگر میں دشمن پجاری رگھو کے قبضے میں نہ گئی تو میری روح کو جلد نجات مل جائے گی اور میں بدروح سے دوبارہ ایک نیک روح کی شکل اختیار کرلوں گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے سلطانہ!" میں نے خوش ہو کر کہا۔

روہنی کہنے لگی۔ "لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ میں پجاری رگھو کی بدروح سے چھٹکارا حاصل کرلوں۔ اگر میں ایسا نہ کر سکی اور پجاری رگھو نے مجھے ایک بار پھر قید کرلیا تو پھر کوئی پتہ نہیں کہ میری کب نجات ہو۔"

میں نے اس سلسلے میں روہنی سے پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ آج رات کو ہمیں کیا حکمت عملی اختیار کرنی ہوگی۔ کیا تم اکیلی شمشان گھاٹ جاؤ گی یا مجھے بھی تمہارے ساتھ جانا ہوگا۔"

روہنی نے کہا۔ "تمہارا میرے ساتھ جانا بڑا ضروری ہے۔ اگر مجھے وہاں کوئی حادثہ پیش آگیا تو کم از کم تم مجھے بچانے کا کوئی جتن، کوئی اپائے تو کر سکو گے۔ اگر میں اکیلی وہاں گئی اور مجھے کچھ ہو گیا تو تمہیں کچھ پتہ نہیں چلے گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔ لیکن کیا ہم پہلے جاکر شمشان گھاٹ میں چھپ کر پجاری رگھو کی بدروح کا انتظار کریں گے یا آدھی رات کو اس کے آنے کے بعد وہاں جائیں گے؟"

روہنی کہنے لگی۔ "ہم آدھی رات سے کچھ دیر پہلے وہاں جائیں گے اور کسی جگہ چھپ کر پجاری رگھو اور اس کے راکھششوں کا انتظار کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "پجاری رگھو تو تمہیں نظر نہیں آئے گا۔ وہ مجھے بھی نظر نہیں



آئے گا۔ پھر ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ وہ شمشان گھاٹ پہنچ گیا ہے۔"

روہنی بولی۔ "ہم نے دلہن کی کھوپڑی کی راکھ کی دیا سلائی اپنی آنکھوں میں ڈال رکھی ہوگی۔ پجاری رگھو ہمیں نظر آجائے گا۔"

"اور اگر ہم اُس کو نظر آگئے تو پھر کیا ہوگا؟" میں نے سوال کیا۔

روہنی نے کہا۔ "پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں اس قسم کی باتیں سوچ سوچ کر ڈرتی رہی تو میں کبھی پجاری رگھو پر فتح حاصل نہیں کر سکوں گی اور کبھی مجھے مکتی نہیں ملے گی۔"

ہم رات کے دس بجے کے قریب ہوٹل کے ڈائننگ ہال سے اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد دیوار پر لگے کلاک کو بھی دیکھ لیتے تھے۔ جب کلاک نے رات کے پورے گیارہ بجائے تو روہنی نے اپنے بازو کے ساتھ بندھا ہوا وہ تعویذ اتارا جس میں دلہن کی کھوپڑی کی راکھ تھی۔ اُس نے ایک سلائی اپنی آنکھوں میں لگالی اور ایک سلائی میری دونوں آنکھوں میں لگادی۔ کمال کی بات ہوگئی سلائی کے آنکھوں میں پھرتے ہی میں غائب ہوگیا۔ میں نے دیکھا تو روہنی بھی غائب ہو چکی تھی۔ میں نے اپنی تسلی کے لئے اس سے پوچھ لیا۔ "سلطانہ! اگر اس حالت میں پجاری رگھو نے تمہیں دیکھ لیا تو مجھے پہلے ہی بتادو کہ مجھے کیا کرنا ہو گا۔ کیونکہ اگر رگھو تمہیں دیکھ سکے گا تو میں بھی اسے ضرور نظر آجاؤں گا۔"

روہنی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ اس مسئلے کا کوئی حل تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر پجاری رگھو نے تمہیں دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ میں تو انسان نہیں ہوں۔ ہو سکتا ہے کھوپڑی کی راکھ کی وجہ سے میں اسے نظر نہ آؤں لیکن تم انسان ہو۔ ہو سکتا ہے تم اسے نظر آجاؤ۔ اگر ایسا ہو گیا تو پجاری رگھو سب سے پہلے تمہیں اسی لمحے ہلاک کردے گا اور میں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ تمہارا میرے ساتھ جانا بھی ضروری ہے تاکہ اگر مجھے کچھ ہو جائے

تو تم اگر میری مدد نہیں کر سکو گے تو کم از کم تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ میرے ساتھ کیا گزری ہے۔ اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ میری سہیلی مالینی تم سے رابطہ پیدا کرے اور تم سے تمام حالات معلوم کرنے کے بعد میری مدد کر سکے۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔

روہنی کو جیسے ایک دم اس مسئلے کا حل سوجھ گیا۔ کہنے لگی۔ "اس کا ایک ہی حل ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں چھوٹا سانپ بنا کر اپنی کلائی میں لپیٹ لوں گی۔ اگر رگھو پجاری نے مجھے دیکھ لیا اور مجھ پر اس نے وار کر دیا تو میں اسی لمحے تمہیں نیچے گرا دوں گی اور تم وہاں سے نکل جانا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے سانپ بنتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔"

روہنی کہنے لگی۔ "میں تمہیں صرف سانپ ہی بنا سکتی ہوں۔ کچھ اور بنانا میری طاقت سے باہر ہے۔"

مجھے اچانک مالینی کا بتایا ہوا منتر یاد آ گیا۔ میں نے کہا۔ "کیوں نہ میں تمہاری سہیلی مالینی کا بتایا ہوا منتر پڑھ کر چمگادڑ بن جاؤں۔ میں پہلے بھی چمگادڑ بن چکا ہوں اور مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔"

روہنی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مالینی کا بتایا ہوا منتر بڑا خطرناک ہے۔ میں تمہیں یہ منتر پڑھ کر اپنا روپ بدلنے کا مشورہ نہیں دوں گی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ اس منتر کے اثر سے تم چمگادڑ کے علاوہ کسی دوسرے جانور یا درندے کے روپ میں بھی ظاہر ہو سکتے ہو۔ اور تم خواہ کسی بھی درندے کے روپ میں ظاہر ہو گے تو پجاری رگھو تمہیں فوراً دیکھ لے گا اور سب سے پہلے تم پر وار کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "مگر وہ مجھے سانپ کے رُوپ میں بھی تو دیکھ سکتا ہے۔"

اس پر روہنی نے کہا۔ "میں تمہیں اتنا چھوٹا سانپ بناؤں گی کہ تم میری کلائی کے ساتھ لپٹے ہوئے اسے دکھائی نہیں دو گے۔"



وہ خاموش ہو گئی۔ میں بھی کچھ نہ بولا۔ میرے دل میں صرف ایک ہی خیال تھا کہ خدا جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ روہنی نے میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ وہ جب بھی مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کرتی تھی تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتی تھی۔ کہنے لگی۔ "شیروان! مجھے معاف کر دینا۔ میری وجہ سے تم ایک بہت بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ مگر یہ اب تمہاری زندگی اور موت کا مسئلہ بھی بن گیا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ چھوڑ دیتے ہو یا میں تمہیں چھوڑ دیتی ہوں تو تم ہمارے دشمن پجاری رگھو کے لئے ایک بڑا آسان شکار بن جاؤ گے۔ وہ جب اور جہاں چاہے گا تمہیں اس طرح پکڑ کر مسل ڈالے گا جس طرح آدمی کسی مکھی کو پکڑ کر مسل ڈالتا ہے۔ اس میں تمہاری بھی موت ہو گی اور میری بھی ایک طرح سے دوسری موت ہو گی۔"

وہی بات تھی کہ میں اس کی مجبوری اور وہ میری مجبوری بن چکی تھی۔ مجھے یہ کہنا ہی پڑا کہ تم مجھے جو مشورہ دو گی میں اس پر عمل کروں گا۔"

روہنی نے کہا۔ "میں تمہیں سانپ کے روپ میں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ میں تمہیں اپنے گریبان کے اندر چھپا کر بھی لے جا سکتی ہوں مگر چھپا کر لے جانے سے وہ مقصد فوت ہو جائے گا جس کے لئے میں تمہیں ساتھ لے جاؤں گی۔ کیونکہ تم میرے گریبان کے اندر چھپے ہوئے دیکھ نہیں سکو گے کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے اور میں اپنے دشمن کو نظر آ جانے کی صورت میں تمہیں اتنی جلدی اپنے گریبان سے نکال کر پھینک نہیں سکوں گی جتنی جلدی اور رازداری سے میں تمہیں اپنی کلائی سے نیچے گرا سکتی ہوں۔ اس لئے یہ میری مجبوری ہے شیروان۔ میرے محبوب!"

میں نے کہا۔ "میں اسے مانتا ہوں سلطانہ! لیکن مجھے ایک بات بتاؤ کہ مجھے سانپ سے انسانی روپ میں دوبارہ کون واپس لائے گا؟"

روہنی کہنے لگی۔ ''اگر مجھے پجاری رگھو نے اپنے قبضے میں کر لیا تو اس کی خبر میری سہیلی مالینی کو ضرور ہو جائے گی اور وہ خود تم سے رابطہ پیدا کرے گی اور پھر وہی تمہیں سانپ کی شکل سے واپس انسانی شکل میں لائے گی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے مالینی کو پجاری رگھو کے ہاتھوں میرے پکڑے جانے کی خبر ملنے میں دیر لگ گئی تو تم ایسا کرنا کہ یہاں سے جے پور کے ویران محل میں جانا جہاں آدھی رات کو میری بچپن کی سہیلی دُرگا کی بدروح آتی ہے۔ دُرگا کو سارا واقعہ بیان کرنا۔ وہ تمہارا انسانی رُوپ واپس لے آئے گی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن میں تو بول نہیں سکوں گا۔ میں تو سانپ ہوں گا پھر اسے اپنی کہانی کیسے سناؤں گا اور اسے کس طرح بتاؤں گا کہ میں کون ہوں۔''

روہنی نے اس کے جواب میں کہا۔ ''جے پور کے ویران محل کی بدروح دُرگا تمہیں دیکھتے ہی سمجھ جائے گی کہ تم کون ہو۔ تمہیں کچھ بتانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔''

اس تمام لمبی بحث مباحث کا نتیجہ یہی نکلا کہ میں انسان سے سانپ بننے اور روہنی مجھے سانپ بنانے پر تیار ہو گئی۔ اس نے مجھے اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور منتر پڑھنے لگی تو میں نے اُس کو روک کر کہا۔ ''یہ بتاؤ سلطانہ کہ کیا میں انسانی آواز سن اور سمجھ سکوں گا؟ کیا میں بھی انسانوں کی طرح بول سکوں گا؟''

روہنی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں۔ تم خود انسانوں کی طرح بول نہیں سکو گے لیکن انسان کو دنیا کی ہر زبان بولتے ہوئے سمجھ جاؤ گے کہ یہ کون سی زبان میں کیا کہہ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انسان سانپ کا دشمن ہے۔ مجھے کسی نے بھی دیکھ لیا تو وہ مجھے مارنے کے لئے پتھر اور ڈنڈا لے کر مجھ پر ضرور حملہ کرے گا۔ اگر کسی کا پتھر یا ڈنڈا مجھے لگ گیا تو کیا میں مر جاؤں گا؟''



روہنی کہنے لگی۔ ''اگر تم کسی انسان کے ہاتھوں مارے گئے یا کسی کے جوتوں تلے آ کر کچلے گئے تو تم مرو گے نہیں بلکہ غائب ہو جاؤ گے اور اس کے بعد ایک گھنٹے میں یا ایک دن گزر جانے کے بعد تم کسی بھی جگہ دوبارہ نمودار ہو جاؤ گے۔''

''دوبارہ میں سانپ کے رُوپ میں ظاہر ہوں گا یا اپنی انسانی شکل میں؟'' میں نے پوچھا۔

روہنی بولی۔ ''اس بارے میں، میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ تم انسان کے رُوپ میں بھی دوبارہ ظاہر ہو سکتے ہو اور سانپ کی شکل میں بھی ظاہر ہو سکتے ہو۔''

میں دل میں اس منحوس گھڑی کو کوسنے لگا جب میں نے روہت گڑھ کے قلعے میں روہنی کی آتما کو مرتبان میں سے آزاد کیا تھا۔ مگر اب میرے کوسنے یا نہ کوسنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اسی لئے دانش مند لوگوں کا کہنا ہے کہ انسان کو ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہئے اور جس شے سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہ ہو اُس میں دخل نہیں دینا چاہئے اور خاموشی سے آگے گزر جانا چاہئے۔

روہنی نے پوچھا۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

''تیار ہوں۔'' میں نے سخت بیزاری کے عالم میں جواب دیا۔

روہنی اور میں دونوں غیبی حالت میں تھے مگر ایک دوسرے کو نظر آ رہے تھے۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں اور میری جون بدلنے کا خاص منتر پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے ڈر کے مارے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں اس لئے کہ میں اپنے آپ کو سانپ کی جون بدلتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہ بڑی دہشت طاری کر دینے والی بات تھی۔ تین چار منٹ تک روہنی منتر کا جاپ کرتی رہی۔ جب اُس نے منتر پڑھنا بند کیا تو مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے پیچھے سے مجھے آہستہ سے دھکا دے دیا ہو۔ پھر بھی میں نے آنکھیں بند رکھیں۔ روہنی کی آواز آئی۔ ''شیروان! آنکھیں کھول کر دیکھو۔''

''یا اللہ خیر!'' میں نے اپنے دل میں کہا اور آنکھیں کھول دیں۔ مجھے اپنا جسم

دکھائی نہ دیا۔ میں نے روہنی سے پوچھا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

روہنی نے اپنی مٹھی میرے سامنے کھول دی اور بولی۔ ”یہ دیکھو۔“

میں نے دیکھا کہ روہنی کی ہتھیلی پر کمرے کے بلب کی روشنی میں ایک بالشت بھر کا خاکستری رنگ کا سانپ گردن اٹھائے اپنا چھوٹا سا پھن کھولے بیٹھا تھا۔ میں نے دہشت زدہ ہو کر روہنی سے پوچھا۔ ”کیا یہ میں ہوں؟“

روہنی نے کہا۔ ”ہاں! یہ تم ہی ہو اور تم ہی مجھ سے بات کر رہے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن اگر میں سانپ بن چکا ہوں تو انسانوں کی زبان میں کیسے بات کر سکتا ہوں؟“

روہنی نے کہا۔ ”تم سانپوں کی زبان میں ہی بات کر رہے ہو لیکن میں اپنی بدروحوں والی شکتی کی مدد سے تمہاری سانپوں کی زبان کو یہاں کے انسانوں کی اُردو زبان میں تبدیل کر کے سن رہی ہوں اور تم بھی اسی زبان میں اپنی آواز سن رہے ہو۔“

اس نے مجھے اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا اور کہا۔ ”میری کلائی سے ہی چمٹے رہنا شیروان! اگر شمشان گھاٹ پر میں آنکھوں میں ڈالی دلہن کی کھوپڑی کی راکھ کی وجہ سے پجاری رگھو کو نظر نہ آئی تو میں موقع پا کر اپنے ایک آتش ناک منتر سے اسے جلا کر بھسم کرنے کی کوشش کروں گی۔ لیکن اگر میں اُسے نظر آ گئی اور اس نے مجھ پر وار کر دیا تو میں سب سے پہلا کام یہ کروں گی کہ وہیں اپنی کلائی سے تمہیں نیچے لڑھکا دوں گی اور تم زمین پر گرتے ہی فوراً وہاں سے جتنی دور بھاگ سکو بھاگ جانا میرے ساتھ جو ہوگا میں اسے خود ہی سنبھال لوں گی۔“

میرے اوپر ہدایات و شرائط کا ٹوکرا پھینک دیا گیا تھا مگر میں نے بڑے صبر اور حوصلے کے ساتھ ان ساری شرطوں اور ہدایات کو سنا تھا اور انہیں اپنے دل پر نقش کر لیا تھا۔ کیونکہ ان پر عمل کرنے میں ہی میری زندگی تھی اور ان سے غفلت برتنے



میں میری موت تھی۔

روہنی پلنگ پر سے اٹھ کر ہوٹل کی کھلی کھڑکی کے پاس آ گئی۔ یہ اماوس کی رات تھی۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق اماوس کی رات سب سے تاریک اور اندھیری رات ہوتی ہے۔ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے چاند نہیں نکلا ہوا تھا۔ میں روہنی کی کلائی سے لپٹا ہوا تھا اور وہ میں اس کا سارا جسم دیکھ رہا تھا۔ میں گردن گھما کر اپنا سانپ والا جسم بھی دیکھ رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں آدمی سے چھوٹا سا خاکستری رنگ کا سانپ بن گیا ہوں۔ اسے سنسکرت زبان میں کایا کلپ کہتے ہیں۔ میرا واقعی کایا کلپ ہو گیا ہوا تھا۔

روہنی کھڑکی پر چڑھ کر کھڑی ہو گئی۔ یہ اس ہوٹل کی دوسری منزل تھی۔ روہنی نے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی اور وہ نیچے گرنے کی بجائے ہوا میں اڑنے لگی۔ کھڑکی سے باہر آتے ہی وہ دو تین منزلیں اور بلند ہو گئی اور متھرا شہر کی پورب کی جانب رُخ کر لیا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ نیچے رات کی تاریکی میں شہر کی روشنیاں ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ روہنی اندھیرے میں شہر کی جھلملاتی روشنیوں کے اُوپر اڑتی ہوئی شہر کے پورب کی طرف آ گئی۔ یہاں نیچے روشنیاں نہیں تھیں بلکہ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ روہنی نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”شیروان! ہم پرانے شمشان گھاٹ کے اوپر آ گئے ہیں۔ میں نیچے آنے لگی ہوں۔ تم ٹھیک ہو ناں؟“

میں نے کہا۔ ”ابھی تک بالکل ٹھیک ہوں۔“

روہنی نے بلندی کم کرنی شروع کر دی اور وہ شمشان گھاٹ سے کچھ فاصلے پر درختوں کے جھنڈ کے پاس اتر گئی۔ کہنے لگی۔ ’پجاری رگھو کی بدروح اگر آدھی رات کو شمشان گھاٹ کی یاترا کو آئے گی تو اس کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔“

میں نے اسے کہا۔ ”کسی جگہ چھپ کر اس کا انتظار کرتے ہیں۔“

وہ بولی۔ ”میں شمشان گھاٹ کے چبوترے کی طرف بڑھ رہی ہوں۔ اب تم

خاموش رہنا۔"

میں نے اسی لمحے خاموشی اختیار کرلی اور کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے ہر حالت میں اپنی جان عزیز تھی۔ رات واقعی بہت اندھیری، تاریک اور ڈراؤنی تھی۔ مگر اس اندھیرے میں بھی میں روہنی کو دیکھ رہا تھا اور وہاں پر موجود ہر شے بھی دھندلی دھندلی نظر آ رہی تھی۔ روہنی سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی شمشان گھاٹ کے چبوترے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اِرد گرد سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چتا کے چبوترے اور شمشان گھاٹ کی پرانی کوٹھڑی کے درمیان ذرا ہٹ کر گھنا درخت تھا۔ روہنی کہنے لگی۔ "میں اس درخت میں چھپ کر پجاری رگھو کی بدروح کا انتظار کروں گی۔"

اور وہ زمین سے بلند ہوتے ہوئے درخت کی گھنی شاخوں میں آکر درخت کے ایک دوشاخے پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ وہاں سے شمشان کا چبوترہ اور پرانی کوٹھڑی دونوں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ وہی پرانی کوٹھڑی تھی جس کے اندر وہ پرانا مٹکا تھا جس کی پتھر کی سل ہٹا کر روہنی نے نوجوان لڑکی کے آسیب کو آزاد کر دیا تھا اور جس کے سانس کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا اور جس نے میری گردن کو اپنے گیلے ہونٹوں سے چوم کر میرے بدن پر کپکپی طاری کر دی تھی۔

میں روہنی کی کلائی سے لپٹا بالکل خاموش تھا۔ میرا ذہن انسانی ذہن ہی کی طرح سوچ رہا تھا اور اس طرح محسوس کر رہا تھا جس طرح میں انسانی شکل و صورت میں محسوس کیا کرتا تھا..... درخت کی جس شاخ پر روہنی بیٹھی تھی وہاں سے نیچے چتا کا چبوترہ اور پرانی کوٹھڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ روہنی نے بڑی دھیمی آواز میں کہا۔ "درگا نے بتایا تھا کہ پجاری رگھو کی بدروح کے آنے سے پہلے اس کے محافظ چار راکھشش شمشان گھاٹ پر آتے ہیں۔"

میں نے سرگوشی میں پوچھا۔ "کیا ہم انہیں دیکھ سکیں گے؟"

روہنی نے کہا۔ "ہم نے اپنی آنکھوں میں جس راکھ کی سلائی ڈالی ہوئی ہے وہ



ہمیں ان راکھششوں کو دکھا دے گی۔"

روہنی نے جملہ پورا ہی کیا تھا کہ اچانک جس درخت پر ہم بیٹھے تھے وہ آہستہ آہستہ لرزنا شروع ہو گیا۔ روہنی نے خاموش سرگوشی میں کہا۔ "خاموش! راکھشش آ رہے ہیں۔"

درخت تھوڑی دیر لرزتے رہنے کے بعد ساکت ہو گیا۔ اس کے بعد ایسا گہرا سناٹا چھا گیا کہ مجھے روہنی کے سانس لینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس سناٹے میں دُور سے ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے بہت سی بلیاں رو رہی ہوں۔ قریب آتے آتے یہ آوازیں عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی آوازوں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر یہ آوازیں بھی دور ہوتے ہوتے خاموش ہو گئیں۔ اچانک چتا کے چبوترے کے چاروں کونوں پر آگ کے چار شعلے بلند ہوئے۔ پھر یہ شعلے دھوئیں کے ستونوں میں بدل گئے اور غائب ہو گئے۔ روہنی نے مجھے اپنے منہ کے قریب کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

"چاروں راکھشش آ گئے ہیں۔ اب وہ منحوس پجاری رگھو آنے والا ہے۔"

O

روہنی کی ہدایت کے مطابق میں چپ تھا۔

میری نگاہیں نیچے کچھ فاصلے پر چتا کے ویران چبوترے پر جمی ہوئی تھیں۔ اتنے میں ایسی آواز سنائی دی جیسے دور کہیں بڑی زور کی آندھی چل رہی ہو۔ یہ آواز قریب آتے آتے مکھیوں کی بھنبھناہٹ بن گئی اور جیسے ہمارے درخت کے گرد چکر لگانے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ منحوس پجاری رگھو کو ہماری موجودگی کا علم ہو گیا ہے اور اب ہماری خیر نہیں ہے۔ روہنی کو اُس نے دوبارہ اپنے قابو میں کرنا ہے لیکن مجھے وہ زندہ نہیں چھوڑے گا لیکن کچھ ہی دیر بعد مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آوازیں بھی غائب ہو گئیں۔ دوسرے لمحے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔

چیخ کی آواز ایسی تھی جیسے کسی کو ذبح کرتے وقت اس کی آخری چیخ ہو۔ روہنی نے فوراً مجھے کلائی پر سے اتار کر اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور پہلے سے بھی زیادہ دھیمی سرگوشی میں کہا۔ ”جب میں تمہیں نیچے گراؤں، فوراً فرار ہو جانا۔“

میں اپنا چھوٹا سا سانپ کا سر روہنی کی انگلیوں میں سے باہر نکال کر دیکھ رہا تھا۔ رات کی تاریکی اور سناٹا اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ چیخ کی آواز نے مجھ پر بھی ایک لمحے کے لئے لرزہ طاری کر دیا تھا۔ اتنے میں چار لمبے بالوں والی سیاہ فام عورتیں چتا کے چبوترے کے چاروں کونوں میں نمودار ہوئیں۔ ان عورتوں کے سیاہ جسموں پر بھی بال اگے ہوئے تھے۔ وہ بن مانس لگتی تھیں اور زور زور سے سر ہلا رہی تھیں۔ پھر وہ ایک دم بت بن کر ہاتھ سینے پر باندھ کر کھڑی ہو گئیں۔



اب تاریکی میں ایک طرف سے ایسی دہشت ناک آواز سنائی دی جیسے کسی مگرمچھ نے پھنکار ماری ہو اور اس کے ساتھ ہی ہمارا دشمن منحوس پجاری رگھو کا تخت نمودار ہوا۔ تخت کو چار سیاہ فام حبشیوں نے اٹھایا ہوا تھا۔ تخت پر ایک کرسی رکھی تھی۔ کرسی پر پجاری رگھو ایک ہاتھ میں عصا لئے زرد لباس میں بیٹھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے انگارے دہک رہے ہوں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ سیاہ فام حبشیوں نے تخت چتا کے چبوترے پر رکھ دیا۔ پجاری رگھو تخت پر سے اتر کر چبوترے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی دہکتی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے بالکل ساکت ہو کر کھڑا رہا پھر چبوترے سے اترا اور پرانی کوٹھڑی کی طرف چلنے لگا۔ سیاہ فام حبشی عورتیں دوڑ کر اس کے دائیں بائیں ہو گئیں۔ پھر دو حبشی عورتیں کوٹھڑی کے دروازے کے دونوں جانب ادب سے کھڑی ہو گئیں۔

پجاری رگھو کوٹھڑی میں چلا گیا۔

روہنی نے آہستہ سے مجھے کہا۔ ”اسے ہماری موجودگی کا علم نہیں ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے سامنے گئی تو وہ مجھے دیکھ بھی نہیں سکے گا۔“

میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔ ”روہنی! سوچ سمجھ کر کوئی قدم اٹھانا۔“

روہنی نے مجھے سختی سے کہا۔ ”تم مت بولو......“

میں خاموش ہو گیا۔ روہنی نے شاید پجاری رگھو پر وار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا شاید کہ اس نے دلہن کی کھوپڑی کی جو راکھ آنکھوں میں ڈالی ہوئی ہے وہ کام کر گئی ہے اور وہ پجاری رگھو کو نظر نہیں آئے گی۔ کچھ کچھ مجھے بھی ایسا ہی یقین ہو رہا تھا۔ کیونکہ پجاری رگھو کے پاس بے پناہ جادوئی طاقت تھی اور وہ اپنی طاقت کی وجہ سے ہماری موجودگی محسوس کر سکتا تھا مگر وہ ایسے نہیں کر سکا تھا۔ اگر اسے ہماری موجودگی کا ذرا سا بھی احساس ہو جاتا تو وہ فوراً ہم پر حملہ کر دیتا۔

روہنی درخت سے آہستہ آہستہ نیچے آ گئی۔

میں اس کی مٹھی میں تھا اور اس کی انگلیوں کے درمیان سے اپنی سری باہر نکالے دیکھ رہا تھا۔ روہنی آہستہ آہستہ اس کوٹھڑی کی طرف چلنے لگی جس میں تھوڑی دیر پہلے پجاری رگھو داخل ہوا تھا۔ دونوں حبشی عورتیں کوٹھڑی کے باہر دونوں جانب سر جھکائے کھڑی تھیں۔ روہنی ان کے قریب سے ہو کر گزر گئی مگر ان میں سے کوئی بھی روہنی کو نہ دیکھ سکی تھی۔ روہنی نے منہ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کوٹھڑی میں داخل ہو گئی۔ کوٹھڑی میں ایک طاق تھا جس میں کھوپڑی کے پیالے میں دیا جل رہا تھا۔ میں نے خوف کے مارے اپنا سر روہنی کی انگلیوں میں ذرا نیچے کر لیا تھا اور سمٹ گیا تھا۔

میں نے بھی دیکھا اور روہنی نے بھی دیکھا کہ کوٹھڑی بالکل خالی پڑی تھی۔ ہمارے سامنے تھوڑی دیر پہلے پجاری رگھو اس کوٹھڑی میں داخل ہوا تھا مگر اب وہ اندر نہیں تھا۔ کوٹھڑی میں نہ کوئی روشن دان تھا نہ کوئی کھڑکی تھی پھر خدا جانے وہ منحوس پجاری کہاں غائب ہو گیا تھا۔ کوٹھڑی خالی دیکھ کر روہنی بھی کچھ گھبرا گئی تھی۔ وہ جلدی سے مڑی اور کوٹھڑی سے باہر نکل آئی۔

جیسے ہی وہ باہر آئی ایک بجلی سی چمکی اور سامنے پجاری رگھو کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں پھوٹ رہی تھیں۔ اُس نے گرج کر کہا۔ ”روہنی! میں تیری تلاش میں تھا۔ تو خود ہی میرے جال میں آ گئی۔ اب تو بچ کر نہیں جائے گی۔“

روہنی نے منتر پڑھ کر پجاری کی طرف زور سے پھونک ماری مگر عیار پجاری ہوشیار ہو چکا تھا وہ پلک جھپکتے میں غائب ہو گیا۔ پھر ایسی خوفناک آوازیں آنے لگیں جیسے ہاتھی چنگھاڑ رہے ہوں، شیر دھاڑ رہے ہوں، سانپ پھنکار رہے ہوں۔ روہنی اونچی آواز میں منتر پڑھ پڑھ کر پھونک رہی تھی مگر لگتا تھا کہ پجاری رگھو اُس کی زد سے نکل چکا تھا۔ اس قیامت کی دل دہلا دینے والی چیخوں کی آوازوں میں بجلی کڑکی اور



اچانک جہاں روہنی کھڑی تھی اس کے ارد گرد آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ پجاری رگھو کی گرج دار آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ ”روہنی! اب تو میری قید میں ہے۔ تجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔ تیرے منتر مجھ پر کوئی اثر نہیں کریں گے۔“

ہمارے ارد گرد آگ کی چار دیواری کھڑی ہو گئی تھی۔ روہنی نے گھبراہٹ میں مجھ سے کہا۔ ”شیروان بھاگ کر جان بچاؤ۔“

اور اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے آگ کی دیوار کے اوپر سے پیچھے کی جانب اچھال دیا۔ میں روہنی کی مٹھی سے نکل کر شعلوں کی دیوار سے دور جھاڑیوں میں آ کر گرا۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی میں جتنی تیز رینگ سکتا تھا رینگ کر دوڑنے لگا۔ میرا رخ متھرا شہر کی طرف تھا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ پجاری رگھو کو میں نظر نہیں آیا تھا ورنہ میں وہاں سے جان بچا کر نہیں نکل سکتا تھا۔ پجاری رگھو مجھے آسانی سے ہلاک کر سکتا تھا۔ دلہن کی کھوپڑی کی راکھ نے مجھے اس کی نگاہوں سے چھپا لیا تھا مگر روہنی کو نہ چھپا سکی تھی۔ اس کی شاید یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ روہنی ایک بدروح تھی اور ایک بدروح اگر دوسری بدروح سے طاقتور ہو تو وہ دوسری کو غیبی حالت میں بھی دیکھ لیتی ہے اور پجاری رگھو کی بدروح بدی کے معاملے میں بہت طاقت ور تھی۔ اس نے شاید روہنی کو اسی وقت دیکھ لیا تھا جب وہ چتا کے چبوترے پر اپنے تخت سے اُتر کر ایک پل کے لئے ساکت ہو گیا تھا۔ وہ کوٹھڑی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ روہنی اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ کوٹھڑی میں جا کر وہ غائب ہو گیا۔ جب میں اور روہنی کوٹھڑی میں گئے تو کوٹھڑی خالی تھی۔ ہم پجاری رگھو کی تلاش میں باہر آ گئے۔ باہر پجاری رگھو روہنی کو پکڑنے کے لئے اپنا طلسمی جال بچھا چکا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد روہنی اس کے جال میں پھنس گئی۔ لیکن اس نے مجھے آگ کی دیوار کے اوپر سے اچھال کر بچا لیا تھا۔

اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر میں روہنی کی ہدایت پر عمل نہ کرتا اور مالینی بدروح کا چار لفظی آتشی منتر پڑھ کر غائب ہوتا تو خدا جانے میں کسی ہاتھی یا لومڑ کے

روپ میں ظاہر ہو جاتا اور دونوں صورتوں میں میرا آگ کی چار دیواری میں سے جان بچا کر نکلنا مشکل بلکہ ناممکن تھا کیونکہ آگ کی یہ دیوار دس فٹ چوری تھی اور اس کی تپش اتنی تھی کہ دور ہی سے آدمی جل جائے۔ مجھے روہنی کے پکڑے جانے کا افسوس تھا۔ مگر اس وقت مجھے اپنی جان کی فکر پڑی ہوئی تھی۔ روہنی نے کہا تھا اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو تم میری فکر نہ کرنا اور جان بچا کر سیدھا جے پور کے ویران قلعے میں پہنچنا وہاں آدھی رات کے بعد دُرگا کی بدروح آئے گی اسے بتانا کہ پجاری رگھو نے روہنی کو اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور اس سے گن گن کر بدلے لے گا اور ایسی جگہ دفن کر دے گا جہاں سے شاید وہ قیامت تک باہر نہ نکل سکے گی۔

اب مجھے متھرا شہر سے جے پور جانا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک چھوٹے سے سانپ کی حیثیت سے میں یہ طویل سفر کیسے طے کروں گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں انسانوں کی طرح دیکھ سکتا تھا، انسانوں کی طرح سوچ سکتا تھا، مجھے سردی گرمی کا احساس نہیں تھا۔ مگر میں غیبی حالت میں نہیں تھا۔ لوگ مجھے دیکھ سکتے تھے اور سانپ اور انسان کی دشمنی شاید ازل سے چلی آرہی ہے۔ آدمی جہاں کسی سانپ کو دیکھتا ہے اسے مارنے دوڑتا ہے۔ دوسری مشکل یہ تھی کہ میں صرف رینگ سکتا تھا انسانوں کی طرح چل نہیں سکتا تھا اور انسانوں کی طرح ٹرین میں سوار ہو کر جے پور نہیں پہنچ سکتا تھا۔ مجھے سانپ کی طرح رینگ رینگ کر متھرا شہر سے جے پور پہنچنا تھا جو اس حالت میں مجھے ایک ناممکن بات دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے تو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ جے پور کی طرف کون سی سڑک جاتی ہے۔

اگر مجھے سڑک کا علم بھی ہو جاتا تو ایک چھوٹے سے سانپ کے لئے اتنے لمبے سفر میں قدم قدم پر موت کا خوف موجود تھا۔ اس علاقے میں بندر عام تھے۔ راستے میں جنگل بھی پڑتے تھے۔ اگر جنگل میں کسی بندر کی مجھ پر نظر پڑ گئی تو وہ میری تکا بوٹی کر سکتا تھا۔ راستے میں گاؤں بھی آتے تھے۔ کسی آدمی کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو وہ سانپ



سانپ کا شور مچا دے گا۔ لوگ لاٹھیاں پکڑ کر میرے پیچھے دوڑیں گے اور مجھے مار کر ہی دم لیں گے۔ میرے لئے متھرا سے جے پور تک قدم قدم پر موت منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ میں شمشان گھاٹ کے علاقے سے نکل آیا تھا اور اب ایک کھیت کی مینڈھ پر متھرا شہر کی دور سے دکھائی دینے والی روشنیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کروں۔ میرے لئے ریلوے سٹیشن کا راستہ معلوم کرنا ہی مشکل تھا۔ میں انسانوں کی آواز میں بول کر کسی کو اپنا دُکھڑا نہیں سنا سکتا تھا۔ میں صرف پھنکار سکتا تھا اور سیٹی بجا کر بات کر سکتا تھا۔ روہنی اس لئے میری زبان سمجھ لیتی تھی کہ وہ ایک بدروح تھی اور بدروحیں دنیا کے تمام کیڑے مکوڑوں کی بھی بولی سمجھ لیتی ہیں۔ میرے ساتھ یہی ایک سہولت تھی کہ میں اندھیرے میں بھی دیکھ سکتا تھا۔ سانپ اندھیرے میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کون سا راستہ ریلوے سٹیشن کو جاتا ہے۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اگر میں ریلوے سٹیشن پہنچ بھی گیا تو ٹرین میں کیسے سوار ہوں گا۔ سٹیشن پر تو روشنیاں ہوں گی وہاں تو لوگ مجھے آسانی سے دیکھ لیں گے اور مجھے ایک سیکنڈ میں کچل دیں گے۔ روہنی نے ایک اور بڑی خوفناک بات کہی تھی۔ اُس نے کہا تھا اگر تمہیں کسی نے کچل دیا، مار دیا تو تم مرو گے نہیں بلکہ غائب ہو جاؤ گے اور غائب ہونے کے ایک گھنٹے یا ایک دن بعد یا تو اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہو جاؤ گے یا پھر دوبارہ سانپ کی شکل میں ظاہر ہو جاؤ گے۔

میں ان پریشان خیالات میں الجھا کھیتوں میں سے رینگتا ہوا ایک میدان میں نکل آیا۔ میں نے گردن اٹھا کر ایک جانب دیکھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر ریلوے سگنل کی سرخ بتی نظر آئی۔ میں نے سوچا اگر میں ریلوے لائن پر پہنچ کر ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ اپنا سفر شروع کر دوں تو ایک نہ ایک دن جے پور پہنچ جاؤں گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ مجھے یہ کیسے پتہ چلے گا کہ یہ ریل کی پٹڑی جے پور کی طرف ہی جاتی ہے۔ متھرا سے

جے پور جاتے ہوئے راستے میں آگرہ کا بڑا شہر آتا ہے اور وہاں سے جے پور کے لئے ریلوے لائن بدلنی پڑتی ہے۔ اگر بالفرض محال میں آگرہ تک پہنچ بھی جاتا ہوں تو مجھے کون بتائے گا کہ فلاں ریلوے لائن جے پور کی طرف جاتی ہے۔ میں سخت مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میری عقل جواب دے گئی تھی۔ صرف ایک خدا کا سہارا ہی تھا اور میں دل میں اسی سے مدد کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ جھاڑیوں، سرکنڈوں اور سوکھی گھاس میں رینگتے رینگتے آخر میں سگنل کی سرخ بتی کے قریب پہنچ گیا۔

ریلوے لائن زمین سے اونچی تھی۔ میں اوپر آگیا۔ میں نے دیکھا کہ میری بائیں جانب دور متھرا ریلوے سٹیشن کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ دائیں جانب ریل کی پٹڑی دور تک چلی گئی تھی۔ میں نے آسمان پر نگاہ ڈالی اور تاروں کی مدد سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ پچھم یعنی جنوب کس طرف ہے۔ کیونکہ متھرا سے شمال کی جانب دلی تھا اور جنوب کی طرف آگرہ تھا جہاں سے مشرق کی جانب جے پور کے لئے ریلوے لائن بدلتی تھی۔ اگر دن کا وقت ہوتا تو مجھے سورج سے اندازہ ہو سکتا تھا کہ شمال جنوب کس طرف ہے مگر رات کے وقت کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔

آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ کسی جگہ چھپ کر مجھے سورج نکلنے کا انتظار کرنا چاہئے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جنگلی جھاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ میں ایک جھاڑی میں گھس کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ میں کہاں سے چلا تھا اور کہاں آگیا ہوں۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد میں سے بھی کسی نے تصور تک نہیں کیا ہو گا وہ انسان سے سانپ بن جائے گا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرا ذہن انسانوں کی طرح کام کر رہا تھا۔ مجھے اپنے بچپن کے بمبئی والے دوست جمشید کا خیال آگیا۔ اگر وہ مجھے اس عالم میں دیکھ بھی لے تو اسے کبھی یقین تو کیا خیال بھی نہیں آسکتا کہ یہ جو چھوٹا سا سانپ جھاڑیوں میں سمٹ کر بیٹھا ہوا ہے یہ اس کا دوست فیروز ہے۔ لیکن میں اس چکر میں پھنس چکا تھا۔ میں نے اپنی حماقت سے بدروحوں کے چھتے کو چھیڑ دیا تھا اور اب



بدروحیں میرے پیچھے پڑ چکی تھیں۔

اگر میرا ذہن بھی سانپ کا ذہن ہو گیا ہوتا تو مجھے صبح کے انتظار کی کوفت نہ اٹھانی پڑتی کیونکہ سانپوں کو قدرت نے وقت کے احساس کی صلاحیت نہ ہونے کے برابر دی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سانپ سردیوں کے موسم اپنے بل میں پڑے پڑے بڑے سکون سے گزار دیتے ہیں۔ انہیں وقت کے گزرنے کا زیادہ احساس نہیں ہوتا مگر میرا ذہن انسان کا ذہن تھا مجھے وقت کے ایک ایک پل کے گزرنے کا احساس ہو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں جھاڑیوں میں سے نکل کر آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو دیکھ لیتا تھا کہ صبح ہوئی ہے یا نہیں.....

ایک بار میں آسمان کو دیکھنے جھاڑی سے باہر نکلا تو میں نے دیکھا کہ سگنل کی بتی جو پہلے سرخ تھی اب سبز ہو گئی ہے۔ اس کا مطلب تھا کہ سٹیشن کی طرف سے کوئی ٹرین آنے والی تھی۔ میں یونہی ٹرین دیکھنے کے لئے وہیں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دور سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں نے سٹیشن کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھا انجن کی ہیڈ لائٹ کی روشنی نظر آئی جو آہستہ آہستہ قریب ہوتی جا رہی تھی۔ پھر انجن کی چھک چھک کی آواز بھی آنے لگی۔ ابھی انڈیا میں ڈیزل ٹرینوں کا رواج نہیں ہوا تھا اور کوئلوں سے چلنے والے انجن چلتے تھے۔ مجھے زمین کی تھرتھراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

ٹرین قریب آگئی تھی۔ میں جلدی سے جھاڑیوں میں گھس گیا اور انجن شور مچاتا، دھڑدھڑاتا زمین کو ہلاتا تیزی سے گزر گیا اور پھر ٹرین گزرنے لگی۔ زمین کی اتنی تھرتھراہٹ میں نے انسان کے روپ میں ٹرین گزرتے وقت کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ٹرین گزر گئی۔ شور اور تھرتھراہٹ آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور ایک بار پھر رات کا سناٹا چھا گیا۔

آخر خدا خدا کر کے آسمان پر دن کا اُجالا نمودار ہونا شروع ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد سورج طلوع ہو گیا۔ سورج کے طلوع ہونے کے بعد میں ریلوے پٹڑی پر آگیا۔

اور سورج کی طرف دیکھ کر اندازہ لگایا کہ جنوب کا رُخ کس جانب ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ رات کو جو ٹرین گزری تھی وہ جنوب کی طرف ہی جا رہی تھی اور آگرہ شہر بھی اسی طرف تھا۔ چنانچہ میں ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ جنوب کے رُخ پر چل پڑا۔

مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ میں کتنی دیر تک رینگتا رہا۔ اتنا ضرور دیکھ لیا تھا کہ میں متھرا شہر سے کافی دور نکل آیا تھا۔ پہلے میری دونوں جانب کھیت تھے اب جنگلاتی علاقہ شروع ہو گیا تھا۔ آخر میں رینگتے رینگتے تھک گیا۔ سورج آسمان پر کافی اوپر آ چکا تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں ذرا دم لینے کے لئے ایک جھاڑی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ کنڈلی مار کر بیٹھا تھا۔ اپنا چھوٹا سا سر نیچے کئے ہوئے تھا۔ پتہ نہیں پندرہ منٹ گزرے تھے کہ ایک گھنٹہ گزر گیا تھا، مجھے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ آواز قریب آ رہی تھی۔ شاید یہ آدمی ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے۔ جب وہ قریب آئے تو مجھے ان کی گفتگو سنائی دینے لگی۔ ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ”یہاں کچھ ہے۔“

دوسرے نے کہا۔ ”مجھے بھی ایسے لگ رہا ہے۔“

پہلے کی آواز آئی۔ ”بڑا انمول کیڑا لگتا ہے۔“

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں اور کس انمول کیڑے کی بات کر رہے ہیں کہ اچانک مجھے بین کی آواز آنے لگی۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ سپیرے ہیں اور انہوں نے میری بو سونگھ لی ہے اور اب مجھے پکڑنا چاہتے ہیں۔ میں نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی تو مجھے محسوس ہوا کہ میں خواہش کے باوجود بھاگ نہیں سکتا تھا بھاگنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ بین کی آواز نے مجھ پر ایک جنون کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ میرا ذہن ضرور انسان کا تھا لیکن میرا جسم سانپ کا تھا اور سانپ کے کان نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے جسم کے مساموں سے سنتا ہے۔ میرے جسم کے مساموں پر بین کی آواز کا اثر ہونے لگا تھا۔ میرا جی بے اختیار جھومنے کو چاہ رہا تھا۔



بین کی لے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ میرا سر اپنے آپ اُوپر کو اُٹھ گیا اور چھوٹا سا پھن بھی خود بخود کھل گیا اور میں بین کی آواز پر جھومنے لگا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مجھے ایسے لگا جیسے کوئی چھڑی سے جھاڑی کی شاخوں کو اِدھر اُدھر ہٹا رہا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سپیرا ہے اور مجھے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں اس کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانا چاہتا تھا مگر میرے جسم نے میرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ بین کی آواز پر اسی طرح جھوم رہا تھا۔ بین کی آواز نے مجھ پر جادو سا کر دیا تھا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ بین کی آواز پر مست ہو کر میں جھاڑی سے باہر نکل آیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک سپیرا بیٹھا بین بجا رہا ہے اور دوسرا اس کے پاس بیٹھا ہے۔ اس نے پٹاری کھول کر سامنے رکھی ہوئی ہے اس کے ہاتھ میں کپڑا ہے جیسے ہی میں جھومتا ہوا جھاڑی سے باہر نکلا دوسرے آدمی نے مجھ پر کپڑا پھینکا اور ہاتھ سے پکڑ کر اٹھا لیا اور پٹاری میں ڈال کر پٹاری کا منہ بند کر دیا۔

یہ ایک مصیبت پر دوسری مصیبت نازل ہو گئی تھی مگر میں مجبور تھا سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پٹاری کے اندر گرتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ پٹاری میں پہلے سے ایک سانپ موجود ہے۔ پٹاری میں گھپ اندھیرا تھا مگر میں اس اندھیرے میں ایک نسواری رنگ کے سانپ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر آہستہ سے پھنکار ماری اور سانپوں کی زبان میں پہلا سوال ہی یہی کیا۔ ”تم کون ہو؟“

میں نے سانپوں کی زبان میں ہی کہا۔ ”تم دیکھ رہے ہو۔ میں بھی ایک سانپ ہوں۔“

نسواری سانپ نے کہا۔ ”تم سانپ نہیں ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”اگر سانپ نہیں ہوں تو پھر میں کیا ہوں؟“

نسواری سانپ نے کہا۔ ”تم انسان ہو۔ تمہیں کسی نے جادو کے زور سے سانپ بنا دیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ’’اگر تمہیں پتہ چل ہی گیا ہے تو میرے بھائی میں واقعی سانپ نہیں ہوں انسان ہوں اور ایک جادوگر نے مجھ پر جادو کر کے مجھے سانپ بنادیا ہے۔‘‘

نسواری سانپ نے پوچھا۔ ’’تم ریل کی پٹڑی کے پاس کیا کر رہے تھے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’جے پور اپنے مرشد کے پاس جانا چاہتا تھا کیونکہ وہی جادو کا اثر ختم کر کے مجھے پھر سے سانپ کی جون سے انسان کی شکل میں واپس لا سکتے ہیں۔‘‘

نسواری سانپ بولا۔ ’’جے پور تو یہاں سے بہت دور ہے تم تو وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بس میں اسی پریشانی میں جھاڑی میں چھپ کر بیٹھا تھا کہ جے پور کیسے پہنچوں گا کہ سپیرے نے اپنی بین سے مجھے مست کر کے پکڑ لیا۔‘‘

نسواری سانپ کہنے لگا۔ ’’تمہارا پکڑا جانا تمہارے حق میں اچھا ثابت ہوا ہے۔‘‘

’’یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟‘‘ میں نے پوچھا۔

نسواری سانپ بولا۔ ’’یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ یہ سپیرے جے پور ہی جا رہے ہیں۔‘‘

نسواری سانپ کی زبان سے یہ سن کر میں خوش ہو گیا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ویران محل میں دُرگا کی بدروح سے ملاقات کر سکوں گا اور وہ اپنے جادو کے زور سے مجھے سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں واپس لے آئے گی۔ امید کی جو شمع میرے دل میں بجھ چکی تھی وہ پھر سے روشن ہو گئی تھی۔

میں نے نسواری سانپ سے کہا۔ ’’لیکن دوست...... جے پور پہنچ کر میں اس پٹاری سے کیسے باہر نکلوں گا؟ یہ سپیرے تو مجھے کبھی آزاد نہیں کریں گے۔ یہ تو کہہ رہا ہے کہ ہمیں بڑا انمول سانپ مل گیا ہے۔‘‘

نسواری سانپ کہنے لگا۔ ’’اس کی تم فکر نہ کرو۔ ایک انسان دوسرے انسان کے کام آئے چاہے نہ آئے لیکن ایک سانپ دوسرے سانپ کی ضرور مدد کرتا ہے۔ میں



تمہاری مدد کروں گا اور تمہیں جے پور پہنچنے کے بعد کسی نہ کسی طرح پٹاری سے باہر نکال دوں گا۔‘‘

سپیرے نے مجھے پٹاری میں بند کرنے کے بعد پٹاری تھیلے میں ڈال کر تھیلا کندھے سے لٹکا لیا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ سپیرا پیدل چلا جا رہا ہے۔ نسواری سانپ نے ان دونوں کو باتیں کرتے کہیں سن لیا تھا کہ وہ جے پور جا رہے ہیں جہاں کوئی میلہ تھا اور ان سپیروں نے وہاں سانپ کا تماشہ دکھانا تھا۔

کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد سپیرے شاید کسی سٹیشن پر آ گئے تھے کیونکہ مجھے وہاں کسی شنٹ کرتے انجن کی آواز سنائی دی تھی۔ یہاں سے دونوں سپیرے ٹرین میں سوار ہو گئے اور ٹرین کا سفر شروع ہو گیا۔ راستے میں انہوں نے کہیں سے گاڑی بدلی ہو گی مجھے اس کا علم نہیں کیونکہ میں پٹاری میں بند تھا۔ نسواری سانپ سارا راستہ مجھ سے پوچھتا رہا کہ وہ جادوگر کون تھا اور کہاں رہتا تھا جس نے مجھے انسان سے سانپ بنا دیا تھا۔ میں نے اسے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا کہ وہ کوئی سپیرا ہی لگتا تھا۔ میں نے اس کے ایک سانپ کو مار ڈالا تھا اس نے غصے میں آ کر مجھے انسان سے سانپ بنا کر چھوڑ دیا کہ جا اب ساری زندگی تو سانپ بنا رہے گا۔

آخر ہم لوگ جے پور پہنچ گئے۔ دونوں سپیرے ایک جگہ آ گئے جہاں میلہ لگا ہوا تھا۔ میلے کے شور و غل اور بچوں اور غبارے بیچنے والوں کی آوازیں مجھے پٹاری میں سنائی دے رہی تھیں۔ نسواری سانپ نے مجھے کہا۔ ’’یہاں یہ سپیرے تماشا دکھائیں گے۔ تم موقع پا کر بھاگ جانا اور یہ لوگ ہزار بین بجائیں تم ہرگز نہ رکنا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’مگر میں کیا کروں۔ مجھ پر بین کا بہت زیادہ اور بڑی جلدی اثر ہو جاتا ہے۔‘‘

نسواری سانپ ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ’’پھر تمہیں رات کے وقت جب سپیرے سو رہے ہوں گے فرار ہونا چاہئے۔‘‘

دن بھر سپیرے میلے میں گھوم پھر کر سانپ کا تماشہ دکھاتے رہے۔ انہوں نے مجھے پٹاری سے صرف ایک دو بار ہی باہر نکالا اور سپیرے نے مجھے پکڑے ہی رکھا زمین پر نہ چھوڑا خدا جانے کیوں میں اُسے انمول سانپ لگا تھا اور اسے خطرہ تھا کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں۔

رات ہو گئی۔ سپیرے ایک جگہ سو گئے۔ باہر کی آوازیں خاموش ہو گئیں۔ میں نے نسواری سانپ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے رات ہو گئی ہے۔''

نسواری سانپ نے کہا۔ ''سپیروں کی نیند ذرا اور گہری ہو جائے پھر تمہیں باہر نکالوں گا۔''

جب نسواری سانپ کو یقین ہو گیا کہ سپیرے اب گہری نیند سو رہے ہیں تو اس نے کہا۔ ''میرے ساتھ مل کر زور لگاؤ۔''

ہم نے اپنے سر پٹاری کے ڈھکن کے اندر کی جانب لگائے اور اسے اوپر کی طرف دھکیلنا شروع کر دیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد پٹاری کا ڈھکن ایک طرف سے تھوڑا سا اٹھ گیا۔ نسواری سانپ مجھ سے بڑا تھا۔ اس نے اپنا سر اندر ڈال کر ڈھکنے کو اور زیادہ اٹھا دیا اور بولا۔ ''جاؤ۔ باہر نکل جاؤ۔''

میں ٹیڑھے ڈھکنے میں سے رینگ کر نکل گیا۔ پٹاری کپڑے کے تھیلے میں بند تھی۔ پٹاری سے نکل کر میں کپڑے کے تھیلے میں سے رینگ کر باہر آ گیا۔ باہر آ کر میں نے دیکھا کہ آسمان پر تارے نکلے ہوئے تھے۔ سپیرے ایک جھیل کے کنارے درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ میں چھوٹے سائز کا تھا بڑی تیزی کے ساتھ ان کے قریب سے نکل کر جھیل کے کنارے کنارے رینگنے لگا۔ مجھے جے پور کے ویران محل میں پہنچنا تھا۔ اگرچہ میرا ذہن انسان کا تھا مگر میرے اندر سانپ کی تمام خصوصیات پیدا ہو چکی تھیں مثلاً میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا اور بہت دور سے کسی بو کو یا نمی کو محسوس کر لیتا تھا۔ سانپ میں ایک اور خاص بات بھی ہوتی ہے کہ قدیم تاریخی



عمارتوں کے کھنڈروں کی بو بہت پسند کرتا ہے اور ان کھنڈروں اور پرانے قلعوں کی بو اسے کئی میل سے آ جاتی ہے۔ میں جھیل کے ساتھ ساتھ رینگتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک مجھے ہوا کے جھونکے کے ساتھ کسی ویران قلعے کے کھنڈر کی نم دار بو محسوس ہوئی۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ دُرگا بدروح والے ویران محل کی ہی بو ہے لیکن میں نے بو کا تعاقب شروع کر دیا کہ وہاں چل کر معلوم ہو جائے گا کہ یہ وہی ویران محل ہے یا کوئی اور ہے۔ رات کا وقت تھا اور یہ شہر کے باہر کا علاقہ تھا۔ ہر طرف خاموشی اور اندھیرا تھا۔ شہر کی روشنیاں بائیں جانب کافی فاصلے پر تھیں پرانے محل کے کھنڈر کی بو مجھے ایک ویران محل کے پاس لے آئی۔ میں نے دیکھا کہ محل کے باہر چوکیدار پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے فوراً اسے پہچان لیا یہ دُرگا بدروح کا آسیبی محل ہی تھا جو بھارت کے محکمہ آثار قدیمہ کی تحویل میں تھا۔ میں محل میں داخل ہو گیا۔ میں راستے سے واقف تھا۔ روہنی بدروح مجھے جس راہداری سے لے کر دُرگا بدروح کے تہہ خانے میں لے گئی تھی میں اس راہداری میں آ گیا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد..... ویران قلعے کے اندر اس ویران محل کی خاموشی سے ویسے ہی خوف سا محسوس ہوتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دُرگا بدروح آدھی رات کو وہاں آیا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ابھی آدھی رات نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر رات آدھی سے زیادہ گزر چکی اور دُرگا بدروح وہاں آ کر جا بھی چکی ہو گی تو میں وہیں چھپ کر دوسری رات کا انتظار کروں گا۔

اب میری نجات دُرگا بدروح کے پاس ہی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے بدروح مالینی کا بتایا ہوا چار لفظوں کا منتر یاد تھا جس کو پڑھ کر میں سانپ سے انسان کے روپ میں آ سکتا تھا۔ مگر اس میں خطرہ صرف اس بات کا تھا کہ انسان کی بجائے میں کسی دوسرے جانور، درندے یا دوبارہ کسی بڑے سانپ کے روپ میں بھی ظاہر ہو

سکتا تھا۔ مالینی کے سامنے جب میں منتر پڑھ کر چمگادڑ کے روپ میں آیا تھا تو مالینی بدروح میرے سامنے بیٹھی تھی اور میری نگرانی کر رہی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ میں چمگادڑ کے روپ میں ظاہر ہوں۔ لیکن اب میں اکیلا تھا اور روہنی نے بھی مجھے اس منتر کے خطرناک نتائج سے آگاہ کر دیا تھا۔ یہ منتر تو میں صرف اس وقت ہی پڑھ سکتا تھا جب میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہ ہو۔

میں راستہ تلاش کرتے کرتے آخر ویران محل کے اس تہہ خانے میں آ گیا جہاں دُرگا کی بدروح اُس روز ظاہر ہوئی تھی۔ تہہ خانے میں موت کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گھپ اندھیرا تھا مگر سانپ ہونے کی وجہ سے مجھے اندھیرے میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ محرابی ستونوں کے درمیان جہاں اُس روز دُرگا کی بدروح ظاہر ہوئی تھی اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں تہہ خانے کے ایک کونے میں کنڈلی مار کر بیٹھا بڑے غور سے محرابی ستونوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ شاید وہاں دُرگا کی بدروح نمودار ہو جائے۔ کچھ ہی دیر کے بعد مجھے عجیب سی ڈراؤنی آواز سنائی دی۔ میں چوکنا ہو گیا۔ ڈراؤنی آواز دُور سے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ کسی عورت کی آواز تھی اور ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اس عورت کو آگ میں زندہ جلا رہا ہے۔ پھر ایک خوفناک چیخ بلند ہوئی۔

میں اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کانپ گیا۔

چیخ کی آواز خاموش ہو گئی لیکن اس کی بازگشت دیر تک سنائی دیتی رہی۔ ایک بار پھر سناٹا چھا گیا۔ اچانک محرابی ستونوں کے درمیان دھوئیں کا ایک ستون نمودار ہوا۔ میں اسے دیکھنے لگا۔ دھوئیں کے ستون نے ایک عورت کی شکل اختیار کر لی۔ میں نے اُسے پہچان لیا۔ یہ دُرگا کی بدروح تھی۔ اس نے اپنی بیٹھی ہوئی ڈراؤنی آواز میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں جانتی ہوں تم یہاں کس لئے آئے ہو۔ مگر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''



میں نے سانپ کی آواز میں کہا۔ ''دُرگا! اپنے بھگوان کے لئے میری مدد کرو۔ میں عجیب مصیبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ روہنی کو پجاری رگھو پکڑ کر لے گیا ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔''

دُرگا کی بدروح نے کہا۔ ''میں جانتی ہوں وہ کہاں ہے مگر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

میں نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔ ''دُرگا! تم روہنی کی بچپن کی سہیلی ہو۔ روہنی نے مجھے خاص طور پر کہا تھا کہ اگر اس کو پجاری رگھو اپنے قبضے میں کر لے تو میں تمہارے پاس آ کر تمہیں سارے واقعات بیان کروں۔ اُس نے کہا تھا کہ تم ہی میری اور اس کی مدد کر سکتی ہو۔''

دُرگا کی بدروح بولی۔ ''روہنی پوری بدروح نہیں ہے۔ اگر وہ پوری بدروح ہوتی تو اُسے پجاری رگھو کی طلسمی طاقت کا ضرور اندازہ ہوتا مگر وہ پجاری رگھو کی طاقت سے واقف نہیں تھی۔ میں روہنی کی بھی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر تم روہنی کی مدد نہیں کر سکتیں تو کم از کم مجھے اس عذاب سے نجات دلاؤ اور مجھے سانپ سے دوبارہ انسانی شکل میں لے آؤ اس کے بعد میں خود روہنی کی تلاش کا کوئی راستہ نکال لوں گا۔''

دُرگا کی بدروح نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم بار بار یہ بات نہ دہراؤ۔ میں نے تمہیں کہہ دیا ہے کہ تمہاری مدد کرنا میری طاقت سے باہر ہے۔''

میں پریشان ہو گیا کیونکہ اگر دُرگا بدروح میری مدد نہیں کر سکتی تھی تو پھر کوئی میری مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے کہا۔ ''دُرگا! پھر میں کیا کروں؟ میں ساری زندگی سانپ بن کر نہیں گزار سکتا۔''

دُرگا بولی۔ ''تمہارے پاس مالینی کا دیا ہوا چار لفظوں کا منتر ہے۔ وہ پڑھو تم سانپ نہیں رہو گے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ میں نہ جانے کس روپ میں ظاہر ہو جاؤں گا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ میں بالکل ہی غائب ہو جاؤں اور دوبارہ کبھی اپنی انسانی شکل میں واپس نہ آسکوں۔''

دُرگا بدروح نے جواب دیا۔ ''یہ خطرہ بہت زیادہ ہے۔''

دُرگا کی بدروح خاموش ہو گئی۔ میں بھی خاموش ہو گیا۔ کچھ سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں اور کس سے مدد طلب کروں۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دُرگا کی بدروح نے کہا۔ ''میں تمہیں آخری بات کہتی ہوں۔''

''وہ کیا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

دُرگا نے کہا۔ ''میرے محل کی چھت پر ایک بارہ دری ہے۔ اس بارہ دری میں بیٹھ کر اپنا پھن کھولو اور مالینی کے بتائے ہوئے اگنی منتر کو دل میں دوبار پڑھو اور اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کر دو۔ جو تمہاری قسمت میں ہے تمہیں مل جائے گا۔ جاؤ تمہارے لئے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔''

اتنا کہہ کر دُرگا کی بدروح ایک بھیانک چیخ کی آواز کے ساتھ دھوئیں کے ستون میں تبدیل ہو گئی اور پھر یہ ستون بھی غائب ہو گیا۔ یہ بدروح مجھے ایک زبردست کشمکش میں چھوڑ گئی تھی۔ اگر میں مالینی بدروح کا اگنی منتر پڑھتا ہوں اور اپنی شکل میں ظاہر نہ ہوا تو خدا جانے کس رُوپ میں ظاہر ہو جاتا ہوں۔ اگر اگنی منتر پڑھنے کا خطرہ مول نہیں لیتا ہوں تو پھر ساری زندگی مجھے سانپ بن کر ہی رہنا ہو گا۔ ویران محل کے تہہ خانے میں کنڈلی مار کر بیٹھا دیر تک سوچتا رہا کہ کیا کروں کیا نہ کروں۔ اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں دنیا میں اکیلا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہوں۔ روہنی جو میری ہمدرد تھی اور ہر مشکل وقت میں میرے کام آتی تھی وہ بھی میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ مالینی بدروح کا مجھے ایک جملہ یاد آرہا تھا۔ اُس نے کہا تھا۔ ''میرا چار لفظی اگنی منتر پڑھنے کے بعد تمہارے چمگادڑ سے انسان کی شکل میں واپس آنے کا صرف ایک



اصد امکان ہو گا۔''

مجھے اس خرافاتی اگنی منتر سے خوف آنے لگا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی پڑے گا۔ سوچ سوچ کر جب میں کسی نتیجے پر نہ پہنچا تو میں نے تنگ آکر اگنی منتر پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری حالت اس شخص کی سی تھی جسے رات کی تاریکی میں پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گرایا جا رہا ہو۔ اگر دریا میں گرا تو بچ گیا، اگر پتھروں پر گرا تو چکنا چور ہو گیا۔ میں نے دل میں خدا کو یاد کیا اور تہہ خانے میں سے نکل کر بڑے کمرے میں آگیا۔ یہاں سے ایک زینہ ویران محل کی چھت کو جاتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ رینگتے ہوئے زینہ طے کیا اور محل کی چھت پر آگیا۔ محل کی چھت سنسان پڑی تھی۔ رات تاریک تھی۔ آسمان پر ستارے ایسے ٹمٹما رہے تھے جیسے بجھنے ہی والے ہوں۔ میں نے چھت پر ایک نگاہ ڈالی۔ چھت کے وسط میں مجھے ایک چھوٹی سی بارہ دری نظر آئی یہی وہ بارہ دری تھی جہاں بیٹھ کر مجھے دُرگا بدروح کی ہدایت کے مطابق اگنی منتر پڑھنا تھا۔

O

اس بارہ دری میں میری زندگی بھی تھی اور میری موت بھی تھی۔ میں بارہ دری کی طرف رینگنے لگا۔ بارہ دری کے پاس آ کر رُک گیا۔ ایک بار سوچنے لگا کہ واپس چلا جاؤں پھر خیال آیا کہ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں اپنی اصلی انسانی شکل میں واپس آ جاؤں۔ میرے دل کو تھوڑا سا حوصلہ ہوا اور میں بارہ دری پر چڑھ گیا۔ بارہ دری کا فرش اکھڑا ہوا تھا۔ میں فرش کے درمیان کنڈلی مار کر بیٹھ گیا لیکن ابھی میں نے اگنی منتر پڑھنے کے لئے اپنا پھن نہیں کھولا تھا۔ میرے اندر سے کوئی چیز مجھے اگنی منتر پڑھنے سے بار بار روک رہی تھی۔ میرا دماغ مجھے بار بار کہہ رہا تھا فیروز تمہارے سامنے یہی ایک دروازہ کھلا ہے باقی تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ تمہیں آج نہیں تو کل، کل نہیں تو ایک سال بعد، دس سال بعد اِدھر اُدھر سے گھوم پھر کر پھر اسی دروازے کے پاس آنا ہے۔ زندگی میں تم نے بڑے بڑے داؤ لگائے ہیں۔ یہ داؤ بھی لگا کر دیکھ لو۔ ہو سکتا ہے تم جیت جاؤ۔ مجھے یقین ہو گیا کہ سوچنے کا وقت گزر چکا ہے۔ میں نے فوراً اپنا سانپ والا پھن کھول دیا اور دل میں اگنی منتر کو دو دفعہ پڑھ ڈالا۔

اس لمحے میری جو حالت ہوئی اُسے بیان کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میری آنکھیں کھلی تھیں۔ سانپ کی آنکھیں کھلی رہتی ہیں کیونکہ اس کے پپوٹے نہیں ہوتے۔ وہ اپنی آنکھیں نہ جھپک سکتا ہے نہ بند کر سکتا ہے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں مگر مجھے نظر آنا آہستہ آہستہ بند ہو رہا تھا۔ پھر اچانک میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا جیسے میری آنکھوں کے آگے سیاہ پردہ گرا دیا گیا ہو۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرے اِردگرد تیز آندھیاں چل رہی ہیں۔ شور و غل اور چیخ و پکار کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ میرا دل کانپ رہا تھا۔ میں نے بارہ دری سے بھاگنا چاہا مگر مجھ پر یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ میں ایک دم پتھر کا ہو گیا ہوں۔ میرا جسم اتنا بھاری ہو گیا تھا کہ کوشش کے باوجود میں اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کر سکا۔

پھر ایسے لگا جیسے ویران محل کی بارہ دری مجھے ساتھ لے کر نیچے ہی نیچے زمین کے



اندر چلی جا رہی ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا اور تاریکی ہی تاریکی تھی۔ میرے کانوں میں شاں شاں کی آوازیں گونج رہی تھیں جیسے میرے آس پاس طوفانی آندھیاں چل رہی ہوں۔ مجھے باقاعدہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں ابھی تک سانپ کی شکل و صورت میں ہی ہوں۔ ابھی میری کایا کلپ نہیں ہوئی اور ابھی مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ لیکن میری چھٹی حس مجھے آگاہ کر رہی تھی کہ میرے ساتھ کچھ ہونے والا ہے، کچھ ہو رہا ہے۔ میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میں اندھیرے میں دیکھ سکتا تھا مگر یہ اندھیروں کا اندھیرا تھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے سنائی دینا بھی بند ہو گیا۔ اب مجھے نہ کچھ نظر آ رہا تھا، نہ سنائی دے رہا تھا میں جیسے اندھیروں اور سناٹوں کے خلا میں معلق ہو گیا تھا۔ میری صرف سوچنے کی قوت ابھی باقی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ میرے ساتھ یہ سب کیا کچھ ہو رہا ہے۔ پھر میری سوچنے کی طاقت بھی جواب دینے لگی۔ میرے ذہن پر بے ہوشی سی طاری ہو گئی۔ میں نے بڑی کوشش کی، بڑی مدافعت کی، بڑی مزاحمت کی، اپنی ساری قوتِ ارادی صرف کر دی مگر میرے ذہن نے میری سوچنے کی اہلیت نے میرا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ مجھ پر پہلے ایک غنودگی سی طاری ہوئی پھر غنودگی کا احساس بھی ختم ہو گیا۔ شاید میری موت واقع ہو گئی تھی لیکن موت کو محسوس کرنے کے لئے بھی ایک احساس کی ضرورت ہوتی ہے اور میرا یہ احساس بھی ختم ہو چکا تھا۔ شاید یہ موت سے بھی کچھ آگے کی کیفیت تھی۔ شاید میں موت سے بھی آگے نکل گیا تھا۔

یہ کیفیت مجھ پر کب تک طاری رہی؟ میں اس حالت میں کب تک رہا؟ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ جب میں اپنے ہوش و حواس میں آیا تو سب سے پہلے جو تبدیلی میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ میں اپنے انسانی جسم میں واپس آ چکا تھا۔ یہ میرے لئے خوشی کا انتہائی مقام تھا۔ میں پوری طرح سے ہوش میں تھا۔ میں کسی سخت چیز پر بالکل سیدھا پڑا ہوا تھا۔ میرے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اب چونکہ میں سانپ نہیں رہا تھا

اس لئے اندھیرے میں دیکھ نہیں سکتا تھا اور یہ معلوم نہیں کر سکتا تھا کہ میں کہا
ہوں۔ اگنی منتر پڑھنے کے بعد میں خوش قسمتی سے اپنی انسانی شکل میں واپس آگیا تھا
مگر میں کس جگہ نمودار ہوا تھا؟ یہ مجھے علم نہیں تھا۔ میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا۔ میرا جسم ٹھنڈا تھا۔ جسم پر ہاتھ پھیرنے
مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ میں اپنے کپڑوں یعنی پتلون قمیض میں نہیں ہوں بلکہ میرا
کسی چادر میں لپٹا ہوا ہے۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے لیٹے لیٹے گھٹنے اوپر اٹھانے چا
تو میرے گھٹنے پوری طرح سے اٹھنے سے پہلے ہی اوپر چھت سے ٹکرائے۔ میں
گھبرا کر ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر چھت کو ٹٹولا۔ مجھ پر گویا بجلی سی گری۔ میں لکڑی کے
تابوت میں بند تھا اور جس کپڑے میں میرا جسم لپٹا ہوا تھا وہ چادر نہیں تھی بلکہ و
کفن تھا۔ دہشت سے میرا گلا خشک ہو گیا۔

تو کیا میں مر چکا ہوں؟ مگر نہیں۔ میں زندہ تھا۔ تو پھر مجھے کفن میں لپیٹ
تابوت میں کیوں بند کیا گیا تھا؟ میرے حلق سے ایک چیخ نکل گئی۔ میں نے زور
سے تابوت کی دیواروں اور چھت کو ہاتھوں سے پیٹنا شروع کر دیا۔ بہت جلد
معلوم ہو گیا کہ میرا تابوت کسی قبر میں دفن ہے اور اسے پیٹنے اور چیخنے چلانے کا کو
فائدہ نہیں۔ یا خدا! یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ اس سے تو بہتر تھا کہ میں اگنی
پڑھنے کے بعد چمگادڑ بن جاتا، سانپ ہی بن جاتا کم از کم آزاد تو ہوتا۔ زندہ درگو
نہ ہوتا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ باہر سے کوئی میری مدد کو نہیں آئے گا اور میں اگر
کچھ دیر تابوت میں بند پڑا رہا تو دم گھٹنے سے مر جاؤں گا تو میں نے اپنے ہوش و حوا
قابو میں کیا اور اُس زندہ قبر سے بچ نکلنے کا کوئی طریقہ سوچنے لگا۔ کوئی طریقہ سمجھ
نہیں آ رہا تھا سوائے اس کے کہ میں ناخنوں سے تابوت کی چھت کو ایک جگہ
کریدنے لگا لیکن بہت جلد میرے ہاتھ تھک گئے اور تابوت کی چھت پر کوئی ا



ہوا۔ بادلوں کی دھیمی گرج سنائی دی جیسے دور کسی پہاڑی وادی میں سے آئی ہو۔ پھر
مجھے اپنے اوپر زمین پر بارش کے قطروں کی آواز آنے لگی۔ اوپر زمین پر بارش شروع
ہو گئی تھی۔ اپنی بے بسی دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے لرزتے
ہوئے ہونٹوں سے خدا کے حضور دعا مانگی کہ یا اللہ پاک مجھے اس مصیبت سے نکال لے
آئندہ میں ایسی کوئی حماقت نہیں کروں گا جس کی وجہ سے میں کسی عذاب میں پھنس
جاؤں۔''

تابوت کے اندر اب میرا دم گھٹنا شروع ہو گیا تھا۔ مجھے پوری طرح سے سانس
لینے میں دقت ہو رہی تھی مگر میں نے حوصلہ نہ ہارا اور ایک بار پھر تابوت کی چھت کو
زور زور سے پیٹنے لگا کہ شاید میری آواز سن کر باہر سے کوئی میری مدد کو آ جائے۔ مگر
بہت جلد میرا سانس پھول گیا اور میں بے دم ہو گیا۔ زمین کے اوپر سے بارش کی ہلکی
ہلکی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ خدا جانے مجھے میری قبر میں کتنی گہرائی میں دفن کیا گیا
تھا۔ مگر یہ لوگ کون تھے جنہوں نے مجھے زندہ دفن کر دیا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ
میں مر گیا تھا اور قبر میں دفن ہونے کے بعد زندہ ہو گیا تھا یا پھر میں مرا نہیں تھا مجھ پر
سکتہ طاری ہو گیا تھا اور مجھے مرا ہوا سمجھ کر قبر میں دفن کر دیا گیا تھا اور قبر میں دفن
ہونے کے بعد میرا سکتہ دور ہو گیا اور میں ہوش میں آ گیا تھا۔

اب یہ سب کچھ سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں قبر میں
زندہ دفن تھا یا مردہ حالت میں دفن ہونے کے بعد زندہ ہو گیا تھا اور اگر پہلے نہیں مرا
تھا تو اب کچھ دیر کے بعد میرا دم گھٹنے سے مر جانا یقینی تھا۔ جیسے بھی ہو مجھے باہر نکلنے کی
کوشش کرنی چاہئے تھی۔ اچانک مجھے خیال آ گیا کہ کیوں نہ میں ایک بار پھر بدروح
مالینی کا اگنی منتر دہراؤں؟ ہو سکتا ہے میں منتر پڑھنے کے بعد خواہ جانور کی شکل میں ہی
سہی لیکن قبر سے باہر ظاہر ہو جاؤں گا اور اگر سانپ کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہوں تو
سانپ بن کر میں تابوت کے کسی سوراخ میں سے نکل کر قبر کی مٹی میں راستہ بنا کر باہر

نکل سکتا ہوں۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کیں اور اگنی منتر کو دل میں دو بار دہرایا۔ میرے تابوت کو جیسے ایک دھچکا سا لگا اور میں نے جلدی سی آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا کہ میں اسی طرح انسانی شکل میں تابوت میں پڑا تھا۔ میں نے سوچا شاید میں نے گھبراہٹ میں منتر ٹھیک سے نہیں دہرایا۔ میں نے فوراً آنکھیں بند کرلیں اور اس دفعہ اگنی منتر کے ایک ایک لفظ کو دو دو بار دہرایا۔ جیسے ہی میں نے منتر ختم کیا میرے تابوت کو پھر ایک دھچکا لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ میں اسی طرح تابوت میں پڑا تھا۔

میں نے چھ سات مرتبہ آنکھیں بند کر کے اگنی منتر پڑھا مگر ہر بار تابوت کو دھچکا لگتا اور میں دیکھتا کہ تابوت میں ہی لیٹا ہوا ہوں۔ میں سمجھ گیا کہ قبر کے اندر اگنی منتر کا اثر ختم ہو چکا ہے اور مجھے اپنے طور پر ہی قبر سے نکلنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ اتنے میں میرے کفن پر تابوت کی چھت پر سے پانی کے قطرے گرنا شروع ہو گئے۔ باہر بارش ہو رہی تھی اور یہ بارش کا پانی تھا جو قبر کے اندر داخل ہو کر تابوت کی درزوں میں سے میرے اُوپر گر رہا تھا۔ کچھ قطرے میرے منہ پر بھی گرے۔ میں نے ہاتھ سے اپنا چہرہ صاف کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ پانی میں مٹی ملی ہوئی تھی۔ اب میں نے یہ کیا کہ دونوں ہتھیلیوں کو تابوت کی چھت کے ساتھ لگا اپنے جسم کا پورا زور لگا کر چھت کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی لیکن تابوت پر سینکڑوں من مٹی پڑی ہوئی تھی۔ تابوت کی چھت تو سیمنٹ کے لینٹر کی طرح سخت ہو چکی تھی۔ شاید آپ میری بے بسی کا اندازہ نہیں لگا سکتے کیونکہ آپ کبھی اس ہولناک تجربے سے نہیں گزرے۔ خدا کسی کو ایسی آزمائش میں نہ ڈالے۔ یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ آدمی زندہ بھی نہیں ہوتا اور مرتا بھی نہیں۔ کاش میں ڈرگا بدروح کے کہنے میں آکر اگنی منتر نہ پڑھتا اس سے تو ہزار درجے بہتر تھا کہ میں سانپ بن کر ہی ساری زندگی گزار دیتا کم از کم زندہ انسانوں کی دنیا میں زندہ تو رہتا۔



قبر کی مٹی میں ملے ہوئے بارش کے پانی کے قطرے تابوت میں سے میرے اوپر مسلسل گر رہے تھے۔ تابوت کے اندر میں نے اچانک یہ تبدیلی محسوس کی کہ میرا دم گھٹنا بند ہو گیا تھا مگر میں زیادہ گہرا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ میں ایسے سانس لے رہا تھا جیسے آدمی لمبی دوڑ لگانے کے بعد ہانپ رہا ہو۔

یہ بڑی تکلیف دہ حالت تھی۔ پھر باہر سے بارش اور بادلوں کے گرجنے کی آوازیں آنا بند ہو گئیں۔ ایک بار پھر وہی ہولناک سناٹا دوبارہ چھا گیا۔ اس موت کے سناٹے میں تابوت کی درزوں میں سے رکے ہوئے پانی کے قطروں کے گرنے کی ٹپ ٹپ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد یہ آواز بھی خاموش ہو گئی۔ میں اسی طرح چھوٹے چھوٹے سانس لے رہا تھا۔ تابوت میں سخت مایوسی اور کسمپرسی کی حالت میں لیٹا خدا سے اپنے گناہوں کی معافیاں مانگ رہا تھا۔

پھر ایسا ہوا کہ مجھے تابوت میں اپنے پاؤں کی طرف سے ہلکی ہلکی ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی۔ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ شاید یہ کوئی مردار خور جانور تھا جو میرے پاؤں کی طرف سے قبر کھود کر اندر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ خوف سے میرے جسم کا رُواں رُواں کھڑا ہو گیا۔ کیا یہ مردار خور مجھے مردہ سمجھ کر کھانے کی کوشش کرے گا؟ مگر میں تو زندہ ہوں۔ لیکن مردار خور جانور کو کیسے پتہ چلے گا کہ میں مردہ نہیں ہوں۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر اس نے اپنے نوکیلے دانتوں سے تابوت کی لکڑی توڑ کر میرے پاؤں کو چبانے کی کوشش کی تو میں زور زور سے جتنی ٹانگیں چلا سکتا ہوں چلا کر اسے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کروں گا۔ ہو سکتا ہے وہ ڈر کر بھاگ جائے۔ میرے دل میں اُمید کی شمع روشن ہو گئی۔

جس سوراخ میں سے مردار خور لگڑ بگڑ یعنی مردار خور جانور میرے تابوت تک پہنچا ہو گا میں اسے بھگا کر اس سوراخ میں سے باہر نکلنے کی جدوجہد کر سکتا ہوں لیکن قبر کا سوراخ میرے پاؤں کی جانب ہو گا۔ پاؤں کی جانب میں کیسے رینگ سکوں گا؟ اگر یہ

سوراخ تابوت میں میرے سر کی جانب ہوتا تو میں الٹا ہو کر کہنیوں کے بل رینگ کر قبر سے باہر نکلنے کی کوشش کر سکتا تھا۔ لیکن ٹھک ٹھک کی آواز میرے پاؤں کی طرف سے آرہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد یہ آواز آنی بند ہو گئی۔ میں نے کان اس آواز پر لگائے ہوئے تھے۔ آواز کے خاموش ہونے کے بعد پھر وہی سکوت چھا گیا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ آواز کیسی تھی اور اب خاموش کیوں ہو گئی ہے۔

اچانک میرے پاؤں پر کوئی چیز آکر گری۔ میں نے گھبرا کر پاؤں سمیٹنے چاہے لیکن میرے دونوں پاؤں کسی شکنجے میں بڑی سختی سے جکڑے گئے تھے۔ میں نے اپنے پاؤں کھینچنے کی سر توڑ کوشش کی مگر میرے پاؤں تابوت کے اندر ایک انچ بھی نہ ہلے۔ میں یہی سمجھا کہ مردار خور جانور نے تابوت کی لکڑی توڑ کر میرے دونوں پاؤں اپنے جبڑوں میں دبوچ لئے ہیں۔

لیکن مجھے مردار خور درندے کے نوکیلے دانت بالکل محسوس نہیں ہو رہے تھے بلکہ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دونوں پاؤں ٹخنوں تک لوہے کے کسی شکنجے میں جکڑ دیئے گئے ہیں۔ میں نے پاؤں کو پیچھے کھینچنے کی کوشش کی تو مجھے سخت تکلیف محسوس ہوئی۔ میں نے اپنا آپ چھوڑ دیا اور خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا..... پھر ایسا ہوا کہ میرا جسم تابوت کے اندر پاؤں کی جانب سے کسی نے باہر کی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ مارے دہشت کے میرے حلق سے چیخ نکل گئی لیکن قبر میں بند تابوت کے اندر میری چیخ میرے ہی کانوں سے ٹکرا کر رہ گئی۔ میرا کفن پوش جسم تابوت میں آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف کھسک رہا تھا۔ اگر یہ کوئی مردار خور درندہ نہیں تھا تو پھر یہ کون تھا جو میرے پاؤں کو شکنجے میں جکڑ کر مجھے تابوت سے باہر کھینچ رہا تھا۔ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا کہ جو کچھ میرے ساتھ ہو رہا تھا اسے ہونے دوں اور یہ دیکھوں کہ اس کے بعد میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میرا جسم تابوت میں سے کھسکتے ہوئے باہر نکل گیا تھا اور اب قبر کے کسی گول



سوراخ میں سے باہر لے جایا جا رہا تھا۔

میرے اوپر مٹی گرنے لگی تھی۔ میں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر اوپر کئے تو میرے ہاتھ ایک فٹ کی اونچائی پر قبر کے سوراخ کی چھت سے ٹکرائے۔ یہ سوراخ اتنا ہی چوڑا تھا کہ کسی مردے کی لاش اس میں سے کھینچ کر نکالی جا سکتی تھی۔ اب مجھے اوپر کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ میرے پاؤں اوپر اور سر نیچے ہو گیا تھا۔ تابوت قبر کے اندر کافی گہرائی میں دفن کیا گیا تھا۔ مجھے باہر سے آتی تازہ ہوا محسوس ہونے لگی تھی اور میرا سانس معمول پر آ گیا تھا۔ پھر میں قبر سے باہر آ گیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر سب سے پہلے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا کہ مجھے قبر میں سے کس نے کھینچ کر نکالا ہے۔ عجیب قسم کی سیاہی مائل دھندلی دھندلی روشنی میں مجھے نہ تو کوئی مردار خور جانور نظر آیا نہ کوئی انسان ہی دکھائی دیا۔ میرے پاؤں کا شکنجہ بھی غائب ہو چکا تھا۔ میں حیران ہو رہا تھا کہ مجھے تاریک قبر میں سے کون گھسیٹ کر لایا ہے اور یہ جگہ کون سی ہے۔ میں زمین پر پڑا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنا جائزہ لیا۔ میرا جسم واقعی کفن میں لپٹا ہوا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں سے خشک کافور کی بو آرہی تھی۔ یہ بو مجھے تابوت کے اندر بھی آئی تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ میں مر گیا تھا اور مجھے مردوں کی طرح غسل دے کر کفن پہنا کر تابوت میں بند کر کے قبر میں دفن کر دیا گیا تھا۔

مگر یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان کا رنگ سیاہ تھا اور تارے کہیں کہیں لال لال انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ ایسے ستارے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔ آس پاس کوئی انسان یا جانور تک نظر نہیں آتا تھا۔ کسی چڑیا تک کے بولنے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ یا اللہ! یہ میں کہاں آگیا ہوں۔ یہ کون سی دنیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو ہاتھ لگا کر دیکھا۔ میرا جسم بالکل صحیح حالت میں تھا مگر ٹھنڈا تھا جیسے

مردے کا جسم ہوتا ہے۔ میں نے دونوں ہتھیلیوں کو زور سے رگڑا مگر میرے ہاتھ پھر بھی برف کی طرح ٹھنڈے ہی رہے۔ سیاہی مائل دھندلی روشنی میں مجھے اِرد گرد کچھ قبریں نظر آئیں۔ ہر قبر کے پاؤں کی جانب گہرے شگاف تھے۔ ایسے لگتا تھا کہ ان شگافوں میں سے قبروں کے مردے کھینچ کر باہر نکالے گئے تھے۔

اچانک مجھے اپنی بائیں جانب سے واویلے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے اس طرف دیکھا۔ ایک آدمی دوڑتا چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا اور اس کا چہرہ اور سارا جسم خون میں لت پت تھا۔ وہ بڑی دردناک آواز میں رو رہا تھا اور کہے جارہا تھا۔ ''مجھے بچالو۔ مجھے بچالو۔ میں نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو مار ڈالا ہے۔ مجھے بچالو.....''

جب خون میں لہولہان دوڑتا ہوا میرے قریب سے گزرا تو یہ دیکھ کر میرا دل کانپ اٹھا کہ اس آدمی کی کھوپڑی کا ایک حصہ غائب تھا۔ شاید اس نے کنپٹی پر پستول کی نالی رکھ کر اپنے آپ کو گولی ماردی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس کی آدھی کھوپڑی اڑ چکی ہے پھر بھی وہ زندہ ہے اور بھاگتا چلا جارہا ہے۔ کچھ دور جاکر وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

اس کے بعد پھر واویلے کی آوازیں آنے لگیں۔

میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ ایک عورت جس کے بال کھلے ہیں اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے پیٹتی بھاگی چلی آرہی ہے اور رو رو کر کہے جارہی ہے۔ ''میں نے زہر کھالیا ہے۔ مجھے بچالو۔ میرے بیٹے مجھے بچالو۔ میں نے زہر کھالیا ہے۔ ہائے۔ مجھے بچالو.....''

جب وہ میرے قریب سے گزری تو میں نے دیکھا کہ اس کے منہ، ناک اور کانوں سے نیلے رنگ کا خون بہہ رہا تھا اور اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔

میں سرخ انگاروں ایسے ستاروں والے سیاہ آسمان کے نیچے پھٹی ہوئی قبروں کے



پاس حیران پریشان بیٹھا تھا اور یہ سوچ سوچ کر مزید پریشان ہو رہا تھا کہ میں یہاں سے کیسے بھاگوں اور کس طرف کو جاؤں۔ کبھی لگتا کہ میں ڈراؤنے خوابوں کی دنیا میں آگیا ہوں۔ کبھی لگتا کہ نہیں میں خواب نہیں دیکھ رہا۔ خواب اور حقیقت کی دنیا میں جو فرق ہوتا ہے میں اسے واضح طور پر محسوس کر رہا تھا۔ یہ خواب کی دنیا نہیں تھی لیکن کوئی ایسی دنیا تھی کہ جس کا زندہ انسانوں کی دنیا سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا اور یہ حقیقت کی دنیا ڈراؤنے خوابوں کی دنیا سے بھی زیادہ ہولناک اور دہشت خیز دنیا تھی۔

مجھے کچھ سرگوشیوں کی آوازیں سنائی دیں۔

میں نے دیکھا کہ سفید لباس والے انسانوں کا ایک گروہ دور سے میری طرف آ رہا تھا۔ وہ مجھ سے کافی دُور تھے مگر ان کی سرگوشیوں کی آوازیں مجھے بالکل قریب سے سنائی دے رہی تھیں۔ میں ٹکٹکی باندھے ان کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ قریب آئے تو میں نے دیکھا کہ ان سب نے کفن پہن رکھے تھے اور ہر ایک کے کفن پر خون کے بڑے بڑے سرخ دھبے پڑے ہوئے تھے۔ اُن کے سر جھکے ہوئے تھے اور وہ سرد آہیں بھر رہے تھے۔ وہ بڑی آہستہ آہستہ چل رہے تھے اور ایسے چل رہے تھے جیسے کوئی انہیں دھکیل رہا ہو..... یہ آدمی مجھ سے چار قدم کے فاصلے پر آکر رک گئے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ اپنے جھکے ہوئے سر اس انداز سے ہلاتے تھے جیسے پچھتا رہے ہوں کہ ایسا انہوں نے کیوں کیا۔

ان میں سے ایک آدمی نے گردن اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر تک مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر اُس نے ایک سسکی بھری اور خشک آواز میں کہا۔ ''تم بھی چلو۔ دروازہ کھلنے والا ہے۔''

اس کے زرد چہرے پر ویرانی برس رہی تھی۔ اس کے بعد سسکیاں بھرتے، آہیں بھرتے، افسوس کے ساتھ اپنے سروں کو بار بار ہلاتے وہاں سے گزر گئے اور کچھ دور جانے کے بعد رات کی سیاہی مائل دھند میں روپوش ہوگئے۔

میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ کون تھے اور مجھے کہاں چلنے کے لئے کہہ رہے تھے اور کون سا دروازہ کھلنے والا تھا۔ میں اسی الجھن میں تھا کہ جیسے کسی نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھادیا اور آگے کو دھکیلا۔ میں اپنے آپ جس طرف روتے ہوئے انسانوں کا گروہ گیا تھا اس طرف چلنے لگا۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنی مرضی سے نہیں چل رہا اور کوئی غیبی طاقت مجھے زبردستی آگے کو دھکیل رہی ہے۔ ایک دوبار میں نے رکنے کی کوشش کی مگر میرے قدم نہ رکے اور میں آہستہ آہستہ چلتا گیا جیسے آدمی خواب میں چلتا ہے۔ آگے سرمئی دھند کا بہت بڑا غبار آ گیا۔ میں اس غبار میں داخل ہو گیا۔ ایک دم سے عورتوں کی چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ میں نے ڈر کر پیچھے کی طرف بھاگنا چاہا مگر میں ایسا نہ کر سکا اور میرے قدم آہستہ آہستہ آگے کو ہی اٹھتے رہے۔

عورتوں کی چیخ و پکار اتنی ڈراؤنی ہو گئی کہ میرا ٹھنڈا جسم کانپنے لگا۔ میں آگے ہی آگے چلتا چلا گیا۔ چیخ و پکار کی آوازیں آہستہ آہستہ غائب ہو گئیں، خاموش ہو گئیں۔ سرمئی دھند کا غبار ختم ہوا تو گہرے سیاہ رنگ کا غبار شروع ہو گیا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کالی سیاہ گھٹا زمین پر اُتر آئی ہے۔ میں اپنے آپ اس گہرے سیاہ غبار میں داخل ہو گیا۔ سیاہ غبار میں داخل ہوتے ہی میرا دم گھٹنے لگا۔ میں منہ کھول کر تیز تیز سانس لینے لگا۔ میں نے بیٹھنا چاہا مگر بیٹھ نہ سکا۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر بھاگ نہ سکا۔ میں نے چیخنا چاہا مگر میرے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ میں جیسے زہریلے دھوئیں کے غبار میں سے گزر رہا تھا۔ سانس رکنے کی وجہ سے میرے جسم کو جھٹکے لگنے لگے۔ مجھے لگا میرا سینہ پھٹنے والا ہے۔ پھر اچانک زہریلے دھوئیں کا غبار ختم ہو گیا اور میں پورا سانس لینے لگا۔ اب مجھے اپنے اِرد گرد کچھ اور لوگ بھی نظر آئے۔ دھند میں یہ لوگ سایوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے اور سر جھکائے ایک ہی طرف کو آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ مجھ سے آگے نکل گئے اور میں اُن کے پیچھے رہ گیا۔

ہم ایک پہاڑی کی طرف جا رہے تھے جس کی چوٹی پر آگ کے شعلے بلند ہو رہے



تھے۔ میں خوف اور دہشت کی حدود سے بھی آگے نکل چکا تھا۔ میرے ٹھنڈے جسم کے بعد میرا دماغ بھی سن ہو کر جیسے ساکت ہو گیا تھا۔ اب نہ مجھ پر خوف کا اثر ہوتا تھا نہ دہشت کا اثر ہوتا تھا۔ میں خود خوف اور دہشت کی علامت بن گیا تھا۔ اس وقت مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں واقعی ایک مردہ لاش ہوں اور کوئی اپنی مرضی سے مجھے ایک طرف لئے جا رہا ہے۔

میرے آگے آگے جو لوگ سروں کو جھکائے بوجھل قدم اٹھاتے چلے جا رہے تھے وہ اندھیرے میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے اندھیرا انہیں نگل رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی مگر میرے جسم پر میرا کوئی اختیار نہیں رہا تھا۔ میرا جسم ایک لاش کی طرح اپنے آپ چل رہا تھا۔ میں اس تاریک غبار کے قریب پہنچ گیا جہاں لوگ اندھیرے میں غائب ہوتے نظر آ رہے تھے۔ یہ پہاڑی کے اندر کسی غار کا دہانہ تھا۔ لوگ اس غار میں داخل ہو رہے تھے۔ مجھے بھی کسی غیبی طاقت نے غار کے اندر دھکیل دیا۔ غار میں ہر طرف سے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان میں عورتوں کے رونے کی آوازیں بھی تھیں، مردوں کے رونے کی آوازیں بھی تھیں۔ دہشت کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ میں ایسے لرز رہا تھا جیسے تیز ہوا میں ٹہنی کے ساتھ لگا ہوا خشک پتا لرز رہا ہوتا ہے۔

چیخوں کی آوازیں ہمارے دائیں بائیں غار میں سے آ رہی تھیں۔ ایک بار پھر میرا دم گھٹنے لگا۔ میرے آگے جو لوگ جا رہے تھے ان کے بھی دم گھٹنے لگے تھے۔ مجھے ان کے تیز تیز سانسوں کے چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرا سانس بھی دھونکنی کی طرح چلنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی غار میں آگے کسی مقام پر ایک دروازہ کھل گیا۔ مجھے اس دروازے میں سے آگ کے شعلے لپکتے دکھائی دیئے۔ لوگوں کے گروہ سسکیاں بھرتے، ہچکیاں لیتے آگ کے شعلوں میں گرنا شروع ہو گئے۔ مجھے بھی کوئی نظر نہ آنے والی طاقت آگ کے شعلوں کی طرف دھکیلے لئے جا رہی تھی۔ لپکتے ہوئے شعلے

میرے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ موت مجھے ایک قدم کے فاصلے پر نظر آنے لگی تھی۔ موت کی دہشت نے میرے ہوش و حواس معطل کر دیئے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دیا..... اسی وقت اچانک مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا۔ پہلے میں اسے شعلوں کی تپش سمجھا لیکن فوراً بعد مجھے اپنی گردن پر کسی کے گیلے ہونٹوں کا لمس محسوس ہوا اور پھر کسی نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھے غار کی دیوار کی طرف کھینچ لیا۔

ساری فضا جیسے ایک دم بدل گئی تھی۔ قیامت خیز آگ کے شعلوں کی تپش دور ہو گئی تھی۔ میرے چہرے کو تازہ ہوا چھو رہی تھی۔ اندھیرے میں کوئی مجھے کھینچے لئے جا رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ شاید روہنی میری مدد کو آ گئی ہے اور اسی نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا ہے لیکن مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا تھا اور پھر کسی نے میری گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے تھے۔ مجھے یاد آ گیا کہ جب متھرا کے ویران شمشان گھاٹ کی کوٹھڑی میں روہنی مجھے ساتھ لے کر داخل ہوئی تھی تو کوٹھڑی کے کونے میں مٹی کا ایک بھاری مٹکا پڑا تھا جس کا منہ پتھر کی بھاری سل سے ڈھکا ہوا تھا۔ روہنی نے جب مٹکے پر رکھی پتھر کی سل کو ایک طرف ہٹایا تھا تو کوٹھڑی میں ایک ہلکی سی پھنکار کی آواز گونجی تھی اور اس کے بعد مجھے اپنے چہرے پر کسی کا گرم سانس محسوس ہوا تھا اور پھر کسی نے میری گردن کو چوم لیا تھا میں خوف زدہ ہو گیا تھا بعد میں جب میں نے روہنی کو یہ واقعہ سنایا تھا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا اور کہا تھا۔

”شیروان! یہ ایک نوجوان لڑکی کا آسیب تھا جو کوٹھڑی کے مٹکے میں بند تھا اور جو مٹکے کی سل سرکانے کی وجہ سے آزاد ہو گیا تھا۔“

مجھے یہ سب کچھ یاد آ رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ اسی نوجوان لڑکی کا آسیب تھا جس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے موت کے غار سے باہر نکال لیا تھا اور اب مجھے سیاہ



آسمان کے نیچے تاریک فضاؤں میں اپنے ساتھ اڑائے لئے جا رہی تھی۔ وہ مجھے کہاں لئے جا رہی تھی؟

مجھے کچھ خبر نہیں تھی۔

O

آسیبی لڑکی نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

اور میں اس کے ساتھ سیاہ آسمان کی تاریک فضا میں اُڑا چلا جا رہا تھا۔ اتنا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہی آسیبی لڑکی ہے جس نے بھارت کے متھرا شہر کے ویران شمشان گھاٹ کی تاریک کوٹھڑی میں مٹی کے مٹکے میں سے آزاد ہونے کے بعد میری گردن کو اپنے گیلے ہونٹوں سے چوما تھا اور جس کا گرم سانس میں نے اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا اور جس کے بارے میں میری ساتھی روہنی کی بدروح نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کسی لڑکی کا آسیب ہے اور اگر اُس نے تمہاری گردن کو چوم لیا ہے تو تم خوش قسمت ہو کہ اس نے تمہیں پسند کر لیا ہے ورنہ یہ آسیب اتنی خطرناک مخلوق ہے کہ اگر کوئی انسان اس کے قریب چلا جائے تو وہ زندہ نہیں بچتا۔

یہ سن کر میں مزید خوف زدہ ہو گیا تھا کیونکہ اگر کوئی چڑیل کسی انسان سے محبت کرنے لگے تو ظاہر ہے کہ وہ آدمی تو زندہ درگور ہو گیا۔ چڑیل آخر چڑیل ہوتی ہے۔ چڑیل سے کسی خیر کی توقع رکھنی ایسی ہی ہے جیسے کوئی آدمی آتش فشاں کے دھانے سے کھولتے لاوے میں چھلانگ لگا دے اور یہ امید رکھے کہ وہ زندہ بچ جائے گا۔

لیکن اس آسیبی لڑکی نے مجھے پسند کر لیا تھا اور بقول روہنی کے آسیب چڑیل سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ آسیبی لڑکی مجھے کس عذاب میں ڈالنے والی تھی۔ میں پہلے ہی اپنی ایک حماقت کی وجہ سے بدروحوں اور چڑیلوں کے چکر میں اس بری طرح سے پھنس چکا تھا کہ اس چکر سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا



تھا۔ آسیبی لڑکی نے مجھے قبروں کے مُردوں سے تو بچا لیا تھا لیکن کنوئیں سے نکال کر یہ خود مجھے کس گڑھے میں پھینکنے والی تھی؟ اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا۔

خدا جانے یہ کس دنیا کا آسمان تھا۔ تارکول کی طرح کالا سیاہ تھا اور ستارے سرخ انگاروں کی طرح دہک رہے تھے۔ ہر طرف سیاہ غبار پھیلا ہوا تھا لیکن میں سانس آسانی سے لے سکتا تھا۔ فضا ایسی تھی کہ کبھی سرد ہو جاتی تھی اور کبھی گرم ہو جاتی تھی۔ اس ڈراؤنی تاریک رات میں آسیبی لڑکی کے ساتھ پرواز کرتے ہوئے دو تین بار مجھے ایسے لگا جیسے کوئی شے شوں کی آواز کے ساتھ میرے قریب سے گزر گئی ہو۔

اندھیرے میں مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ میری اُنگلی میں روہنی کی دی ہوئی انگوٹھی موجود تھی جس کے بارے میں روہنی نے کہا تھا کہ جب تک یہ انگوٹھی تمہارے ہاتھ میں ہے تمہیں کوئی چڑیل یا بدروح نقصان نہیں پہنچا سکے گی لیکن یہ لڑکی کوئی چڑیل تو نہیں تھی لیکن چڑیل سے زیادہ خطرناک تھی۔

میں اس خوفناک بلکہ دہشت ناک آسیبی لڑکی کے ساتھ سیاہ آسمان کی تاریک فضاؤں میں اڑا جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ فیروز شاہ تم کہاں سے چلے تھے اور کہاں سے کہاں آ گئے ہو۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے توہمات میں پھنس جاؤں گا مگر اب بری طرح پھنس چکا تھا اور خدا کی ذات ہی مجھے اس عذاب سے باہر نکال سکتی تھی۔

آہستہ آہستہ تاریک فضا چھٹنے لگی تھی اور پھر کچھ دور جا کر تاریکی پھیکے نسواری رنگ کی دھند میں بدل گئی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ آسیبی لڑکی مجھے نیچے لے جا رہی ہے۔ آخر ہم اس نسواری دھند سے بھی باہر نکل آئے۔ اب میں نے دیکھا کہ رات کا وقت ہے۔ نیلے آسمان پر ستارے چمک رہے ہیں۔ یہ مجھے اپنی دُنیا کا آسمان لگتا تھا۔ نیچے نگاہ ڈالی تو مجھے ایک ریل گاڑی جاتی دکھائی دی۔ کم از کم اس بات کی مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ میں بدروحوں اور چڑیلوں کی دنیا سے نکل کر انسانوں کی دنیا میں

واپس آ گیا تھا۔

اچانک ایک خیال بجلی کی چمک کی طرح میرے ذہن میں لہرا گیا۔

میں نے سوچا کہ اس وقت روہنی کی بدروح میرے ساتھ نہیں ہے وہی مجھے فرار ہونے سے روکا کرتی تھی۔ اب موقع ہے میں آسیبی لڑکی کو کسی نہ کسی جگہ دھوکا دے کر فرار ہو سکتا تھا یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کوئی بہانہ بنا کر میں ایک منٹ کے لئے اس سے الگ ہو جاتا ہوں اور پھر کسی طرح بمبئی اپنے بچپن کے دوست جمشید کے پاس پہنچ جاؤں گا۔

اس وقت آسیبی لڑکی جو مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی مجھے ساتھ لئے نیچے گزرتی ریلوے لائن کے اوپر اڑ رہی تھی۔ اس دوران آسیبی لڑکی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں اسے دیکھ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ غیبی حالت میں تھی۔ مجھے صرف اس کے ہاتھ کی گرفت محسوس ہو رہی تھی۔ اس گرفت میں سختی تھی۔ یہ کسی لڑکی کے ہاتھ کی گرفت نہیں لگتی تھی۔

میں اس انتظار میں تھا کہ دیکھتا ہوں یہ نئی مصیبت مجھے کہاں لے کر جاتی ہے اس کے ہاتھ کی مضبوط گرفت سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بلا اتنی آسانی سے مجھے چھوڑنے والی نہیں ہے جس وقت آسیبی لڑکی مجھے لے کر اڑی تھی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی غائب ہو گیا تھا اور مجھے اپنا جسم نظر نہیں آ رہا تھا اپنی دنیا کے چمکیلے ستاروں والے آسمان کی فضا میں آ کر میں نے دوبارہ اپنا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ میرا جسم غائب ہے۔ یہ ایک عجیب تجربہ تھا۔

مجھے اپنے جسم کا پورا شعور تھا۔ مجھے اپنے جسم کے سارے اعضاء محسوس ہو رہے تھے۔ میں سن رہا تھا، میں دیکھ رہا تھا۔ فرق صرف اس بات کا تھا کہ مجھے اپنے جسم کا بوجھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اب ہمارے نیچے سے کسی شہر کی روشنیاں گزرنے لگیں۔ ٹرین نے دو تین بار وسل دیا۔ شاید سٹیشن قریب آ رہا تھا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے



آسیبی لڑکی سے پوچھ ہی لیا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور یہ کون سا شہر ہے؟ آسیبی لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک جگہ بہت سی روشنیاں تھیں۔ یہ اسی شہر کا ریلوے سٹیشن تھا۔ ٹرین سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ ہم سٹیشن کے اوپر سے گزر گئے۔

مجھے روہنی کا خیال آنے لگا۔ یہ تو آپ پڑھ چکے ہیں کہ روہنی کو بھارت کے شہر متھرا کے ویران شمشان گھاٹ میں اُس کے اور میری جان کے دشمن پجاری رگھو کی بدروح نے اس وقت اپنے طلسم کی طاقت سے اغوا کر لیا تھا جب روہنی نے رگھو کو ہلاک کرنے کے لئے اس پر اپنے سب سے طاقتور منتر کے ذریعے حملہ کیا تھا۔ وہ پجاری رگھو کی طلسمی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکی تھی اور رگھو نے اسے اپنے قبضے میں کر کے غائب کر دیا تھا اور اسے اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ پجاری رگھو کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ شہزادی روہنی جس کا نام اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے خاوند نے سلطانہ رکھ دیا تھا اسے دوبارہ اپنے قبضے میں کر لے۔ پجاری رگھو، روہنی کو ہلاک کر چکا تھا اور یہ روہنی کی بدروح تھی جس کو میں نے رانی بائی کے قلعے میں اس مرتبان کو کھول کر آزاد کر دیا تھا جس میں رگھو نے اسے سالہا سال سے بند کر رکھا تھا۔

پجاری رگھو اس لئے میرا دشمن ہو گیا تھا کہ میں نے روہنی کی بدروح کو آزاد کر دیا تھا۔ پجاری رگھو کی بدروح مجھ سے اس کا بدلہ لینے کے لئے مجھے ہلاک کر کے میری روح کو بھی کسی جگہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دینا چاہتی تھی۔ مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ روہنی کس حال میں ہے اور پجاری رگھو اسے کہاں لے گیا ہے۔

روہنی نے پجاری رگھو کو ہلاک کرنے کی کوشش سے پہلے مجھے سمجھا دیا تھا کہ اگر میں رگھو کو ہلاک کرنے میں ناکام ہو گئی اور اس نے مجھے اپنے قبضے میں کر لیا تو تم جے پور شہر کے پرانے محل کی حویلی میں جا کر میری پرانی سہیلی درگا کی بدروح سے ملنا اور اسے بتانا کہ رگھو مجھے پکڑ کر لے گیا ہے۔ روہنی نے یہ بھی کہا تھا کہ۔ ”اس حالت میں صرف میری سہیلی درگا ہی میری مدد کر سکے گی۔“

چنانچہ میں اس کے شہر جے پور کے پرانے محل کی حویلی میں آدھی رات کو گیا تھا کیونکہ دُرگا کی بدروح وہاں آدھی رات کے بعد نمودار ہوتی ہے۔ میں نے دُرگا کی بدروح سے ملاقات بھی کی تھی مگر دُرگا بدروح نے کہا تھا۔ ”پجاری رگھو، روہنی کو جہاں لے گیا ہے وہاں میں نہیں جاسکتی۔“

دُرگا کی بدروح نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ تم اپنی خیر مناؤ کیونکہ اب پجاری رگھو تمہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرے گا۔ پہلے روہنی تمہاری حفاظت کرتی تھی اور اس نے تمہیں پجاری رگھو کے قاتلانہ حملوں سے بچایا ہوا تھا۔ اب تم اکیلے رہ گئے ہو۔ پجاری رگھو بڑی آسانی سے تمہیں قتل کر کے تمہاری روح اپنے قبضے میں کر لے گا اس لئے یہاں سے جان بچا کر بھاگ جاؤ۔“

میں نے دُرگا سے یہی کہا تھا کہ اچھا میں چلا جاتا ہوں لیکن میں نے اپنے دل میں کہا تھا کہ پہلے بھی مجھے میرے خدا نے رگھو کی ناپاک سازشوں سے بچایا تھا اور اب بھی میرا خدا ہی میری حفاظت کرے گا کیونکہ زندگی اور موت خدا تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

اس کے بعد میرے ساتھ جو ہیبت ناک واقعات پیش آئے وہ آپ پڑھ چکے ہیں کہ میں کس طرح ایسے مردہ لوگوں کی دنیا میں پہنچ گیا جو نہ مرے ہوئے تھے نہ زندہ تھے۔ یہ وہ بدقسمت لوگ تھے جنہوں نے خودکشی کی تھی جو ہمارے دین میں حرام ہے گویا وہ حرام موت مرے تھے اس لئے ایک عبرت ناک ماحول میں اپنے کئے کی سزا بھگت رہے تھے۔ پھر کس طرح وہ مجھے بھی ساتھ لے کر آگ اُگلتے غار کی طرف بڑھے لیکن آسیبی لڑکی نے مجھے عین موقع پر وہاں سے اٹھا لیا۔ شاید اس لئے کہ میں نے کوئی خودکشی نہیں کی تھی اور میں زندہ تھا۔ آسیبی لڑکی کو میں نے اپنے چہرے پر محسوس ہوتے اس کے گرم سانس اور اپنی گردن پر اس کے گیلے ہونٹوں کو محسوس کر کے پہچان لیا تھا کیونکہ جب ویران شمشان گھاٹ کی اندھیری کوٹھڑی میں میری اس



سے پہلی ملاقات ہوئی تھی تو اسی طرح پہلے میں نے اپنے چہرے پر اس کے گرم سانس کو اور پھر اپنی گردن پر اس کے گیلے ہونٹوں کو محسوس کیا تھا۔

آسیبی لڑکی مجھے اس قبرستان کے زندہ مردوں کی دنیا سے نکال کر میری اپنی انسانوں کی دنیا میں لے آئی تھی اور ابھی ہم فضا میں پرواز کرتے ہوئے کسی شہر کے اُوپر سے گزر رہے تھے۔ شہر کی روشنیاں بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ آسیبی لڑکی فضا میں بائیں طرف کو مڑی اور اس کے بعد وہ ایک دم سے بلند ہونے لگی۔ ہم رات کے اندھیرے میں اتنی بلندی پر آگئے کہ مجھے نیچے زمین پر صرف اندھیرا ہی نظر آ رہا تھا۔ کہیں کہیں دور دور روشنی کا کوئی نقطہ ٹمٹماتا ہوا نظر آ جاتا تھا۔ مجھے نہ تو یہ پتہ تھا کہ کون سا شہر ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور نہ یہ علم تھا کہ آسیبی لڑکی مجھے کہاں لئے جا رہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں بھارت کی سرزمین میں ہوں یا پاکستان کے ملک میں ہوں۔ میں آسیبی لڑکی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے پوچھنے پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں یہی سوچ رہا تھا اور میں نے دل میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ روہنی کی بدروح سے تو میرا پیچھا چھوٹ گیا ہے اب کوشش کر کے اس آسیبی لڑکی سے بھی پیچھا چھڑا کر کسی جگہ سے فرار ہو جاؤں گا اور سیدھا اپنے ملک پاکستان پہنچ جاؤں گا اور پھر کبھی انڈیا کا رخ نہیں کروں گا۔

اس وقت آسیبی لڑکی مجھے لے کر ایک پہاڑی علاقے کے اُوپر سے گزر رہی تھی۔ نیچے اندھیرے میں پہاڑی ڈھلانوں پر کہیں کہیں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پہاڑی علاقے میں داخل ہوئے ہمیں پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ہم نیچے کی طرف اُترنے لگے پھر آسیبی لڑکی نے غوطہ لگایا اور ہم ایک پہاڑی پگڈنڈی پر اُتر پڑے۔ زمین پر میرے پاؤں لگتے ہی مجھے جسم کا بوجھ محسوس ہونا شروع ہو گیا لیکن میں ابھی تک غائب ہی تھا۔ آسیبی لڑکی بھی غائب تھی۔ میرا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”یہ کون سے شہر کا ہل سٹیشن ہے؟“

آسیبی لڑکی اس دفعہ بھی خاموش رہی اور اُس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ آخر میں نے تنگ آ کر کہا۔ ''کیا تم میری زبان نہیں سمجھتی ہو؟''

آسیبی لڑکی کے ہاتھ نے مجھے آہستہ سے جھٹکا دیا۔ میں ڈر گیا تب مجھے احساس ہوا کہ میرے ساتھ کوئی عام دنیاوی مخلوق نہیں ہے بلکہ ایک آسیبی لڑکی ہے۔ ایک لڑکی کا آسیب ہے جو چڑیل سے ایک سو گنا زیادہ خطرناک اور ہلاکت خیز ہوتا ہے۔ روہنی نے مجھے یہی بتایا تھا۔ اس کے بعد میں نے کوئی سوال نہ کیا۔ مجھے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر آسیبی لڑکی کا دماغ پلٹ گیا تو کہیں وہ میری تکا بوٹی نہ کر دے۔

آسمان پر صبح کاذب کی پہلی نیلی نیلی روشنی سی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اس دھندلی روشنی میں میں نے دیکھا کہ ہم ایک پہاڑی قبرستان میں سے گزر رہے تھے۔ ہمارے ارد گرد ٹوٹی پھوٹی قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔ قبروں کے صلیب نما کتبے دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ کرسچین قبرستان ہے۔ تمام قبروں کی حالت خستہ ہو رہی تھی۔ کئی کے تو پتھر اکھڑ کر پرے گرے ہوئے تھے۔ پہاڑی ڈھلان پر نیچے دور تک قبریں چلی گئی تھیں۔ اوپر ایک جانب درختوں کے پیچھے ایک ڈھلواں چھت والی عمارت ابھری ہوئی تھی۔ آسیبی لڑکی اسی عمارت کی طرف جا رہی تھی۔ اس عمارت کی ساخت قدیم زمانے کی کرسچین خانقاہوں جیسی تھی مگر یہ خانقاہ آباد نہیں تھی، انتہائی شکستہ اور ویران حالت میں تھی۔ اس کی دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑ گیا تھا اور نیچے سے پرانی اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں۔

خانقاہ کی چمنی والی مخروطی دیوار اُوپر تک چلی گئی تھی اور اس پر ایک سوکھے ہوئے ٹنڈ منڈ درخت کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہاں خاموشی اتنی گہری تھی کہ لگتا تھا کہ ابھی ابھی یہاں سے کوئی چڑیل گزر کر گئی ہے۔ خانقاہ کے محراب دار دروازے کے دونوں کواڑوں میں سے صرف ایک کواڑ بچا ہوا تھا جو پوری طرح سے بند نہیں تھا۔ اندر اندھیرا تھا۔ آسیبی لڑکی نے خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔



اس کے ہاتھ چھوڑتے ہی میں غیبی حالت سے ظاہری حالت میں واپس آ گیا اور مجھے اپنا جسم نظر آنے لگا۔ مگر آسیبی لڑکی ابھی تک غائب تھی وہ مجھے نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے گردن موڑ کر خانقاہ کے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ ابھی وقت ہے یہیں سے بھاگ جاؤں۔ خدا جانے آسیبی عورت نے کیسے میرے دل کا حال معلوم کر لیا اُس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا مگر اب میں غائب نہیں ہوا تھا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور میں خانقاہ کی راہ داری میں سے گزرتے ہوئے اپنے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ ہر طرف نیم تاریکی میں ایک وحشت خیز ویرانی کا منظر تھا۔ کچھ نظر آ رہا تھا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ خانقاہ مجھے چڑیلوں کا مسکن لگتی تھی۔

آسیبی لڑکی اکھڑے ہوئے پتھروں کا ایک زینہ چڑھنے لگی۔ وہ میرے ساتھ چل رہی تھی مگر مجھے اُس کے قدموں کی چاپ بالکل سنائی نہیں دے رہی تھی جبکہ مجھے اپنے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ زینے کی چھ سات سیڑھیاں تھیں اُوپر ایک اور راہ داری تھی جہاں چھت کے قریب بنے ہوئے روشندان میں سے صبح کے اجالے کی پھیکی پھیکی روشنی خانقاہ کے آسیب زدہ اندھیرے کو دور کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

دائیں جانب ایک کوٹھڑی کا بند دروازہ تھا۔ دروازے پر بھاری تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کوٹھڑی کے پاس آ کر آسیبی لڑکی رُک گئی۔ پھر اس نے مجھے بند دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ میں نے جلدی سے اپنے دونوں ہاتھ چہرے کے آگے کر لئے کہ دروازے سے ٹکرا نہ جاؤں لیکن میں دروازے سے ٹکرایا اور نہ دروازہ کھلا بلکہ میں کوٹھڑی کے اندر تھا۔

یہ کوٹھڑی نہ کشادہ تھی اور نہ چھوٹی تھی۔ اس کی چھت اونچی تھی، ایک لمبی محرابی کھڑکی تھی جو بند تھی۔ کھڑکی کے اوپر چھت کے بالکل قریب ایک روشندان

تھا جس کے آگے پتھر کی جالی لگی ہوئی تھی۔ اس روشندان میں سے صبح کی مدھم سی روشنی اندر آ رہی تھی۔ سامنے والی دیوار میں ایک پرانی طرز کا آتش دان بنا ہوا تھا جو خدا جانے کب سے ٹھنڈا پڑا تھا۔ اپنے جسم میں واپس آنے کے بعد مجھے ٹھنڈ کا احساس ہونے لگا تھا۔

یہ پہاڑی علاقہ تھا۔ یہاں سردی تھی۔ آتش دان کے آگے دونوں جانب دو پرانے گرد آلود بھاری بھر کم وکٹورین زمانے کے صوفے پڑے تھے جن پر گرد جم رہی تھی۔ دوسری دیوار کے ساتھ ایک پلنگ لگا تھا جس پر گدیلا بچھا ہوا تھا اور پائنتی کی جانب دو بھاری کمبل تہہ کر کے رکھے ہوئے تھے۔ سرہانے کی جانب ایک نسواری رنگ کا پرانا گاؤ تکیہ پڑا تھا۔ پلنگ کے قریب ہی دیوار کے ساتھ ہینگر پر ایک کالے رنگ کی برساتی لٹک رہی تھی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا وہ کھردرے کمبل کا بنا ہوا لمبا کوٹ تھا۔ میں نے اسے غور سے دیکھا اس کی وضع قطع ملکہ وکٹوریہ سے بھی پہلے کے زمانے کی تھی۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میں صرف پتلون قمیض میں تھا۔ میں نے کوٹ پہنا تو وہ مجھے بالکل پورا آیا۔ ایسے لگتا تھا کہ کسی نے میرے لئے ہی بنایا تھا۔ لمبا گرم کوٹ پہن لینے سے سردی کا احساس کچھ کم ہوا۔ میں آتش دان کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیسے ہی میں صوفے پر بیٹھا مجھے ایسی آواز آئی جیسے میں کسی بلی کے اوپر بیٹھ گیا ہوں۔ میں گھبرا کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ جھک کر صوفے کو دیکھا مگر وہاں کوئی بلی وغیرہ نہیں تھی۔ یہ شاید پرانا ہونے کی وجہ سے اس کے سپرنگوں کی آواز تھی۔ لگتا تھا کہ سو سال سے اس پر کوئی نہیں بیٹھا۔ اس خیال سے کہ شاید باہر دھوپ نکلی ہوئی ہو اور کھڑکی میں سے کچھ دھوپ شاید کوٹھڑی میں بھی آ جائے میں نے بڑی کوشش کر کے کھڑکی کھول دی۔ باہر دھند کے بادل تیر رہے تھے۔ کھڑکی کے اوپر کسی جنگلی بیل نے چھجہ سا ڈال رکھا تھا۔ کھڑکی میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ان سلاخوں کے درمیان صرف اتنی سی جگہ ہی چھوڑی گئی



تھی کہ میں وہاں سے صرف اپنا ہاتھ ہی باہر نکال سکتا تھا۔ باہر سے سرد ہوا اندر آنے لگی۔

میں کھڑکی بند کر کے تازہ ہوا کو اندر آنے سے نہیں روکنا چاہتا تھا۔ پرانا ہی سہی مگر لمبا گرم کوٹ مجھے مل گیا تھا اس نے کسی حد تک سردی کو روک لیا تھا۔ میں نے کھڑکی کھلی ہی رہنے دی اور آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھ کر کوٹھڑی کے دروازے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ دروازہ اسی طرح بند تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر کی جانب دروازے پر پرانے زمانے کا مضبوط تالا بھی اسی طرح دروازے پر لگا ہوا تھا۔

پھر بھی میں نے اُٹھ کر دروازے کو آہستہ سے اپنی طرف کھینچنا چاہا مگر دروازہ تو جیسے چٹان بنا ہوا تھا اس نے ذرا سی بھی حرکت نہ کی۔ میں مایوس ہو کر آتش دان کے پاس صوفے پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ ظاہر ہے میں ہر حالت میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا مگر بھاگنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اب مجھے بھوک بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ جب روہنی کے ساتھ بھی غائب ہو جایا کرتا تھا یا وہ مجھے غائب کر دیتی تھی تو میری بھوک پیاس معطل ہو جاتی تھی پھر غیبی حالت سے زندہ انسانی حالت میں ظاہر ہوتا تھا تو بھوک اور پیاس دوبارہ واپس آ جاتی تھی مگر وہاں کھانے کو کسی شے کے دستیاب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اس آسیب زدہ کوٹھڑی میں دھکیلنے کے بعد آسیبی لڑکی بھی واپس نہیں آئی تھی۔ اُس نے مجھے کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا اور شاید وہ یہی چاہتی تھی کہ مجھے اپنا قیدی بنا کر بھول جائے۔ میں نے اٹھ کر ایک بار پھر کھڑکی کی سلاخوں کا جائزہ لیا۔ یہ بڑی مضبوط اور موٹے لوہے کی تھیں۔ ان میں سے میں بڑی مشکل کے ساتھ صرف اپنا ہاتھ ہی باہر نکال سکتا تھا۔ میں نے سلاخوں میں سے جھانک کر نیچے دیکھا۔

یہ کوٹھڑی پرانی خانقاہ کی دوسری منزل پر واقع تھی۔ نیچے دھند کی لہریں پھیلی ہوئی تھیں۔ دن نکل چکا تھا مگر سورج کو سرد دھند کے بادلوں نے چھپا رکھا تھا۔ کھڑکی

کے اوپر جنگلی خشک بیل کے سوکھے پتے کسی وقت ہوا کے جھونکے کے ساتھ گرنے لگتے تھے۔ ہوا کا جھونکا گزر جاتا تھا تو پتے گرنا رک جاتے۔ مجھے دروازے والی ویران راہ داری کی طرف سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں جلدی سے آتش دان کی طرف مڑا اور صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ قدموں کی چاپ دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پھر یہ چاپ دروازے کے پاس آ کر رُک گئی۔ میری نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ کوئی باہر سے تالا کھول رہا تھا۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور ایک کبڑی عورت کوٹھڑی میں داخل ہوئی اس نے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کا طشت تھام رکھا تھا۔

کھڑکی میں سے آتی دن کی سرد دھندلی روشنی میں، میں نے دیکھا کہ عورت کے سر کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید ہیں۔ اس کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا ہے اور چلتے ہوئے ہانپ رہی ہے۔ میں ڈر کر صوفے سے اٹھنے لگا لیکن جیسے میری طاقت نے جواب دے دیا۔ میں اپنی جگہ سے ذرا سی بھی حرکت نہ کر سکا۔ کبڑی بڑھیا نے صوفوں کے درمیان جو چھوٹی سی سیاہ لکڑی کی تپائی پڑی ہوئی تھی اس پر طشت رکھ دیا اور واپس چلی گئی۔ اس کے ہانپنے کی آواز نے میرے رونگٹے کھڑے کر دیئے تھے۔

کوٹھڑی میں سے نکلنے کے بعد اس نے دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ میں نے جھک کر دیکھا کہ طشت میں کیا رکھا ہوا ہے۔ لوہے کے ایک پیالے میں پانی تھا، دوسرے پیالے میں ابلے ہوئے چاول تھے۔ لکڑی کا ایک چمچ بھی تھا۔ مجھے اپنے آپ پر دو سو سال پہلے کے زمانے کے یورپ کے قیدی کا گمان ہونے لگا۔ اُس زمانے میں پرانے قلعوں میں بند قیدیوں کو یہی غذا دی جاتی تھی۔ مجھے بھوک لگی ہوئی تھی۔ میں چاول کھانے لگا۔ چاول نمکین تھے۔ میں خاموشی سے چاول کھا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر یہ آسیبی لڑکی مجھے پسند کرتی ہے تو پھر وہ مجھ سے اِس قسم کا قیدیوں والا سلوک کیوں کر رہی ہے؟



چاول کھا کر میں نے پانی پیا اور اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ کوٹھڑی کی سرد فضا میں بیٹھے بیٹھے مجھے سردی لگنے لگی تھی۔ میں نے کھردرے سیاہ کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال رکھے تھے اور کھڑکی کے آگے ٹہل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس گورکھ دھندے سے مجھے کب اور کیسے چھٹکارا ملے گا۔ کچھ دیر کے بعد کوٹھڑی کا دروازہ دوبارہ کھلا اور وہی کبڑی بوڑھی عورت جھکی جھکی چلتی ہانپتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور سیدھی آتش دان کے پاس گئی جہاں خالی برتن پڑے تھے۔

میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے کا پٹ کھلا تھا۔ بھاگ جانے کا سنہری موقع تھا۔ میں ٹہلتے ٹہلتے دروازے کے پاس آ گیا اور ایک دم باہر کی طرف دوڑا۔ جیسے ہی میں دروازے میں سے گزرنے لگا مجھے ایک جھٹکا لگا اور میں پچھاڑ کھا کر پیچھے کو گر پڑا۔ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت بوڑھی عورت خالی برتن لئے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے ہوئے میری طرف دیکھے بغیر اس نے ہانپتی ہوئی کمزور آواز میں کہا۔ ”دوبارہ یہ حرکت کرو گے تو مر جاؤ گے۔“ اور وہ کوٹھڑی سے نکل گئی۔ باہر جاتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا اور مجھے باہر سے تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔

جھٹکا ایسا تھا جیسے مجھے بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔ میرا جسم ابھی تک جھنجھنا رہا تھا۔ میں جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھے سانس چڑھ گیا تھا۔ شاید یہ بجلی کے جھٹکے کی وجہ سے تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آسیبی لڑکی نے مجھے اپنا قیدی بنا لیا ہے۔ یہ ایک ایسی قید تھی جس سے رہائی ناممکن لگتی تھی۔

سارا دن مجھے اس کوٹھڑی میں گزر گیا۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا کبھی پھر صوفے پر بیٹھ جاتا۔ کھڑکی پر باہر سے دن کی روشنی جو اندر آ رہی تھی پہلے ہی سرد اور دھندلی تھی۔ دن ڈھلنے کے ساتھ یہ بجھ سی گئی اور کوٹھڑی میں اندھیرا چھانے لگا۔ ایک بار پھر باہر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ اسی بوڑھی عورت کے قدموں کی آواز تھی۔

وہ پہلے کی طرح تالا کھول کر کوٹھڑی میں آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی سیاہ طشت تھا جس میں ابلے ہوئے چاول اور پانی کا کٹورا رکھا ہوا تھا۔ طشت اس نے میرے آگے تپائی پر رکھ دیا اور جانے لگی تو میں نے کہا۔ "میں نہانا چاہتا ہوں۔"

بوڑھی عورت نے ہانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "چپ چاپ بیٹھے رہو۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی اور اس نے دروازے کو تالا لگا دیا۔ میں خاموشی سے چاول کھانے لگا۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آسیبی لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے اور مجھے وہاں کیوں لے آئی ہے۔ چاول کھاتے ہوئے اچانک میری نظر اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی پر پڑی۔ میں چونک سا پڑا۔ میری انگلی میں روہنی کی دی ہوئی انگوٹھی نہیں تھی۔ یہی ہاتھ آسیبی لڑکی نے فضا میں پرواز کرتے ہوئے پکڑا ہوا تھا۔ یہ انگوٹھی اسی نے غائب کی تھی۔ اگر انگوٹھی میرے پاس ہوتی تو بہت ممکن تھا کہ جب میں کوٹھڑی کے کھلے دروازے میں سے باہر بھاگنے لگا تھا تو مجھے آسیبی لڑکی کے پھونکے ہوئے طلسم کا جھٹکا نہ لگتا۔ اسی لئے اس نے میری انگوٹھی غائب کر دی تھی۔ امید کی یہ ہلکی سی کرن تھی وہ بھی بجھ گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد بوڑھی عورت خالی برتنوں والا طشت اٹھا کر لے گئی۔ کچھ دیر کے بعد شام ہو گئی۔ کوٹھڑی میں اندھیرا چھا گیا۔ ایک بار پھر وہی بوڑھی عورت دروازہ کھول کر کوٹھڑی میں داخل ہوئی۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں میں ایک شمع دان تھام رکھا تھا جس پر تین موم بتیاں روشن تھیں۔

اس نے شمع دان خاموشی سے آتش دان کے مینٹل پیس پر رکھ دیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی واپس چلی گئی۔ جاتے ہوئے کوٹھڑی کے باہر تالا لگا گئی۔ میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ میرا ذہن سخت پریشان تھا کیونکہ مجھ پر صورت حال واضح نہیں ہو رہی تھی۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ میں کب تک اس کوٹھڑی میں بند رہوں گا اور یہ کہ مجھے کیوں بند کیا گیا ہے؟ کھڑکی میں سے سرد ہوا آ رہی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ باہر اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ خاموشی دہشت زدہ کر دینے والی تھی۔ باہر دو



سو سال پرانا قبرستان تھا۔ رات کی خاموشی نے قبرستان کی خاموشی کے ساتھ مل کر ماحول کو اور زیادہ وحشت خیز بنا دیا تھا۔

میں پلنگ پر دراز ہو گیا۔ میری نیند اڑ چکی تھی۔ سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مجھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ یہ بہت سے قدموں کی چاپ تھی۔ میں پلنگ پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ قدموں کی چاپ دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ پھر دروازہ کھل گیا اور کوٹھڑی میں دو آدمی اور ایک عورت داخل ہوئی۔ مردوں نے سیاہ چغے پہنے ہوئے تھے۔ سروں پر بھی مخروطی سیاہ ٹوپیاں تھیں۔ انہوں نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے۔ عورت لمبے قد کی تھی وہ بھی سیاہ چغے میں ملبوس تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں ایک پیالہ تھا جس میں سے سفید دھوئیں کی پتلی لہریں نکل رہی تھیں۔

یہ عجیب و غریب جلوس میرے قریب آ کر رک گیا۔ عورت کا رنگ گورا تھا اور ناک طوطے کی طرح نیچے کو مڑی ہوئی تھی۔ اس کی شکل ہی سے خوف آتا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھ کر سوئی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہمارے ساتھ چلو۔"

میں نے کہا۔ "تم لوگ کون ہو۔ مجھے یہاں کیوں بند کر رکھا ہے؟"

پراسرار عورت نے کہا۔ "ہمارے ساتھ چلو۔"

اس پر میرے سوالات کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس نے سنا ہی نہیں۔ میں نے کہا۔ "میں نہیں جاؤں گا۔"

عورت ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ مجھ پر جیسے ایک روشنی سی پڑ کر غائب ہو گئی۔ عورت نے کہا۔ "میرے ساتھ آ جاؤ۔"

میں اٹھ کر اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس نے میرے ارادے کی طاقت کو معطل کر دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ میں اس کے حکم کا پابند ہو گیا تھا۔ شاید اس نے مجھ پر کوئی طلسم پھونک دیا تھا۔ بھوت پریت کا یہ جلوس مجھے لے کر کوٹھڑی سے

باہر آیا تو ہمارے استقبال کو باہر ایک لمبی عورت لمبا چغہ پہنے ہاتھ میں شمع دان تھامے کھڑی تھی۔ وہ ہمارے آگے آگے چل پڑی جیسے ہمیں روشنی میں راستہ دکھا رہی ہو۔

ہم گرد آلود نیم روشن راہ داریوں میں سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر ہم ایک لمبے ہال کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ چوڑائی میں چھوٹا مگر لمبائی میں لمبا تھا۔ دونوں جانب دیواروں کے ساتھ عجیب و غریب خوفناک چہروں والے جانوروں کے بت کھڑے تھے۔ کمرے میں اندھیرا اندھیرا سا تھا۔ کمرے کے آخر میں ایک پتھر کا چبوترہ تھا جس کے وسط میں پتھر کے پیالے میں آگ جل رہی تھی۔ قریب ہی سیاہ پتھر کی دو کرسیاں بنی ہوئی تھیں۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ میری حالت ایک ایسے شخص کی تھی جس پر کسی نے طلسم پھونکا ہوا ہو میں وہی کچھ کر رہا تھا جو مجھے کہا جاتا تھا۔ سامنے ایک پتھر کی ایک بڑی کرسی رکھی ہوئی تھی۔ دونوں آدمی کرسی کے دائیں بائیں بڑے ادب سے کھڑے ہو گئے۔ عورت نے شمع دان میز پر رکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کونے میں پردے کے پیچھے جیسے غائب ہو گئی۔ ہال میں خاموشی چھا گئی۔ میں بھی بت بنا پتھر کی کرسی پر بیٹھا تھا اور دونوں آدمی بھی ساکت و جامد کھڑے تھے۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ کونے والا پردہ ایک طرف کو ہٹا اور ایک بھاری بھر کم اونچا لمبا، لمبی سیاہ داڑھی والا آدمی ہاتھ میں عصا لئے نمودار ہوا۔ اس کی دونوں جانب غلام شمع دان تھامے چل رہے تھے۔ داڑھی والے آدمی کے سر پر چوگوشہ لمبی سیاہ ٹوپی تھی۔ وہ عصا ٹیکتا آرام آرام سے چلتا چبوترے پر آیا اور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ غلاموں نے اپنے اپنے شمع دان میز پر رکھ دیئے اور مودب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ سیاہ داڑھی والے آدمی نے میری طرف بڑے غور سے دیکھا۔ پھر عصا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر حکم دینے کے انداز میں کہا۔ ''نتالیا کو لایا جائے۔''

اس کے ساتھ ہی کونے والا بھاری پردہ ایک بار پھر ہٹا اور دو سیاہ مخروطی ٹوپیوں والے آدمی ایک عورت کو ساتھ لئے داخل ہوئے۔ آگے آگے وہی طوطے کی مڑی



ہوئی ناک والی عورت تھی جو میری کوٹھڑی میں آتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بوسیدہ سی کتاب تھی۔ جب یہ لوگ چبوترے کے قریب آئے تو شمع کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ عورت ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی عمر اکیس بائیس سال کی ہو گی۔ اس نے گلابی رنگ کا ریشمی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر گلابی شگوفوں کا تاج تھا اس کا رنگ ایسا تھا جیسے میدے میں سیندور ملا ہوا ہو۔ میں اس لڑکی کا حسن و جمال دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

یقین کریں میں نے ایسی حسین و جمیل لڑکی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ لڑکی میرے ساتھ والی پتھر کی خالی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔ جیسے ہی وہ میرے قریب آ کر بیٹھی مجھے گلاب کے شگوفوں کی خوشبو آنے لگی۔ میں حیران تھا کہ اتنی حسین و جمیل لڑکی ان جنوں بھوتوں کے درمیان کہاں سے آ گئی ہے۔ کیسے آ گئی ہے؟

میں لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ لڑکی نے نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ذرا سا مسکرائی۔ اس دوران طوطے کی ناک والی عورت کتاب کھول کر بھاری بھر کم آدمی کے دائیں جانب کھڑی ہو گئی۔ بھاری بھر کم آدمی نے عصا کو دو بار فرش پر آہستہ سے مار کر کہا۔ ''کارروائی شروع کی جائے۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں کس قسم کی کارروائی شروع ہونے والی ہے۔ حکم پاتے ہی طوطے کی ناک والی عورت نے کتاب میں سے اونچی آواز میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔ خدا جانے وہ کون سی زبان تھی۔ اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ جب عورت کتاب کا ایک ورق پڑھ چکی تو بھاری بھر کم داڑھی والے آدمی نے بھاری آواز میں کہا۔ ''دونوں کو ہمارے سامنے لایا جائے۔''

یہ حکم سنتے ہی دو آدمی ہماری طرف بڑھے۔ ایک نے میرا ہاتھ اور دوسرے نے میرے ساتھ بیٹھی ہوئی حسین و جمیل لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ہم دونوں کو داڑھی والے آدمی کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا۔ داڑھی والا آدمی کرسی

پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پہلے لڑکی جس کا نام نتالیا پکارا تھا کے سر پر ہاتھ رکھا اور عجیب و غریب زبان میں کچھ جملے دہرائے۔ اس کے بعد اس نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر وہی جملے دہرائے۔ پھر ہمارے چہروں پر باری باری پھونک ماری اور بلند آواز میں کہا۔ ''اہر من! اہر من! میں نے تیرے نام سے ان دونوں کی شادی کر دی ہے۔ اب یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔''

شادی کا سن کر مجھ پر جیسے بجلی سی گر پڑی۔ میں حیران پریشان ہو کر بھاری بھر کم داڑھی والے آدمی کا منہ تکنے لگا۔ اگرچہ لڑکی بڑی حسین اور نوجوان تھی مگر اس کے ساتھ شادی کا میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے کیا معلوم کہ وہ کوئی جن تھی، بھوت تھی، چڑیل تھی۔ وہ ان تینوں میں سے کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ ظاہر ہے وہ کوئی نارمل لڑکی نہیں تھی کیونکہ میں جن حالات اور لوگوں میں گھرا ہوا تھا وہ بھوت پریت ہی ہو سکتے تھے۔ نارمل انسان نہیں ہو سکتے تھے۔ میں نے چیخ کر اس فیصلے کے خلاف احتجاج کرنا چاہا مگر میں اپنی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکال سکا۔ یہ اس طلسم کا اثر تھا جو طوطے کی ناک والی عورت نے مجھ پر کوٹھڑی سے باہر لے جانے سے پہلے پھونکا تھا۔

داڑھی والے عفریت نما آدمی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ''کیا تمہیں کچھ کہنا ہے؟''

میری زبان سے جیسے اپنے آپ نکل گیا۔ ''مجھے کچھ نہیں کہنا۔''

داڑھی والے آدمی نے عصا والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور بلند آواز سے کہا۔ ''اہر من! اہر من! جاؤ۔ اب تم دونوں خاوند اور بیوی ہو۔''

اس کے فوراً بعد ہمیں ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جہاں کچھ اندھیرے اور کچھ روشنی میں بڑا پراسرار ماحول تھا۔ بہت سے سیاہ ٹوپیوں والے لوگ میز کے گرد بیٹھے تھے۔ میز پر موم بتیاں روشن تھیں لیکن عجیب بات تھی کہ موم بتیوں کی روشنی صرف وہیں ہو رہی تھیں جہاں وہ روشن تھیں۔ یہاں ہماری شادی کی دعوت



کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہمیں شاندار کرسیوں پر ساتھ ساتھ بٹھا دیا گیا۔ مجھے یہ سب کچھ ایک ڈراؤنا خواب لگ رہا تھا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ وہ کس جانور کا بھنا ہوا گوشت تھا جو مجھے کھلایا گیا اور وہ کس قسم کا تیز مشروب تھا جو مجھے لڑکی نتالیا کے ساتھ ہی پلایا گیا۔ اس کے بعد وہاں رقص شروع ہو گیا۔ یہ نیم عریاں عورتوں کا شیطانی رقص تھا۔ میں بت بنا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا میرے پہلو میں بیٹھی ہوئی حسین لڑکی جس کو زبردستی میری دلہن بنا دیا گیا تھا بار بار میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بڑے پیار سے دبا رہی تھی۔ مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ میں اپنا ہاتھ پیچھے کر لیتا۔ ان لوگوں نے طلسم کے زور سے میری قوت ارادی سلب کر لی تھی۔ میں ان کے حکم کا، ان کی خواہشات کا پابند ہو گیا تھا۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ یہ شیطانی محفل کب تک جاری رہی۔ میں بت بنا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر یہ محفل ختم ہو گئی اور مجھے میری دلہن کے ساتھ ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ لڑکی نے مجھے اپنے پاس پلنگ پر بٹھا لیا۔ وہ بڑی محبت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لباس سے گلاب کے شگوفوں کی خوشبو اسی طرح آ رہی تھی۔ اس نے خواب آلود آواز میں کہا۔ ''میرا نام نتالیا ہے۔ تمہیں اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں مجھے تمہارا نام معلوم ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہے؟''

حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ بھوت پریت ہیں۔ ان کو اس قسم کی باتیں معلوم ہوتی ہیں پھر بھی میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا۔

اس نے کہا۔ ''مجھے تم سے محبت ہے نا۔ محبت سب کچھ بتا دیتی ہے۔ کیا تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

میں نے اسی لمحے دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اس عورت نتالیا کے ساتھ محبت کا ڈرامہ کرنا میرے حق میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اس طریقے سے مجھے اس بھوت

پریت کی مخلوق سے فرار ہونے کا موقع مل سکے گا۔ ان لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا چنانچہ میں نے نتالیا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور بڑی محبت کے ساتھ کہا۔ ”کیوں نہیں نتالیا! میں بھی تم سے پیار کرتا ہوں۔ میں تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے تم مل گئی ہو۔“

نتالیا کا چہرہ خوشی سے کھل کر اور زیادہ حسین ہو گیا تھا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ یہ لڑکی بے حد حسین تھی۔ اگر عام حالات میں نارمل انسانوں کی دنیا میں یہ مجھے کہیں مل جاتی تو اس سے شادی کر کے میں واقعی اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین آدمی کہتا۔ مگر مجھے پورا یقین تھا کہ یہ لوگ ہوائی مخلوق ہیں۔ ان کا تعلق شیطانی روحوں سے ہے۔ یہ نارمل انسان نہیں ہے۔ یہ کالا جادو، طلسم اور بھوت پریت کی دنیا کے لوگ تھے اور میں ہر حالت میں ان سے نجات حاصل کر کے اپنی دنیا میں واپس جانا چاہتا تھا۔

نتالیا مجھے محبت کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”اب ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ ہمیں کوئی جدا نہیں کر سکے گا۔“

میں نے جان بوجھ کر ایک فقرہ کہہ دیا۔ دراصل میں اسے کریدنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”مگر نتالیا! ایک نہ ایک دن موت ہمیں ایک دوسرے سے جدا کر دے گی۔“

نتالیا کا چہرہ ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کہنے لگی۔ ”نہ میں مروں گی، نہ تمہیں مرنے دوں گی۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“

یہ جملہ اس امر کی تصدیق کرتا تھا کہ یہ عورت زندہ نہیں ہے پہلے سے مر چکی ہے اور میں چونکہ زندہ انسانوں کی طرح ہوں اس لئے اس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ مجھے موت کے منہ سے بچانے کی کوشش کرے گی۔“

میں نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”نتالیا! موت تو ہر زندہ انسان کو ایک نہ ایک دن آنی ہی ہوتی ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم دونوں



موت سے بچ جائیں گے؟“

اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ تمہیں یہ باتیں نہیں پوچھنی چاہئیں۔ کہنے لگی۔ ”یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اور پھر یہ موقع ایسی باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ آج ہماری شادی ہوئی ہے۔ ہمیں پیار محبت کی باتیں کرنی چاہئیں۔“

میں نے کہا۔ ”نتالیا! یہ باتیں بھی میں نے اس لئے پوچھی تھیں کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور تم سے جدا نہیں ہونا چاہتا۔“

نتالیا نے بڑے پراسرار انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ”یہ میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ تم کبھی مجھ سے جدا نہیں ہو گے۔ تم مر بھی گئے تو میں تمہیں اپنے پاس لے آؤں گی۔“

اس فقرے کو سن کر میرے بدن میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ جملہ اس بات کی غمازی کرتا تھا کہ وہ ایک بدروح ہے اور میری موت کے بعد میری روح پر قبضہ کر کے مجھے بھی بدروح بنا دے گی جو میرے لئے موت کے بعد سب سے بڑا عذاب تھا۔ یہ مجھے ہرگز قبول نہیں تھا۔ میں دوبارہ اس سے محبت بھری باتیں کرنے لگا۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں کہا۔ ”نتالیا! میں نے سوچ رکھا تھا کہ جب میری شادی ہو گی تو میں اپنی دلہن کے ساتھ ہنی مون منانے کسی سمندری جزیرے میں چلا جاؤں گا۔ تم تو جانتی ہی ہو گی کہ دنیا میں بعض شادی شدہ جوڑے ہنی مون منانے کسی خوبصورت مقام پر ضرور جاتے ہیں۔“

نتالیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تم ہنی مون منانا چاہتے ہو؟“

میرے دل کی مراد بر آ رہی تھی۔ میں نے فوراً کہا۔ ”کیوں نہیں۔ مجھے نتالیا کی شکل میں دنیا کی سب سے حسین دلہن ملی ہے تو میں ہنی مون بھی کسی خوبصورت جگہ پر منانا چاہتا ہوں۔“

نتالیا اسی طرح مسکرا رہی تھی۔ اس کا مسکراتا ہوا حسین چہرہ دیکھ کر مجھے کیا کسی کو بھی یقین نہیں آسکتا تھا کہ یہ کوئی بدروح بھی ہو سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''تم ہنی مون منانے کہاں جانا چاہتے ہو؟''

میں اسے کوئی ایسی جگہ بتانا چاہتا تھا کہ جہاں سے مجھے فرار ہونے کا آسانی سے موقع مل جائے۔ میں اپنے ذہن میں ایسے شہر سوچنے لگا جو پاکستان کی سرحد کے قریب ہوں اور میں فرار ہونے کے فوراً بعد پاکستان پہنچ سکوں۔ جب تک میں کسی شہر کا فیصلہ نہیں کر سکا میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ میں کس جگہ اور کس ملک میں ہوں اس سے پوچھا۔ ''ہم تو اس وقت انڈیا میں ہیں۔ یہاں کوئی میری پسند کی خوبصورت جگہ مجھے کہیں نظر نہیں آرہی۔''

نتالیا نے کہا۔ ''کیوں نہیں ہے۔ شملہ ہے۔ نینی تال ہے اور پھر کشمیر ہے۔ ہم کشمیر چل کر ہنی مون مناتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کشمیر میں تو بڑی گڑبڑ ہے۔ وہاں ہم سکون سے ہنی مون نہیں منا سکیں گے۔''

''تو پھر تم کہاں جانا چاہتے ہو؟'' نتالیا نے پوچھا۔ ''اگر تم پسند کرو تو ہم یورپ کے کسی خوبصورت ملک میں چلے چلتے ہیں۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ چلے جاتے ہیں۔ یہ بڑا حسین ملک ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ عورت بدروح ہے اور کہیں بھی مجھے لے جاسکتی ہے۔ اس کے لئے فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مگر میں اپنے وطن پاکستان سے اتنی دور نہیں جانا چاہتا تھا کہ جہاں سے واپس آتے ہوئے مجھے پاسپورٹ ویزے کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑے اور پھر میرے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''کیوں نہ ہم پاکستان چلے چلیں۔ وہاں ایک پہاڑی مقام بڑا ہی پرسکون اور خوبصورت ہے۔''



''کیا نام ہے اس جگہ کا؟'' شالیا نے پوچھا۔

میں نے نام اتنی دیر میں سوچ ہی لیا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے میں پیدل بھی اپنے گھر پہنچ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ شہر ایبٹ آباد ہے۔ بڑا خوبصورت نیم پہاڑی شہر ہے۔ وہاں سردی بھی زیادہ نہیں ہوتی اور گرمی بھی نہیں ہوتی۔ وہاں ماڈرن ہوٹل بھی ہیں۔ مجھے یہ شہر بہت پسند ہے۔''

مجھے لگ رہا تھا کہ نتالیا میری محبت میں سرشار ہو رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس عورت کو زندگی میں کبھی کسی نے اتنا پیار نہیں دیا۔

کہنے لگی۔ ''اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ہم ہنی موت منانے ایبٹ آباد ہی چلے چلتے ہیں۔''

میں نے اس سے بالکل نہ پوچھا کہ انڈیا سے پاکستان جانے کے لئے پاسپورٹ اور فارن کرنسی وغیرہ کی ضرورت ہو گی وہ کہاں سے آئے گی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ عورت سب کچھ کر سکتی ہے۔ لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ پر اپنے بدروح ہونے کا راز ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔ وہ مجھ پر یہی ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ وہ ایک نارمل عورت ہے اور شادی کے بعد میرے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ کم از کم میں نے اس کی باتوں سے یہی محسوس کیا تھا۔ ابھی تک اس نے میرے پاس بیٹھے ہوئی کوئی بدروحوں والی شعبدہ بازی نہیں دکھائی تھی۔ کہنے لگی۔ ''ہم کل صبح ہی ایبٹ آباد روانہ ہو جائیں گے۔''

میں نے مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ میرے لئے یہی کافی تھا کہ میں اپنے پیارے وطن پاکستان کے خوبصورت شہر ایبٹ آباد جا رہا ہوں۔ وہاں سے میں اس بدروح سے بھاگنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ اور موقع تلاش کر لوں گا۔ میں نے نتالیا کا ہاتھ چوم لیا اور بڑے لگاؤ کے ساتھ کہا۔ ''نتالیا! تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔''

نتالیا نے کہا۔ ''میں تم سے محبت کرتی ہوں اور اب تو تم میرے خاوند بھی ہو۔

میں کیوں نہیں تمہارا خیال کروں گی۔"

باتوں باتوں میں نہ جانے کتنی رات گزر گئی۔ نہ میرے پاس گھڑی تھی نہ وہاں کوئی کلاک تھا۔ میرا خیال ہے کہ رات کا آخری پہر گزر رہا تھا کہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ نتالیا نے کہا۔ "تمہیں نیند آ رہی ہے۔ سو جاؤ۔ میں بھی سو جاتی ہوں۔"

میں وہیں لیٹ گیا۔ نتالیا بھی میرے ساتھ ہی لیٹ گئی۔ اس کے لباس سے گلاب کی خوشبو آ رہی تھی۔ پھر میں سو گیا۔

جس وقت میری آنکھ کھلی میں پلنگ پر اکیلا لیٹا ہوا تھا۔ جلدی سے اٹھ کر چاروں طرف دیکھا۔ بدروح دلہن نتالیا وہاں نہیں تھی۔ اس بند تابوت ایسے کمرے میں کوئی روشندان یا کھڑکی بھی نہیں تھی کہ دیکھتا رات کا وقت ہے یا صبح ہو گئی ہے۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور نتالیا اندر داخل ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کارنس پر شمع دان روشن تھا۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ نتالیا نے ریشمی شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ کندھے پر پرس لٹک رہا تھا۔ گلے میں بڑا خوبصورت جالی دار دوپٹہ تھا۔ اس لباس میں بھی وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے میرے پاس آئی اور بولی۔ "میری جان! جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ یاد نہیں ہم ہنی مون منانے ایبٹ آباد جا رہے ہیں۔"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُسے یاد تھا کہ ہمیں پاکستان ہنی مون منانے جانا ہے ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اس کو میرے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے کہ میں اسے دھوکے سے پاکستان لے جا رہا ہوں تاکہ وہاں جاتے ہی اس کو چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میں نے پلنگ سے اترتے ہوئے کہا۔ "نتالیا! میں نہانا چاہتا ہوں۔ یہاں کوئی ایسا انتظام ہے؟"

نتالیا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں نہیں میری جان! وہ سامنے غسل خانے کا دروازہ ہے۔ جا کر جلدی سے نہا لو۔"

میں نے پوچھا۔ "ٹائم کیا ہو گا؟"



اس نے اپنی کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی دیکھ کر کہا۔ "میری گھڑی بند ہو گئی ہے۔ ویسے دن چڑھ چکا ہے۔"

میں غسل خانے کی طرف آ گیا۔ دروازہ کھول کر اندر گیا تو دیکھا کہ وہاں غسل کرنے کا تمام ساز و سامان موجود تھا۔ ایک طرف میرے لئے ایک نئی پتلون، نئی جیکٹ اور نئی قمیض بھی تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی۔ تولیہ صاف شفاف تھا۔ چمکیلے نل میں سے سنگ مرمر کے ٹب میں پانی گر رہا تھا۔ میں نے ہاتھ لگایا۔ پانی نیم گرم تھا مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ کیونکہ یہ بھوت پریتوں کا مسکن تھا۔ یہ بدروحیں ہر چیز مہیا کر لیتی ہیں۔ اس کا تجربہ مجھے روہنی کے ساتھ کئی بار ہو چکا تھا۔

میں نے جلدی جلدی غسل کیا اور نئی پتلون قمیض اور جیکٹ پہن کر باہر نکلا تو نتالیا پلنگ پر بیٹھی پرس میں سے کچھ نکال کر شمع دان کی روشنی میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "یہ کیا دیکھ رہی ہو؟"

اس نے کہا۔ "دلی سے پاکستان کے شہر کراچی تک کے دو ایئر ٹکٹ ہیں اور ہم دونوں کے پاسپورٹ ہیں۔ میں نے ان پر صبح صبح ہی ویزے لگوا لئے تھے۔ میری جان! ہم دوسرے ملک میں جا رہے ہیں۔ ان چیزوں کی تو ضرورت ہوتی ہی ہے۔"

میں نے اس پر بھی کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہ کیا۔ یہی ظاہر کیا جیسے یہ سب کچھ نارمل طریقے سے ہوا ہے۔ حالانکہ وہ اگر چاہتی تو مجھے اس کمرے سے اپنے ساتھ غائب کر کے بھی پاکستان لے جا سکتی تھی۔ لیکن جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں وہ نہ جانے کیوں مجھ پر یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ وہ لوگ نارمل انسان ہیں اور بھوت پریت نہیں ہیں۔ میں بھی چپ تھا اور آگے سے کوئی سوال نہیں کر رہا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ جہاں اس بدروح کے ساتھ میرا بیاہ کر دیا گیا ہے وہ جگہ بھارت کے کس پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔

اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور خوش ہو کر بولی۔ "میری جان! تم کتنے

پیارے لگ رہے ہو۔"

اور اس نے میری بغل میں ہاتھ ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اسی راستے سے لے کر جائے گی جس راستے سے مجھے اس منحوس جگہ پر لایا گیا تھا اور ہمیں ایک ویران پرانے قبرستان میں سے بھی گزرنا پڑے گا۔ لیکن جب وہ مجھے لے کر اس آسیب زدہ عمارت سے باہر نکلی تو میں نے دیکھا کہ سنہری دھوپ نکلی ہوئی تھی اور جہاں ڈھلان پر پہلے میں نے بہت سی ٹوٹی پھوٹی شکستہ قبریں دیکھی تھیں وہاں اب ان قبروں کا نام و نشان تک نہ تھا بلکہ ان کی جگہ سرسبز ڈھلان پر پھول دار پودے اگے ہوئے تھے۔ ایک پتھر کا زینہ نیچے سڑک تک جاتا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا جس عمارت سے ہم باہر نکلے تھے وہ کھنڈر نما خانقاہ کی عمارت نہیں تھی بلکہ کوئی پرانی وضع کا کاٹیج نما ڈاک بنگلہ تھا۔

یہ سب ان بدروحوں کے طلسم کا عمل ہی تھا لیکن میں خوش تھا کہ میں اس جگہ سے ہمیشہ کے لئے جا رہا ہوں۔ تاریک آسیب زدہ عمارت کے تہہ خانے سے نکل کر سنہری دھوپ میں آکر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی تنگ و تاریک قبر میں سے زندہ سلامت نکل آیا ہوں۔ سردی بڑی خوشگوار تھی۔ ہوا چل رہی تھی جس میں نتالیا کے کٹے ہوئے سنہری بالوں کی ایک لٹ اس کے ماتھے پر اڑ رہی تھی۔ وہ واقعی بڑی حسین لڑکی تھی۔ میں آپ کو سچ کہہ رہا ہوں۔ اگرچہ میں اس سے جتنی جلدی ہو سکے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن یقین کریں اگر وہ کوئی بدروح یا بھوت پریت نہ ہوتی تو میں اس سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ہم ڈاک بنگلے کی سیڑھیاں اتر کر نیچے سڑک پر آگئے۔ چھوٹی سی پہاڑی سڑک تھی جو ٹیلے کے گرد گھوم کر نیچے اتر گئی تھی۔ ہم سڑک پر چلتے چلتے نیچے ایک بڑے بازار میں آگئے۔ یہاں ایک طرف کتنی ہی پرانے اور نئے ماڈل کی کاریں کھڑی تھیں۔ ہمیں دیکھ کر ایک باوردی ڈرائیور دوڑ کر آگیا کہنے لگا۔ "میم صاحب! چندی گڑھ جائیں



گے؟ میں آپ کو چھوڑ آتا ہوں۔ بالکل نئے ماڈل کی کار ہے۔"

ہمارے پاس سامان تو تھا نہیں صرف ایک ٹریولنگ بیگ نتالیا نے کندھے سے لٹکایا ہوا تھا ایک ٹریولنگ بیگ میرے کندھے سے لٹک رہا تھا۔ نتالیا نے اس سے کرایہ بھی طے نہ کیا۔ اس کو کرایہ طے کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو ہوا میں سے ہاتھ گھما کر جتنے نوٹ چاہے پیدا کر سکتی تھی۔ گو میرے سامنے اس نے ابھی تک ایسا نہیں کیا تھا مگر میں نے بدروحوں کو ایسا کرتے دیکھا تھا۔

اس نے ڈرائیور سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ گاڑی لے آؤ۔"

وہ جلدی سے گاڑی لے آیا۔ ہم اس میں بیٹھ گئے۔ بڑی آرام دہ کار تھی۔ اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں نے رات بھارت کے پنجاب کے شمالی پہاڑی علاقے میں کسی جگہ گزاری تھی۔ اور اب ہم چندی گڑھ جا رہے تھے۔ گاڑی نیم پہاڑی علاقے کی سڑک پر چندی گڑھ کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ چونکہ نتالیا نے خود مجھ سے کہا تھا کہ ہم دلی سے بذریعہ ہوائی جہاز پاکستان جائیں گے اس لئے میں نے راستے میں اس سے پوچھا۔ "چندی گڑھ سے دلی جانے والی ٹرین ہمیں مل جائے گی اس وقت؟"

پراسرار نتالیا نے آہستہ سے کہا۔ "ہم چندی گڑھ سے بائی ایئر دلی جائیں گے۔"

یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں جلدی سے جلدی اپنے پیارے وطن پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ میں نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ کراچی سے ایبٹ آباد پہنچنے کا بھی میں انتظار نہیں کروں گا۔ اگر راستے میں اس حسین بدروح سے فرار ہونے کا کوئی موقع مل گیا تو اسے وہیں چھوڑ کر فرار ہو جاؤں گا۔ اس کے ساتھ ہی دل میں یہ خیال بھی ضرور آتا کہ آخر یہ بھوت پریت ہے، بدروح ہے۔ اس کو فوراً پتہ چل جائے گا کہ میں اسے چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہوں۔ یہ تو مجھے وہیں آکر دبوچ لے گی۔ لیکن میں یہ سوچ کر اس خیال کو دل سے نکال دیتا تھا کہ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس کو پتہ ہی نہ چل سکے کہ میں کہاں ہوں۔ اس کے ساتھ بدروحوں ایسی زندگی بسر کرنے

سے تو یہی بہتر تھا کہ میں اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔ پھر مجھے یہ بھی بڑا حوصلہ تھا کہ میں اپنے اسلامی وطن پاکستان میں ہوں گا جہاں ہر کوئی میری مدد کرنے کو تیار ہو گا۔

چندی گڑھ آیا تو نتالیا نے ڈرائیور سے کہا۔ ”ایئر پورٹ لے چلو۔“

ہم ایئر پورٹ پر آ گئے۔ میرا خیال تھا کہ ہمیں وہاں کسی ٹریولنگ ایجنسی کے آفس سے دلی تک کے ایئر ٹکٹ خریدنے پڑیں گے اور جہاز میں سیٹ ریزرو کروانی پڑے گی لیکن ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایئر پورٹ پر کار سے اتر کر نتالیا سیدھی ایئر پورٹ کی عمارت کی طرف بڑھی۔ میں نے اپنی تسلی کی خاطر اس سے پوچھا۔ ”کیا یہاں سے ہمیں دلی کے ٹکٹ مل جائیں گے؟“

نتالیا ایک بک سٹال کے پاس رُک گئی۔ اس نے اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر دو ٹکٹ نکالے۔ ایک مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا چندی گڑھ سے دلی تک کا ٹکٹ ہے اور یہ میرا ٹکٹ ہے۔“

حسین بدروح نتالیا نے اپنی شعبدہ بازیاں دکھانی شروع کر دی تھیں۔ میں ان شعبدہ بازیوں سے خوش تھا کیونکہ میری منزل جلدی قریب آ رہی تھی۔ پراسرار نتالیا مجھے لے کر عین اس وقت ایئر پورٹ پر پہنچی تھی جب دلی کی طرف جانے والے جہاز کے روانہ ہونے میں صرف پندرہ بیس منٹ ہی باقی تھے۔ جب ہم لاؤنج میں پہنچے تو اعلان ہو رہا تھا کہ دلی جانے والے مسافر جہاز میں سوار ہو جائیں۔ ہم بھی مسافروں کی قطار میں شامل ہو گئے۔ کسٹم کی کمپیوٹر مشین نے ایک منٹ میں ہمارے ٹریولنگ بیگ چیک کر لئے تھے اور تعجب کی بات ہے کہ پراسرار نتالیا کے پاس بورڈنگ کارڈ بھی موجود تھے اور جہاز میں ہماری سیٹیں بھی بک ہو چکی تھیں۔

قطار میں کھڑے کھڑے نتالیا نے میرا بورڈنگ کارڈ مجھے دے دیا۔ پراسرار نتالیا کی ان ماورائے انسانی عقل شعبدہ بازیوں سے مجھے ڈر بھی لگنے لگا تھا کہ یہ حسین بلا مجھے



فرار ہونے کے بعد کہیں نہ کہیں ضرور دبوچ لے گی لیکن اب اس قسم کی باتیں سوچنے کا وقت گزر چکا تھا اور میں نے ہر حالت میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا خواہ اس کے لئے مجھے کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔

ہم جہاز میں سوار ہو گئے۔ جہاز نے ہمیں دلی پہنچا دیا۔ دلی ایئر پورٹ پر اترنے کے بعد ہم ایئر پورٹ کی بلڈنگ ہی میں ایک ریسٹورنٹ میں آ کر بیٹھ گئے۔ وہاں ہم نے ناشتہ کیا۔ پراسرار نتالیا نے کہا۔ ”ایک گھنٹے بعد اسی ٹرمینل سے پاکستان کے لئے جہاز روانہ ہو گا۔ میں نے تمام کاغذات تیار کروا کر رکھ لئے ہیں تم فکر نہ کرنا۔“

اس نے پرس میں سے دو پاسپورٹ نکالے۔ ایک پاسپورٹ اپنے پاس رکھ لیا دوسرا پاسپورٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تمہارا پاسپورٹ ہے۔“

میں نے اسے کھول کر دیکھا۔ یہ انڈین پاسپورٹ تھا اس پر میری فوٹو لگی ہوئی تھی نیچے انگریزی اور ہندی زبانوں میں میرا ہندو نام لکھا تھا۔ میں نے ورق الٹ کر دیکھا اس پر انڈیا سے پاکستان تک کا ایک مہینے کا ویزا بھی لگا ہوا تھا۔ میں عالم حیرت میں یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور خاموش تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں کسی عام کمزور اور نارمل عورت کے ساتھ سفر نہیں کر رہا۔ جو عورت میرے ساتھ سفر کر رہی ہے وہ ایک بدروح ہے اور بے اندازہ شیطانی طاقت رکھتی ہے۔

پراسرار نتالیا میرا ہاتھ تھام کر مجھ سے پیار محبت کی باتیں کرنے لگی میں اس کی محبت کا جواب محبت ہی سے دیتا رہا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور بولی۔ ”چلو میری جان! وقت ہو گیا ہے۔“

وہاں سے ہم ایک دوسرے لاؤنج کی طرف بڑھے۔ اسے سب معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے۔ لاؤنج کے باہر سکیورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمارے پاسپورٹ دیکھے، ہمارا سامان چیک کیا۔ ہم سے کچھ سوال پوچھے جن کے جواب ہم نے دے دیئے۔ ہمیں آگے جانے کی اجازت مل گئی۔ ہمارے پاس انڈین پاسپورٹ تھے اس

لئے ہم سے زیادہ پوچھ گچھ نہیں کی گئی۔ سامان کے علاوہ ہماری بھی الگ الگ تلاشی بڑی سختی سے لی گئی تھی۔

ہم کسٹم کے کاؤنٹر پر آ گئے۔ وہاں پاکستان جانے والے کچھ اور مسافر بھی کھڑے اپنے اپنے کاغذات چیک کروا رہے تھے۔ ہم نے بھی پاسپورٹ آگے کر دیئے۔ کسٹم آفیسر نے میرا پاسپورٹ کھول کر غور سے دیکھا پھر میری طرف گھور کر دیکھا اور مختلف سوال کرنے لگا۔ پاکستان کیوں جا رہے ہو؟ کس کے پاس ٹھہرو گے وغیرہ وغیرہ۔

میں نے یہی کہا کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں پاکستان کی سیر وسیاحت کرنے جا رہے ہیں۔ دس پندرہ دنوں میں واپس آ جائیں گے۔ نتالیا سے بھی اسی قسم کے سوال پوچھے گئے۔ اس کے پاسپورٹ پر بھی نتالیا کے بجائے اس کا ہندوانہ نام لکھا ہوا تھا۔ ہمیں ڈیپارچر لاؤنج میں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ڈیپارچر لاؤنج ساتھ ہی تھا۔ ہم وہاں آ کر بیٹھ گئے۔ کسٹم والوں نے جب ہم سے پوچھا تھا کہ تمہارے پاس کتنی پاکستانی کرنسی ہے تو نتالیا نے اپنا پرس کھول کر کہا تھا۔ ”ہمارے پاس پاکستانی کرنسی کے صرف پندرہ سو روپے ہیں۔“

کسٹم آفیسر نے پوچھا تھا۔ ”تم لوگوں نے ایک مہینے کا ویزہ لگوایا ہے ان روپوں سے تو تمہارا ایک ہفتے گزارہ نہیں ہو گا۔“

پراسرار نتالیا نے کہا تھا کہ وہاں ہمارے جاننے والی ایک فیملی ہے ہم ان کے ہاں جا کر ٹھہریں گے اور ہمارے پیسے بہت کم خرچ ہوں گے۔ لاؤنج میں آنے کے بعد پراسرار نتالیا نے مجھے ایک ہزار روپے کے پاکستانی کرنسی کے نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم اپنے پاس رکھ لو کسی بھی وقت کوئی ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

میں نے ایک ہزار روپے کے پاکستانی نوٹ اپنی جیکٹ کی جیب میں رکھ لئے۔ اس زمانے میں دلی سے مسافر جہاز سیدھے کراچی جایا کرتے تھے ہمیں بھی کراچی ہی جانا



تھا۔ نتالیا نے کہا۔ ”کراچی سے ہم بذریعہ ریل راولپنڈی اور وہاں سے بذریعہ کار ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔“

اسے ایک ایک رُوٹ کا پتہ تھا۔ ابھی تک وہ مجھے یہی تاثر دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے بڑی معمول کے مطابق کارروائی سے ہو رہا ہے اور اس کو پاکستان کے سارے شہروں کے بارے میں پتہ ہے کہ کون سا شہر کس جگہ پر ہے اور میں بھی اس پر اپنی حیرانی ظاہر نہیں کر رہا تھا کہ اس نے ایک ہی رات میں یہ سب کچھ کیسے کر لیا کہ ہم دونوں کے پاسپورٹ بھی بن گئے، ان پر ویزے بھی لگ گئے اور پاکستانی کرنسی بھی حاصل ہو گئی۔ مجھے پاکستان پہنچنے سے غرض تھی اور پاکستان اب تھوڑی دور ہی رہ گیا تھا۔

O

اس کے بعد ”ویران حویلی کا آسیب“ کی دوسری اور آخری جلد کا مطالعہ کریں۔

## لازوال کہانیوں کے خالق انوار صدیقی کے پراسرار ناول

| ناول | قیمت |
|---|---|
| انکارانی (2 جلدیں) | 400-00 |
| ابوالہول | 300-00 |
| امبر بیل (4 جلدیں) | 1200-00 |
| تارِ عنکبوت (2 جلدیں) | 450-00 |
| خبیث (5 حصے) | 300-00 |
| درخشاں (2 حصے) | 120-00 |
| برہمچاری | 200-00 |
| نکا | 200-00 |
| وہ کون تھا؟ | 180-00 |
| تخریب کار | 250-00 |
| برق پاش | 200-00 |
| رقص ابلیس | 180-00 |
| آسیب زدہ | 200-00 |
| طاغوت | 250-00 |